مولوی نذیر احمد خان کی لائف

حیات النذیر

جس میں

شمس العلماء حافظ نذیر احمد خان ایل ایل ڈی - او - ایل دہلوی

مترجم قرآن مجید و مصنف

مراۃ العروس - بنات النعش - توبۃ النصوح محصنات - ابن الوقت منتخب الحکایات چند پند صرف صغیر - نصاب خسرو - مبادی الحکمۃ - ایامی - رسم الخط - مایغنیک فی الصرف رویائے صادقہ - اجتہاد - الحقوق والفرائض - امہاۃ الامۃ - مطالب القرآن وغیرہ وغیرہ کی زندگی کے حالات اور اُن کی مذہبی - قومی - اور علمی خدمات مفصل بیان کی گئی ہیں

مرتبہ

خاکسار سید افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی

محمد رحیم بخش کے اہتمام سے

شمسی پریس دہلی میں بحسن خوبی طبع ہوئی

۱۹۱۲ء

ملازم شمسی پریس دہلی

محمد علی مصلح سنگ دہلوی

تعداد جلد ۱۳۰۰

مختصر فہرستِ مضامین حیات النذیر

مقدمہ

از

مولوی عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) انسپکٹر مدارس اورنگ آباد دکن

یہ بھی اردو علم ادب کی ترقی کی علامت ہے کہ مشاہیر ملک و ملت کے حالات پر بہت سی اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں۔ اب تک زیادہ تر اُن قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بلحاظ تقدس و دیگر کارہائے نمایاں پہلے ہی سے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ یا اُن کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں اور اُن کی عزت و وقعت صدہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ اُن مؤلفین کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ مواد تیار ملتا ہے۔ البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب میں ادل بدل کرکے اردو زبان میں پیش کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہے تو اُن کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی سے مقبولِ خاص و عام ہیں۔ مگر ہم عصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلے میں بہت کٹھن ہے اوّل تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہے جسے اسی کا دل جانتا ہے جس کو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ دوسرے صدہا شخص ایسے زندہ موجود ہوتے ہیں جو اُس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور انھوں نے اُس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے۔ اور اُس کے متعلق خاص رائے رکھتے ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اس کی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے ہاتھ میں جانے والی ہے۔ اور اس لیے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لیے بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلفِ حیاۃ النذیر نے ہماری قوم کے ایک علامہ کا قول نقل کرکے آج کل کے طریقہ تحریر سوانح عمری کو پُرفریب بتایا ہے اور اُس پر زور دار بحث کی ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کونسا ایسا زمانہ تھا جب کہ یہ پُرفریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہم عصر نامور شخص کی

(بشرطیکہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ورنہ اُنھیں اس سے زیادہ دُشوار
پیش آتی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھنے والے کو پیش آتی ہے۔ اُنھوں نے اب تک قدمائے کرا
کے حالات پر قلم اُٹھایا ہے۔ جنھیں لوگ ایک زمانے سے پوجتے آئے ہیں۔ اور جن کی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے
حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامۂ موصوف کی تالیفات اُس پُر فریب طریقے سے پاک صاف ہیں
بات یہ ہے کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اُس کے تعلقات گرد و پیش
حالات اور قومی و مُلکی معاملات سے تانے بانے کی طرح ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُس کی ذات کو اُن سے جُدا کر
قریب قریب ناممکن کے ہوتا ہے۔ ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا۔ اِس لیئے سوانح نگار کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اُس
شخص کے کریکٹر کو اُن تمام گرد و پیش کے واقعات و حالات کی روشنی میں دکھائے۔ اِس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ک
اختلافِ رائے ہر زمانے میں اور ہر مُلک میں ہوتا ہے اور علاوہ اِس کے ہم عصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر
پھیل جاتی ہیں۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ اُن غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو صحیح اور سچے واقعات اور اُس کے وسیع
تعلقات اور اصلی خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی رفع کرے اور اپنی رائے اور صحیح قیاس کے
اظہار سے دریغ نہ کرے۔ اور محض مخالفوں کے ڈر سے یا اُن کی خوشی کے لیئے یا عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر
پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اِس محنت کی داد دیں گے۔ اور اُس کے ممنون ہوں گے۔ اگرچہ
بدبین لوگوں کو اِس سے تکلیف ضرور ہوگی۔ نِرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کر دینا کافی نہیں ہے۔ اور کوئی
سوانح نگار اِس طور پر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا اُسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور
قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعتِ تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف اُلجھن پیدا ہوتی ہے بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہے
اور اِس لیئے یہ ضرور ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد و پیش کے حالات کا اثر اُس پر اور اُس کا اثر اُن حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر غلطی صحت
کے اُس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑے گا۔ اُس کی اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑے گا۔ اُس کے برتاؤ اُس کے طرزِ کلام اور
طرزِ تحریر اُس کی عام روش اور رجحان کی تلاش کرنی پڑے گی غرض سوانح نگار اِس چھان بین۔ کُرید جستجو اور تلاش کے
بعد صحیح قیاس اور رائے قائم کر سکے گا۔ اور اِس سے اُس کی اپنی نیز اَور لوگوں کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ اگر سوانح نگار ایسا
شخص ہو جو اِس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدردان نہیں تو کیا وہ اُس اہمّ فرض کو ادا کر سکتا ہے؟ مثلاً اگر وہی کتاب جسے علامۂ
موصوف نے "ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری" فرمایا ہے خود اُن کو لکھنے کے لیئے دی جاتی تو ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہوتی۔
یہ بحث ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گزرے لیکن اِس موقع پر مجھے اِس کی ضرورت اِس لیئے پڑی کہ مولوی افتخار عالم
صاحب نے ہمارے زمانے کے ایک ایسے نامور شخص کی سوانح عمری لکھی ہے جن کے مخالف بھی بہت سے لوگ موجود ہیں اور جن کے
متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی خاص و عام میں پھیلی ہوئی ہیں میں نہایت مسرت کے ساتھ اِس امر کا اعتراف کرتا ہوں
کہ **مؤلفِ حیاۃ النذیر** نے اِس اہمّ فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور ممکن ہے کہ بعض کٹ حُجت لوگ اُن کے
تصفیئے کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن جب وہ بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو کم سے کم اپنی رائے میں جھوجھرے ضرور ہو جائیں گے

شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فردِ بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اُردو زبان زندہ ہے اُن کا نام بلاشبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت۔ استقلال اور قابلیت سے دُنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ایک ادنیٰ طالبِ علم سے اعلیٰ درجے کے فاضل ہو گئے۔ اُن کی زندگی سلف ہلپ (اپنی مدد سے آپ بڑھنے) کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے۔ اُنھوں نے معلمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلم رہے۔ اُن کی تعلیم اُن کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہے اُن کا بڑا کام اصلاحِ معاشرت (سوشل ریفارم) ہے۔ یعنی یہ کہ دُنیا میں خوش۔ کامیاب اور بے لوث زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہیئے۔ ایک بڑا کمال اُن کی تصانیف میں یہ ہے کہ اُنھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں اُسی خاندان کے پردے تو نہیں کھُل رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے اُردو میں اِس زمانے میں ایسے ایسے باکمال انشا پرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اُردو زبان اور اپنی قوم کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کر کے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے۔ کسی نے دربارِ شاہی کی شان و شوکت یا جنگ کے خوں ریز منظر کا مرقع کھینچا ہے۔ کسی نے قوم کے گزشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کسی نے قومی ادبار و ذلت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے۔ لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں اُن کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے۔ اور بیان بھی کیسا۔ ایسا پر لطف ایسا سچا اور سُلجھا ہوا کہ دل میں کُھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں۔ صحرا بھی ہو۔ دریا بھی ہو۔ آسان ہے۔ لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اُوپری نظر جو بیرونی اشیاء تک محدود ہو کافی نہیں۔ بلکہ اُسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھُس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجۂ کمال موجود تھی۔

مولانا کا احسان تعلیمِ نسواں پر بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں حامیانِ تعلیمِ نسواں کی تقریروں۔ لکچروں۔ تحریروں اور قیامِ مدارس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اُن لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اُس کے وسائل بہم پہنچائے۔ مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا اور یہی نہیں بلکہ پڑھنے میں جو مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر مرأۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اُردو کے باکمال انشا پردازوں میں مانے جاتے۔ اور اُن کی حیاتِ جاودانی کے لیئے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اس میں (اور اُن کی دوسری کتابوں میں بھی) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور اُن کے خیالات کو ہو بہو اِس خوبی سے ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو ہو جاتی ہیں۔ یہ بات مرحوم کے سوا اُردو کے کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہیں۔

مولانا اپنی طرزِ تحریر کے آپ موجد تھے۔ اور یہ اُن ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔ اِس میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشا پرداز کو بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اُس کے دل میں آیا ہے اُسے اُسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے اور اسی لیئے اُسے اکثر اوقات تشبیہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو کبھی ایسی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کبھی تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیتے اور ایسے ٹھیٹ جاندار اور چپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے

بہتر اُس خیال کے اظہار کے لیے سمجھ میں نہیں آتے - زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اُردو انشا پرداز کو نہیں نصیب ہوئی اور یہی وجہ ہی کہ اُن کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا - آمد کی یہ کیفیت ہی کہ ایک دریا ہی کہ اُمڈا چلا آتا ہی اُن کی طبیعت قدرتی طور پر پُر زور واقع ہوئی تھی اور یہی زور اُن کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہی - جو قوت اور زور مَیں نے اُن کی عبارت میں دیکھا ہی وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا - انھیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں - وہ اُسی زبان میں سے جسے ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لئے بنے ہیں اور پھر اُس پر ظرافت سونے میں سُہاگے کا کام دیتی ہی - اُن پر یہ اعتراض کیا گیا ہی اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہی کہ وہ بعض اوقات رکیک اور مبتذل الفاظ استعمال کر جاتے ہیں اس کی وجہ ایک تو وہی ہی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات و استعارات سے کام لینا نہیں جانتے تھے - دوسرے طبیعت قدرۃً واقع ہوئی تھی پُر زور - وہ اپنا خیال اُسی زور اور شان کے ساتھ ادا کرنے کے لیئے الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے - جن الفاظ میں اُن کا اصلی خیال صحیح طور سے ادا ہو سکتا تھا اُن کے استعمال میں کبھی نہ چُوکتے تھے - اور یہ فعل اُن کا کوئی ارادی نہ تھا - بلکہ طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی - اور اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی طبیعت میں آورد نہ تھی بلکہ سراسر آمد تھی - علاوہ اسکے آدمی تھے صاف گو اور آزادہ رَو - جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اس پر شوخی و ظرافت اور غضب تھی - یہی وجوہ ہیں کہ اُن کی ایک کتاب پر اس قدر شور و غل مچا -

مرحوم جیسے اعلیٰ درجے کے محرّر تھے ویسے ہی مقرّر بھی تھے - لوگ اُن کے لکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں - ہم نے خود انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں دیکھا ہی کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہی - ہزاروں بندگانِ خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں - کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا - جب چاہا رُلا دیا - آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہنچتی تھی اور اُس میں ایک خداداد اثر تھا - شوخی وظرافت خاص کر اُن کے لکچروں میں دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی ایسا اعلیٰ درجے کا مقرر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا وہ ساری مجلس پر چھا جاتے تھے اور حاضرینِ مجلس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو - مسٹر مارٹین کی جو رائے مؤلف نے لکھی ہی وہ بالکل صحیح اور بے مُبالغہ ہی - انجمن حمایت اسلام - آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس - مدرسۂ طبیہ دہلی ہمیشہ اُن کے لکچروں کے شرمندۂ احسان رہیں گے - اُن کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہی کہ وہ کہیں کے کہیں چلے جاتے تھے - یہ اعتراض شاید کسی حد تک صحیح ہی - لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ جیسی اُن کی طبیعت اُن کی تحریر اُن کی عبارت اور اُن کے الفاظ اور اُن کی تقریر پُر زور تھی ویسے ہی اُن کا خیال بھی پُر زور تھا اور تخیل کے پرواز میں دُور تک پونہچ جاتے تھے - لیکن اتنی دُور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں جولانیٔ طبع انھیں ادھر سے اُدھر ضرور لے جاتی تھی - لیکن تاہم مبحث کے آس پاس ہی رہتے تھے -

ہمارے اس زمانے کے اہلِ قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں - انگریزی کے یا عربی کے - مگر مرحوم میں جدّت پائی جاتی ہی اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لیئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ اُن کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل

ہے۔ اُن کی اصلِ تصانیف۔ اُن کی جدّت طرازی۔ اُن کے پُرزور تخیّل اور مشاہدے کے نتائج ہیں۔ وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دلاویز ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبولِ خاص و عام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جو لوگ اُردو سیکھنا اور اپنے خیالات انگریزی نُما اُردو میں نہیں بلکہ ٹھیٹ اُردو میں ادا کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیئے مولانا کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے کیوں کہ اپنے خیال یا مافی الضمیر کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچنا اُن پر ختم ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ اُن کا پورا پورا تتبع کریں کیوں کہ یہ نہ صرف مشکل ہے۔ بلکہ شاید مفید بھی نہ ہو لیکن اِس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اُن کی تصانیف کے مطالعے سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اِس جدید زمانے میں مسلمانوں میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوئے ہیں خواہ وہ کسی خیال اور رنگ کے ہوں۔ سر سید رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی تک (باستثنائے شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ مرحوم) سب میں زیادہ تر دینی لگاؤ تھا۔ اُن کی تان دین ہی پر ٹوٹتی ہے اور یہی اُن کے خیالات اور اعمال کا مرکز ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ یوں تو اکثر اُن کی تصانیف میں یہ لگاؤ نظر آتا ہے لیکن اُنھوں نے خاص خاص کتابیں مثلاً رویائے صادقہ۔ اجتہاد۔ الحقوق والفرائض۔ اُمہات الاُمہ لکھ کر اور خاص کر ترجمۂ قرآن مجید سے ایسی عظیم الشان دینی خدمت ادا کی کہ مسلمان اُن کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ مَیں اُن کی دینی خدمت کے متعلق یہاں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مؤلفِ حیاۃ النذیر اِس پر خوب دل کھول کر لکھ چکے ہیں۔ لیکن ترجمۂ قرآن مجید کے متعلق چند الفاظ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس ترجمے کی تمام خوبیوں کا گنوانا تو میری طاقت سے باہر ہے لیکن اس سے بڑھ کر اَور کیا خوبی ہوگی کہ ہزارہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اب بلا تکلّف قرآن کے مطالب سمجھنے لگا۔ اور خدا کے احکام خود اُسی کے کلام کے ذریعے سے جاننے لگے۔ اُردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ترجمے کیا تھے الفاظ کے گورکھ دھندے تھے۔ خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اور سمجھ میں آئیں کیوں کر مکھی پر مکھی ماری تھی اور جو طبیعت پر کچھ زور دیکر سمجھے بھی تو وہ لطفِ فصاحت کہاں جس کے لیئے قرآن سارے عالم میں مشہور ہے۔ قرآنِ پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں اِس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصلِ عربی کا زور اور اُس کی شان قائم رہے۔ مولانا چوں کہ عربی اور اُردو کے بے مثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا۔ اِس لیئے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہئیں۔ مسلسل پڑھتے جائیے سارے مطالب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اِس سے بڑھ کر اَور دینی خدمت کیا ہوگی۔ اور یہ صرف دینی خدمت ہی نہیں۔ بلکہ اُردو و ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

اب تک بعض لوگ اِس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ مولانا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ سب ترجموں سے افضل ہے۔ اور مرحوم کا ترجمہ اُس سے لگّا نہیں کھاتا۔ اِس میں اب بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ عام مقبولیت نے ثابت کر دیا ہے کہ مرحوم کا ترجمہ ایسا مطالب خیز فصیح اور شگفتہ ہے کہ موجودہ ترجموں میں کوئی اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک بات میں البتہ شاہ صاحب کے ترجمے کو فضیلت ہے اور یہ فضیلت غالباً اُسے ہمیشہ رہے گی۔ وہ یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ کا ترجمہ اُنھوں نے ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ میں کیا ہے کہ اُس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ خصوصاً جہاں کہیں ایسے الفاظ آ گئے ہیں کہ اُن میں اشتراک

معانی کی بحث آپڑی ہو تو اُنھوں نے ہندی کے بھی ایسے ہی لفظ چُن کر رکھے ہیں کہ اُن میں بھی اشتراک کا وہی لطف باقی رہتا ہو اَور یہ اُن کی کمال ادبیّت کی دلیل ہو۔ مگر اِس کا لطف صرف ادیب ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ مطالبِ قرآن سے اُسے کچھ تعلق نہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ بامحاورہ فصیح اور شگفتہ ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے اِس ترجمے کے ضمن میں ایک مزے کی بات اَور کہنی ہو۔ جس سے ہماری قوم کے علمار کی حالت کا پتا لگتا ہو۔ مولٰنا کا ترجمہ شائع ہوتا تھا کہ اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ اُن حضرات کے ترجمے بھی شائع ہونے شروع ہوئے اور اکثر یہ اعتراضات اِس نیت سے کئے گئے تھے کہ مولٰنا کے ترجمے کی طرف سے لوگ بدگمان ہو جائیں اور ہمارا ترجمہ بکنے لگے۔ افسوس اِس سے قبل کسی کو ترجمے کی ضرورت کا خیال نہ ہوا اور اب جو مولٰنا کا ترجمہ شائع ہوا اور اُس کی شُہرت ہوئی تو یہ بھی لگے مُونہ چڑانے۔ لیکن مولٰنا کے ترجمے کے سامنے کسی کو فروغ نہ ہوا۔ اِن اعتراضات یا اسی قسم کی تحریرات میں جہاں کہیں مرحوم کا نام آتا تو یہ مولوی مارے جلن کے اِن کے نام کے ساتھ کبھی مولوی کا لفظ نہ لکھتے بلکہ ہر جگہ ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے تھے۔ یہ کم ظرفی کی بات نہیں تو کیا ہی تعجّب کی بات ہو کہ ایک شخص باوجود عالم۔ حافظ اور مترجم قرآن ہونے کے بھی ان مولویوں کے نزدیک مولوی کہلانے کا مستحق نہیں۔ جن کے علم وفضل کی ساری پونجی مسلمانوں کے ارتداد وکفر کے فتوے لکھنے میں صرف ہوتی ہو۔

بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہم عصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں مولٰنا بھی آخر عمر میں اِس سے نہ بچے۔ اُمہاۃ الاُمّہ کا شائع ہونا تھا کہ دلّی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے۔ اُن کی بَن آئی۔ خوب جلے پھپھولے پھوڑے۔ مخالفت میں رسالے چھپوائے۔ طرح طرح کے بُہتان باندھے کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہو گئے اَور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلّی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پونہچا۔

لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہو کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلمار کا جو اجلاس دلّی میں ہوا اُس میں علمائے کرام موجود ہی تھے۔ اُنھوں نے باہم "مسکوٹ" کر کے اُمہاۃ الاُمّہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معزّزین نے مولانا کی منّت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرا دی تھی منگوائیں اور اپنے سامنے اُن کتابوں کا ڈھیر لگوایا۔ اور اُن میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لیئے آگے بڑھ کر مٹّی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کر کے آگ لگا دی۔ اُس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدّس چہروں پر پڑ رہی تھی اور اُن کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اِس خوف ناک دلی مسرّت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو ایک خون خوار درندے یا سنگ دل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہو۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولٰنائے مرحوم بھی اُسی آگ میں جھونک دیئے جاتے۔ یہ منظر قابلِ دید تھا۔ مولویوں کا یہ حلقہ زمانۂ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا۔ جنھوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیئے۔ کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیئے۔ گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیئے۔ کتّوں سے پھڑوا دیئے۔ اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب وغریب شکنجوں میں کس کس کر

سِسکا سِسکا کر مار ڈالے۔ اور اُن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودۂ عبرت تھا۔ جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا۔ یہ راکھ اِس قابل تھی کہ اُس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشیوں میں بند کرکے رکھی جاتی تاکہ آیندہ نسلیں اُسے سامنے رکھ کر اُن علمائے کرام و مصلحانِ ملک و ملّت کی ارواحِ پاک پر فاتحہ دلائیں اور اُن کے حق میں دُعائے خیر کرتیں۔ اِس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اُس آگ سے اپنے نفوسِ مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً اُن کی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی۔ یہ اُن بزرگواروں کا کام ہی جنھوں نے چشمِ بد دُور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہی۔

طالبِ علمی کے زمانے میں جب مَیں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کُتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر مُحکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اُس کی تردید کی تو اُس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بُہتان ہی مگر جب مجھے اِس واقعے کی خبر لگی اور خصوصاً جب مَیں نے یہ سُنا کہ علّامۂ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کارِ خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا۔ اور اب تک میرا خیال ہی کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانۂ اسکندریہ جلا دیا ہو۔

اِس واقعے کا ایک بہت بُرا اثر یہ ہوا کہ جب مرحوم کے فرزندِ رشید نے مدرسۃ العلوم مسلمانان (علی گڑھ) سے اپنے پدر بزرگوار کی یادگار قائم کرنے کی درخواست کی اور خود بھی اُس میں معقول امداد دینے کا وعدہ کیا تو کالج کے سنڈیکیٹ نے بڑی ڈھٹائی سے مولویوں کے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ مرحوم کے معتقدات قرار دی۔ جو اُن کے زعمِ شریف میں خلافِ اسلام تھے۔ کوئی ممبرانِ سنڈیکیٹ سے پوچھے کہ تم کسی کے مذہب پر رائے دینے والے کون ہو؟ اور اس معاملے کو مذہب سے تعلق؟ سر ولیم میور اور میکڈانلڈ جیسے لوگوں کی تو یادگار قائم کی جائے۔ اور ایک حافظ عالم، مترجم قرآن، محسن کالج کی یادگار قائم کرنے میں یہ انکار! اور انکار بھی کیسا ناروا اور شرم ناک! خصوصاً جب کہ ارکانِ سنڈیکیٹ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کتاب اُمہات الامۃ کو بالاستیعاب پڑھا ہو۔ صرف مولویوں کے خوف سے گھبرا کر یہ فیصلہ کر دیا۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہی کہ کارکنانِ کالج میں مُداہنت اور بُزدلی پیدا ہوتی جاتی ہی۔ اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو جس غرض سے بانیٔ کالج نے یہ کالج قائم کیا تھا وہ فوت ہو جائے گی اور اُس کا وجود بے سود ثابت ہوگا۔ معلوم ہوتا ہی کہ یہ لوگ بعد میں اپنے کیے سے پچھتائے اور اُس کی تلافی اس طرح کی کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے متعلق رزولیوشن پاس کیا۔ غنیمت ہی۔ دیکھیں ہمارے علماء کیا کرتے ہیں۔ تلافی تو خیر وہ کیا کریں گے۔ مجھے ڈر ہی کہ کہیں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے خلاف فتویٰ نہ لکھ ماریں۔

مرحوم کے حق میں یہ صریح بے انصافی اور سخت ظلم ہوا ہی اور مجھے امید ہی کہ انصاف پسند اصحاب اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور اس محسنِ مُلک و قوم کی یادگار قائم کرنے میں سعی بلیغ فرمائیں گے ورنہ ہماری قوم پر یہ بڑا دھبا رہ جائے گا۔

قابل مؤلف نے مرحوم کے کریکٹر کے متعلق مفصل اور کافی بحث کی ہی۔ اِس کے بعد اس پر کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہی۔ مرحوم میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی صفت اُن کی معاشرت میں اعتدال اور کفایت شعاری کی تھی جس کی آج کل ہمیں بڑی

ضرورت ہے اور ہماری تمدّنی اصلاح کا بڑا دار ومدار اسی پر ہے۔ لیکن اس سے حاصل؟ کیا عمر بھر کی کفایت شعاری کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ اُس کا سارا مال اولاد باہم تقسیم کرلے؟ کیا اُس میں قوم کا کوئی حصّہ نہیں؟ خصوصًا جب کہ اولاد کھاتی پیتی اور مرفّہ الحال ہو۔ ایثار کی تلقین کرنا اَور بات ہے اور اُس پر عمل کرنا اَور۔ کسی شے کا علم عمل کے لیئے کافی نہیں۔ اعمال پر تربیت اور خاص کر ابتدائی تربیت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے الاماشاء اللہ۔ البتہ اِس زمانے میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے جو ہر طرح قابلِ تحسین اور لائق تقلید ہے۔ اُنھوں نے بھی اپنی عمر کفایت شعاری میں بسر کی لیکن اُس کے ساتھ ہی اپنا سارا اندوختہ قوم کی نذر کردیا۔

گزشتہ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایام میں ترقیِ اُردو کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا۔ اِس میں علاوہ دیگر تجاویز کے ایک یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ محسنینِ اُردو کی سوانح عمریاں لکھی جائیں۔ اِس میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اِس کے بعد ہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مولوی افتخارِ عالم صاحب اِس کام کو کر رہے ہیں بلکہ کرچکے ہیں تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور حُسنِ اتفاق سے چند ہی روز بعد اُن سے ملاقات بھی ہوگئی تو میں نے اُن کی خدمت میں دلی مبارک باد عرض کی اور اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے بڑا کام کیا اور بڑا احسان کیا ہے۔ اور جس محنت۔ جاں فشانی اور لگاتار کوشش سے اِس فرض کو انجام دیا ہے وہ اُنھیں کا حصّہ ہے اور حق یہ ہے کہ اُنھوں نے سوانح عمری کا حق ادا کیا ہے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اُنھیں ایسا سوانح نگار ملا جس نے اِس کام کو نہایت ہمدردی۔ دل سوزی اور صداقت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ طرزِ تحریر بھی فصیح اور شگفتہ ہے۔ بعض جگہ تو مجھے شبہہ ہوجاتا تھا کہ کہیں مرحوم کی عبارت تو نہیں۔ امید ہے کہ پبلک اور خاص کر مرحوم کی تصانیف کے دلدادہ ضرور اس کی قدر کریں گے۔

قابل مصنّف نے اس کتاب کو عُلیا حضرت ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے میجر حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر کے نام مُعنّون کیا ہے۔ صاحبزادے صاحب مدرسۃ العلوم مسلمانان (علی گڑھ) میں تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہونہار اور لائق نوجوان ہیں۔ ہمدردی۔ قدردانی۔ اور فیاضی میں اپنی والدہ ماجدہ کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ اُن کی ذات سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ اگلے زمانے میں مؤلفین ومصنّفین کو امرا ورؤسا کے درباروں سے ایسے ایسے صِلے ملتے تھے کہ وہ عمر بھر کو نہال ہوجاتے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ لائق مؤلف کی جانکاہی اور محنت کی قدر اُن کی لیاقت کے موافق کی جائے گی۔

نقادانِ حیاۃ النذیر کا شکریہ

مَیں نہایت فخر و مُباہات کے ساتھ ہندوستان کے مشاہیر اہلِ قلم کے تین ریویو حیات النذیر کے ساتھ شائع کرتا ہوں۔ یہ مونہ دیکھے کی تقریظیں نہیں ہیں بلکہ تنقیدی تقریظیں ہیں۔ اِن تقریظوں میں صرف ایک اعتراض وزنی ہی جس کا جواب فٹ نوٹوں میں دے دیا گیا ہی۔ حیات النذیر کے تعلق سے مؤلف کی جو کچھ مدح سرائی فرمائی گئی ہی اُس کو میں حُسنِ ظن یا ہمت افزائی کہوں تو بہت بجا ہوگا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ تاہم اِس قدر افزائی کا شکریہ مجھ پر واجب ہی۔ (خاکسار مؤلفِ حیات النذیر)

تنقید از شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی (سعدیِ ہند)

حیاۃ النذیر

یعنی سوانحِ عمری جناب شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد۔ ڈی۔ او۔ ایل مرحوم

مرتّبہ

سید افتخارِ عالم صاحب رئیسِ مارہرہ ملازم ریاستِ بھوپال جو جناب
کپتان حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر فرزندِ اصغرِ عُلیا حضرت
بیگم صاحبۂ بھوپال کے نام نامی سے مُعنون کی گئی ہی۔

مَیں مصنّفِ حیاۃ النذیر کی اِس خاص عنایت کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے مجکو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعے کا حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب پہلے اِس سے کہ چھپ کر بہمہ جہت تیار ہو جائے خاکسار کو عنایت کی ہی۔ ظاہرا مصنّف نے حیاۃ النذیر کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کردی تھی ورنہ اُن کی وفات کے بعد جس کو بہت زمانہ نہیں گزرا ایسی مفصّل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا۔ بہرحال مصنف نے اِس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہی کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا میرے نزدیک قوم کا کوئی اہلِ قلم اِس بار سے سبک دوش نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہی اور اپنے جادو اثر لکچروں سے جو سکّہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہی وہ محتاجِ بیان نہیں ہی۔ خصوصًا قرآن مجید کی خدمت

کے لحاظ سے جو امتیاز اُنھوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے۔ اُس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کر سکیں گے جب اُن کی وفات پر ایک معتدّبہ زمانہ گزر جائے گا۔ اور معاصرین کا دَور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو اُنھوں نے کیا ہے اُس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اِس قلیل عرصے میں اُس کے گیارہ اڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور کُل اڈیشنوں کی کچھ اُوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں۔ اور اُس کی مانگ یومًا فیومًا زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اِس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کو اِس وقت سوا سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی اِس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گزر چکے تھے۔ اِس عرصے میں اہلِ سنّت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا مگر جب ترجمۂ نذیریہ کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی۔ دفعتًہ بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمربستہ ہو گئے اور چند سال کی مدّت میں متعدد جدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پونہچایا۔ شاہ صاحب کے ترجمے سے بسبب اِس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمیِ قرآن کی ابتدائی حالت تھی۔ قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمۂ نذیریہ کی بامحاورہ اُردو اور طرزِ اداے مطلب کی مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلامِ الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذّت اور فائدہ اُٹھانے لگا۔ لیکن اِن ترجموں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمۂ نذیریہ کے الفاظ بدل دیئے جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں معلوم ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں۔ یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے نہ اُن کو پبلک میں وہ ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حُسنِ قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پونہچ سکتا۔ بہرحال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہے اُس کی مفصّل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کیئے جائیں گے۔ مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیئے قرآنِ کریم کی جو خدمت اِس بزرگ سے بن آئی ہے ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہے کہ اکثر صاحبوں نے ترجمۂ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (ممکن ہے کہ بعض صحیح ہوں) اور اکثر مدّعیانِ ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اُٹھایا۔ مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دینا تو درکنار ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے مُونہ سے نکلتا۔ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔

اب میں مصنفِ حیاۃ النذیر کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت

اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہو۔ باوجودے کہ راقم کی حالت مدت سے مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کردیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اَوروں سے پڑھوا کر سنوں۔

اِس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنّف نے جابجا انتخاب کیئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس جب کہ عام تحریروں کا یہ حال ہو تو جو اقتباسات مصنّف نے خاص توجّہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کیئے ہیں ظاہر ہو کہ وہ کس قدر دلاویز اور دلکش ہوں گے۔ اِس سے زیادہ ہم مولانا کی طرزِ تحریر کے متعلق اِس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اِس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اُس شخص کو اپنے اسٹائل میں تھی وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سر سید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے اسٹائل میں حاصل تھی۔

اِسی طرح مولانا کے لکچروں پر یہاں اِس سے زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہو جو بقولِ مصنّف مسٹر موریسن بالقابہ نے مولانا کے لکچروں کے متعلق کہا تھا کہ "صدہا برس تک یورپ ایسا اسپیکر نہیں پیدا کر سکتا" اِس موقع پر مولانا کی تحریر و تقریر کا ذکر محض بر سبیلِ تذکرہ آگیا ہو۔ کیوں کہ ہمارا اصلی مقصد حیاۃ النذیر کی ترتیب اور مصنّف کے اِس مہتم بالشان کام پر رائے زنی کرنا ہو۔ ورنہ مولانا کی اعلیٰ لیاقتوں کے بیان کرنے کے لیئے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہو۔

حیاۃ النذیر میں مصنّف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی۔ اُن کی طرزِ ماندو بود۔ اُن کے اخلاق و عادات۔ اُن کے اوقات و مشاغل۔ اُن کے اعتقادات اور اُن کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود اُن ہی کی تصنیفات اور تصریحات کی بنا پر کھینچا ہو۔ اِس سے معلوم ہوتا ہو کہ حالاتِ مذکورہ کے تفحّص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہو اور اِس مقصدِ عظیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہو کہ ایک بڑے آدمی کی سچّی بیوگرفی سے جو گراں بہا فائدے آیندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں اُن کے پہنچانے میں تا بہ مقدور کوتاہی یا بخل نہ کیا جائے۔

اِس بیوگرفی کے متعلق ہم ریویو نگاری کا فرض ادا کرنے کی غرض سے مصنّف کی خدمت میں ایک عرض کیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُنھوں نے جس طرح شاہد ترجمۂ نذیریہ کی فوقیت ظاہر کرنے کے لیئے اُس کا موازنہ دیگر جدید ترجموں سے کیا ہو۔ اِسی طرح کتاب الحقوق والفرائض مرتّبہ مولانا نذیر احمد کے بعض مقامات کا موازنہ حجۃ اللہ البالغہ کے ہم مضمون مقامات سے کیا ہو اور الحقوق والفرائض کے بیانات کو حجۃ اللہ البالغہ کے بیانات پر ترجیح[۵۱] دی ہو معلوم ہوتا ہو کہ مصنّف کا یہ بیان[۵۲] مولانا کی نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ ہرگز توقع نہیں کہ وہ مصنّف کو ایسی دلیری کی اجازت دیتے۔

---

۵۱ یہ ترجیح محاسنِ لٹریچر کی رُو سے نہیں بلکہ مطالب و معانی و نکات کی رُو سے ہو ممکن ہو کہ اصل کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں وہ محاسن موجود ہوں جو الحق ترجمہ آیات اللہ الکاملہ میں نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہو تو مؤلفِ حیاۃ النذیر اتنا قصوروار نہیں جتنا مترجم حجۃ اللہ البالغہ ہو۔ اِس گتھی کو علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ریویو میں خوب سُلجھایا ہو۔ ع ہو ادب شرط منہ نہ کھلواؤ۔ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

۵۲ مولانا نذیر احمد مرحوم نے حیاۃ النذیر کا کوئی بیان نہیں دیکھا۔ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

مصنّف نے شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت شمس العلمار مولٰنا شبلی کے اِس قول کو نہایت تعجب سے دیکھا ہی کہ شاہ صاحب کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی - رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے - اِس ریویو میں اتنی گنجایش نہیں ہی کہ شمس العلمار کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کی جائے - لہٰذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؎

چو بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطاست — سخن شناس نۂ دلبرا خطا این جاست

تنقید از شمس العلمار مولٰنا مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ناظمِ ندوۃ العلمار

ریویو

حیاۃ النذیر

پر

مولٰنا نذیر احمد مرحوم اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو اُن کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں - مُلک اِس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا - اور مسرّت کی بات ہی کہ یہ ضرورت بوجہِ احسن پوری ہوئی -

مصنّف نے جس تفحّص - استقصا اور سعی و تلاش سے واقعات بہم پونہچائے ہیں وہ اُن ہی کا حصّہ تھا - ایک حیرت انگیز بات یہ ہی کہ مصنّف نے مولانا نذیر احمد کے لٹریچر کا اِس قدر تتبع کیا ہی کہ کتاب پر خود مولٰنا کے لٹریچر کا دھوکا ہوتا ہی -

سوانح نگاری کا آج کل جو طرز ہی وہ ایک قسم کی وکالت[1] کے درجے تک پونہچ گیا ہی اور یہ حُسن ہی یا عیب - لیکن یہ تصنیف بھی اِس وصف سے خالی نہیں -

یہ امر بھی تعجّب سے خالی نہیں کہ مصنّف نے فسانۂ مبتلا کا انتخاب ضرورت سے زیادہ[2] کیا ہی -

مجکو اس کتاب کے متعلق اِس بات کا نہایت افسوس ہی کہ مصنّف نے مولٰنا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقابلہ کیا ہی اور وہ اِس طرح کہ شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ لے کر مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق و فرائض

---

[1] وکالت کے تو یہ معنی ہیں کہ اپنے موکل کی جا و بے جا طرف داری کی جائے - لیکن مؤلفِ حیاۃ النذیر یقین دلاتا ہی کہ اُس کو مولٰنا نذیر احمد مرحوم کے کل عیبوں پر عبور نہیں ہی - اگر عبور ہوتا تو وہ ضرور درج کرتا - اِس بارے میں جتنا کچھ بھی علم تھا وہ اُس کے لکھنے سے باز نہیں رہا - یعنی اُس نے اپنے زعم میں روشن اور تاریک دونوں رُخ دکھا دیئے ہیں اگر سکنڈ ایڈیشن کی نوبت آئی اور مولف کو بھی مولٰنا کی کمزوریاں معلوم ہوگئیں تو وہ درج کرنے میں ہرگز باک نہ کرے گا - ۱۲ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

[2] فسانۂ مبتلا کا ضرورت سے زیادہ انتخاب ایک خاص وجہ سے کیا گیا ہی - اِس نکتے کو ہمارے مکرم مولوی مفتی انوار الحق صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاستِ بھوپال اپنے ریویو میں خوب سمجھے ہیں ۱۲ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

سے موازنہ کیا ہی - یہ ایسی بات ہی کہ کوئی شخص قرآن مجید کے ترجمے سے قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ کرے - حجۃ اللہ البالغہ[۱] کا اُردو ترجمہ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہی - حجۃ اللہ البالغہ اِس درجے کی کتاب ہی کہ مولانا نذیر احمد مرحوم کے لیئے یہ فخر بس کرتا ہی کہ وہ اُس کے دقائق اور محاسن کو بخوبی سمجھ سکتے تھے -

مولانا نذیر احمد کی فارسی نویسی کی جو مثالیں پیش کی ہیں مجکو شُبہہ ہی کہ وہ اُن کی فارسی انشا پردازی کی نسبت کس قسم کی شہادت[۲] دے سکیں گے -

بہر حال ہم مصنّف کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ایک فاضل کی قدردانی کا پورا حق ادا کیا اور وہ خدمت انجام دی جو زبانِ اُردو کی طرف سے ایک فرض واجب الادا تھا - مصنّف نے کتاب کے ڈیڈی کیشن میں بھی حُسنِ انتخاب کی قابلیّت ثابت کی ہی - جناب صاحب زادے کپتان حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب اے - ڈی - سی - فرزندِ اصغرِ علیا حضرت فرماں روائے ریاستِ بھوپال کا علمی ذوق اور علم کی قدردانی اِس کی مستحق ہی کہ علمی تصنیفات اُن کے نام سے مُعَنْوَن کی جائیں اِس زمانے میں ایسی روسا کی مثالیں بہت کم مل سکتی ہیں -

---

[۱] اگر آیات اللہ الکاملہ - حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ - ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہی تو اس میں میرا کیا قصور ہی - اِس کے سوا موازنہ جو کیا گیا ہی وہ اُردو لٹریچر کا موازنہ نہیں ہی بلکہ مطالب و معانی و نکات اور مُوشگافیوں کا موازنہ ہی - مجکو یہ بات معلوم ہوئی ہی کہ مولوی نذیر احمد مرحوم نے جس وقت الحقوق والفرائض لکھنے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت نہ صرف حضرت امام غزالی کی بعض تصانیف اور حضرت شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اُن کے پیشِ نظر تھی بلکہ اَور مصنفین کی کتابیں بھی مطالعہ کی تھیں کون کہہ سکتا ہی کہ مولانا نے اِن تصانیف سے استفادہ نہیں کیا ہو گا - مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حضرت امام غزالی کی تصانیف کو پیشِ نظر رکھا ہو گا - دنیا میں اِسی طرح چراغ سے چراغ جلتے چلے آئے ہیں - حضرت امام غزالی کے چراغ سے شاہ صاحب نے چراغ جلایا اور شاہ صاحب کے چراغ سے مولوی نذیر احمد نے - اور یہ بات مُسلّم ہی کہ پہلے چراغ سے دوسرے چراغ میں زیادہ روشنی ہوتی ہی ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل - اگر اسی طرح تیسرے چراغ میں پہلے اور دوسرے سے زیادہ روشنی ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہی فضلنا بعضکم علیٰ بعض - ہاں اگر حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں مولانا نذیر احمد مرحوم کی تصانیف سے زیادہ مُوشگافیاں فرمائی ہیں اور آیات اللہ الکاملہ اُس کا عُشرِ عشیر نہیں تو علاّمہ شبلی نعمانی سے زیادہ مجھے موازنہ کا افسوس ہی اس لیئے اگر کوئی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کا صحیح ترجمہ کر کے طبع فرمائیں تو اس جرم کی پاداش میں جو بوجہِ قصورِ استعداد مجھ سے سرزد ہوا ہی بطورِ کفارہ اپنی بضاعت سے زیادہ پچاس روپیہ امداد اُس مترجم صاحب کو نذر کروں گا تاکہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے - (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

[۲] مولوی نذیر احمد کی فارسی انشا پردازی کے متعلق اِس سے زیادہ زبردست اَور کیا شہادت ہو سکتی ہی کہ ہماری موجودہ مُغلق اور دقیق اور پیچیدہ انشاؤں کے مقابلے میں اُن کی فارسی زیادہ سلیس زیادہ فصیح اور زیادہ دل چسپ ہی اگر حیاۃ النذیر کے سکنڈ ایڈیشن کی نوبت آئی تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی بیّن مثالیں پیش کریں گے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا

تقریظ از مولوی مفتی انوار الحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاستِ بھوپال

ناول کی دل چسپی کی سب سے بڑی تعریف یہی ہے کہ اسے ایک دفعہ ہاتھ میں لے کر ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ حیاۃ النذیر اگرچہ ناول نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس لحاظ سے کسی ناول سے کم نہیں۔ اپنی عدیم الفرصتی اور کتاب کی ضخامت سے مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میں اسے اتنی جلدی دیکھ سکوں گا۔ مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ اس قدر دل چسپ ہوگی۔ بہر کیف اپنا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد پھر میں اسے اخیر تک دیکھے بغیر نہ چھوڑ سکا۔ اور اس پر میں مصنّف کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی عنایت سے مجھ کو ایسی عمدہ کتاب کے مطالعے کا موقعہ ملا۔ گو اُس کے نفسِ مضمون کے دل چسپ ہونے میں بھی کلام نہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات کتاب میں زیادہ تر حسنِ ادا اور شوخیِ بیان کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ مصنّف نے مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے حالات لکھنے میں اُن کی طرزِ تحریر کا اس قدر تتبع کیا ہے کہ اُسے کمال کر دیا ہے۔ اور اکثر جگہ مصنّف کی عبارت پر مولانا کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں مصنّف کے اسلوبِ بیان کی اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ سب سے بہتر یادگار ہے جو کوئی قوم اپنے سلفِ صالحین کی حسنِ مساعی کے اعتراف میں قائم کرے۔ مصنّف نے یہ کتاب لکھ کر قوم کی طرف سے اہم فرض ہی ادا نہیں کیا۔ بلکہ اُردو علمِ ادب میں بھی ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ اجتماعِ حالات میں بھی بہت کچھ کوشش کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ مصنّف نے مولانا کی زندگی ہی میں اس کا مصالحہ فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے اس میں چنداں دشواری پیش نہ آئی ہوگی۔ صاحبِ سوانح کی یکرخانہ مدح سرائی کا نقص ہماری کتبِ سیر میں عام ہے۔ اور یہ کتاب بھی اس سے مبرّا نہیں ہے۔ یوں تو کون شخص مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات اور احسانات کا انکار کر سکتا ہے۔ جب تک اُردو زبان باقی ہے۔ اُن کی فصاحت و بلاغت اور بے نظیر انشا پردازی کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں مصنّف کے قلم کو صراط انصاف سے لغزش ہو گئی ہے۔ مثلاً امہات الامہ پر ریویو کرتے ہوئے مصنّف نے نقلِ کفر کفر نہ باشد کہہ کر اُس فتوے کی نقل کی ہے جو اس کتاب کے بعض مضامین کی وجہ سے چند علما نے مولانا کی تکفیر اور کتاب کے سوختنی ہونے کی بابت دیا تھا۔ مصنّف نے خود بھی اُن خاص مقامات کی بابت لکھا ہے کہ "وہ ضرور ایسے فقرے ہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں ہو سکتی"۔ مگر مولانا نے مصنّف کے استفسار پر اُن کی بابت صرف یہ کہہ دیا ہے کہ "بے شک شوخی ہو گئی ہے"۔ یہ درست ہے۔ لیکن بقولِ غالب مرحوم

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

میں مانتا ہوں کہ اگرچہ مصنّف نے بھی مولانا کی اُن عبارتوں کو بہ نظرِ ناپسندیدگی دیکھا ہے۔ مگر اُنھوں نے فتوے کا ذکر اور علما کا نام اس طرح لیا ہے۔ جس سے صاف تضحیک اور استہزا کی بو آتی ہے۔ انصاف متقاضی تھا کہ جب ذکر چھیڑا تھا

توکم سے کم اُن مقامات کی نقل تو کر دیتے[۱] - تاکہ لوگ خود اندازہ کر لیتے کہ علمار کے فتوے صرف بغض و حسد کی وجہ سے تھے یا اُن کی کچھ اَور بھی وجہ تھی - اب حیاۃ النذیر کے پڑھنے والے اصلِ معاملے سے بالکل بے خبر رہیں گے اور تمام الزام بے چارے مولویوں ہی کے سر تھوپیں گے - جو بد قسمتی سے پہلے ہی بے جا اور بے جا کچھ کم بدنام نہیں ہیں - مولانا شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم اور مولانا نذیر احمد صاحب کے موازنے میں بھی میرے خیال میں مصنّف نے تقریبًا بالکل یک طرفہ فیصلہ کیا ہی جس سے اُن کی بالغ نظری پر حرف آتا ہی - لیکن غالبًا اس امر کا ذمہ دار زیادہ تر وہ ترجمہ ہی جس کا مصنّف نے مولانا کی کتاب سے مقابلہ کیا ہی - اسی طرح موعظۂ حسنہ کے اُردو کے معیالے پر مرجح ہونے کے مسئلے پر بھی بہت کچھ بحث ہو سکتی ہی لیکن بہر کیف یہ اسقام ایسے ہیں جو چنداں وقیع نہیں -

کتاب کے حصۂ پنجم میں مولانا کی تصانیف و تراجم پر فردًا فردًا ریویو کیا گیا ہی اور ہر ایک میں سے کچھ حصّہ تجزیۃً درج کیا گیا ہی - ریویو مختصر ہی اور ہونا بھی چاہیئے تھا - کیوں کہ جن کتابوں کو ملک اور قوم نے قبولیتِ عام کا خلعت دے دیا ہو وہ سب نقّادانِ سخن کی رایوں سے بے نیاز ہو جاتی ہیں - مگر انتخابِ کلام کچھ عجیب طرح کیا گیا ہی - یقینًا مولانا کی سب سے زیادہ مقبول کتابیں توبۃ النصوح - مرآۃ العروس اور بنات النعش ہیں - لیکن انتخاب میں سب سے زیادہ حصّہ ابن الوقت اور اُس سے بھی زیادہ فسانۂ مبتلا کو ملا ہی - خیر ابن الوقت میں تو مولانا نے ہندوستان کے بہت سے وہم سوشل مسئلوں پر بحث بھی کی ہی مگر فسانۂ مبتلا کا مضمون یعنی دو بیبیوں کی خرابی اتنا اہم نہیں معلوم ہوتا ہی کہ پچاس صفحے اس کی نذر کیے جائیں لیکن شاید اس کے پردے میں مصنّف کو اس امر کا اظہار مطلوب تھا کہ خود مولانا مرحوم نے بھی "دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر" کے اصول کی باین شدّ و مدّ تائید کرنے کے باوجود بھی خود یہی غلطی کی - اس سے تو بدرجہا بہتر ہوتا کہ مولانا کی غیر مطبوعہ اور قابلِ قدر علمی کتاب سمٰوات کا زیادہ حصّہ دیا جاتا - لیکن شاید یہ اصولِ تجارت کے خلاف ہوتا

---

[۱] جناب نے اس اعتراض کے سوا اپنے کل اعتراضوں کو چوں کہ خود وقیع قرار نہیں دیا ہی - اس لیئے غیر وقیع اعتراضوں کو چھوڑ کر صرف اس اعتراض کے متعلق اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ردّ و قدح اور جواب سوال کے جھمیلے میں پڑنے سے تُو تُو مَیں مَیں اور تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نتیجہ نہیں - بحث مباحثے سے لوگوں کی طبیعتوں میں اَور اشتعال پیدا ہوتا ہی - بہر حال میری تو صرف یہ گزارش ہی کہ مولویوں کے نزدیک کسی مسلمان کو کافر بنا دینا شاید لڑکوں کا کھیل ہو مگر میرے نزدیک تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مشکل کام نہیں ہی - جناب اس کو خوب جانتے ہیں کہ اگلے زمانے میں بھی بیسیوں مسلمان کافر بنائے گئے تھے مگر وہی کافر آج رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ جیسے جلیل القدر لقب کے ساتھ یاد کیئے جاتے ہیں - جناب کے زمانے میں بھی ایک بے چارہ سید بہت بڑا کافر گزرا ہی لیکن اس انقلاب کو ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی اُس کا کفن بھی میلا نہیں ہونے پایا تھا کہ رحمۃ اللہ علیہ ہو گیا - میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اسی طرح یہ نذیر احمد کافر بھی اگر وہ سچّا مسلمان تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ضرور سچّا مسلمان تھا تو جناب دیکھ لیں گے کہ کافر گر مولوی خود یا اُن کے بیٹے پوتے پڑوتے اُس کافر کو مقدس ائمہ مسلمین کے گروہ میں صدر نشین بنا کر بٹھائیں گے اور رحمۃ اللہ علیہ اور قدس سرہٗ جیسے فقرے اُس کے نام کے ساتھ بڑھائے جائیں گے - مرحوم کی زندگی میں لوگوں نے اپنی مونہ زوریوں سے اُس کو ڈرا دھمکا لیا اور کفر کے فتووں سے اُس کا مونہ بند کر دیا مگر اسلام اور کفر کا معاملہ خدا کے ساتھ ہی ۔ زورت ار پیش می رود با ما ❊ با خداوندِ غیب داں نہ رود ❊ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

کیوں کہ اس کا جو حصّہ درج کیا گیا ہی وہ صرف دیدارمی نمائی و پرہیزمی گنی کا مصداق سمجھنا چاہیئے۔

آخر میں مصنّف کے اس حُسن انتخاب پر مبارک باد دیتا ہوں۔ جس سے اُنھوں نے اِس کتاب کے تہذیئے میں کام لیا ہی۔ مولٰنا نذیر احمد ہندوستان میں ایک سچّے اور کام یاب طالبِ علم کی بے نظیر مثال ہیں۔ حالتِ ناداری و بے پدری میں اُن کی علمی ترقّی۔ اور ترقّی بھی ایسی کہ اُس نے مولٰنا کو کنجاہ کے منڈوں کی مُدرسی سے سرسالارِ جنگِ اول کے صاحب زادے کی اُستادی اور اعلیٰ حضرت نظام مرحوم کی معلمی کے درجے تک پونہچا دیا۔ یہ ایک ایسی مثال ہی جو ہر وقت طالبِ علم کے پیش نظر رہنی چاہیئے۔ اِس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اِس کے سرِورق کا ہمارے طالبِ علموں کے سرتاج اور ہمارے قومی کالج کے فخرِ عالی جناب صاحب زادے حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر آف بھوپال زادہم اللہ علماً و فضلاً کے نام نامی و اسم سامی سے مزیّن ہونا نہایت مناسب اور بجا ہی۔

بہرکیف مصنّف ہر پہلو سے اپنی محنتوں کے بار آور اور اپنی مساعی کے مشکور ہونے پر مستحق تہنیت ہی۔ خدا قوم کو ایسی کتابوں کی قدر کرنے کی توفیق اور اِس کتاب کو خلعتِ قبولیتِ عام عطا فرمائے۔

انوار الحق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات

ریاستِ بھوپال ۴ نومبر ۱۹۱۲ء

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوں قلم اُفتد بدست اوّل خدا خواہم نوشت بعد ازاں در پہلوئے او مصطفےٰ خواہم نوشت
بعد اولادِ نبی و وصفِ اصحابِ رسول ہر یکے را از سرِ صدق و صفا خواہم نوشت

راقم الحروف کے نزدیک اصنافِ تالیف و تصنیف میں وقائع یا سوانح نگاری جتنا دشوار کام ہی اُتنا کوئی دوسرا نہیں۔ دشوار اِس لیئے نہیں ہی کہ صاحبِ سوانح کے واقعاتِ زندگی بہم نہیں پوہنچ سکتے۔ واقعات کا بہم پوہنچنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں۔ مشکل ہی صحیح صحیح واقعات کا دست یاب ہونا۔ جب کسی سوانح نگار کو صحیح صحیح واقعات بہم نہیں پوہنچ سکتے تو سوانح عمری کیا خاک لکھی جاسکتی ہی اور لوگ اُس سے کیا خاک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ہاں اگر کوئی شخص صحیح صحیح سوانح لکھ سکتا ہی تو وہ خود صاحبِ سوانح ہوسکتا ہی۔ بشرطے کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات میں رنگ آمیزی نہ کرے۔ اور یہ بات انسانی طبائع سے بالکل ناممکن ہی۔ کیوں کہ کوئی شخص فطرۃً نہ اپنی تشہیر کرتا ہی نہ اپنے معائب کا ڈھنڈھورا پیٹنا چاہتا ہی۔ ہمارے اس دعوے کے بطلان میں ممکن ہی کہ وہ چند سوانح عمریاں پیش کی جائیں جو خود صاحبِ سوانح کے قلم سے نکلی ہوئی موجود ہیں۔ مگر قسم کھانے کی بات ہی کہ وہ بھی رنگ آمیزی سے مبرّا نہیں۔

توزکِ جہاں گیری کی نسبت خیال کیا جاتا ہی کہ شہنشاہِ جہاں گیر نے اُس میں اپنی تمام کم زوریاں اور خوبیاں راست راست اور بےکم و کاست بیان کردی ہیں مگر ع ہرگزم باور نمی آید ز روے اعتقاد۔

راقم نے فرضی نام کے ساتھ ایک شخص کی اصلی سوانح عمری دیکھی ہی اور اُس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہی کہ سوانح نگار نے اپنی جبلّت ظاہر کرنے میں ذرا بھی بخل کو دخل نہیں دیا۔ مگر وہی فطرۃِ انسانی کے تقاضے سے مجبور

ہوکر یا قانونِ مروّجہ کے خوف سے بعض اپنے معائب قصداً سوانح عمری میں درج نہیں کیئے تاہم اُس سوانح عمری کے طبع ہونے کے بعد ناظرین جب اُس کا مطالعہ کریں گے تو تمام سوانح عمریوں سے زیادہ دل چسپ ۔ زیادہ فائدہ رساں ۔ زیادہ نتیجہ خیز اور زیادہ قابلِ تعریف پائیں گے جو اُن کی نظر سے گزر چکی ہیں ۔ اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی سرشت اور خصلت کا وہ ایک سچا فوٹو ہے ۔ جہاں اُس نے اپنی سرشتِ بد کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے زیادہ دنیا میں کوئی موذی نہیں اور جہاں اُس نے اپنی سرشتِ نیک کا مذکور کیا ہے ۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے بڑھ کر کوئی نیکوکار نہیں ۔

اس سے راقم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں ہر انسان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مذکورۂ بالا سوانح عمری میں خود صاحبِ سوانح ہے ۔ مگر اُسی کے ساتھ اُس کا یہ کامل عقیدہ ہے کہ ہر انسان نہ بالکل شیطان ہوتا ہے اور نہ کامل فرشتہ بلکہ کچھ فرشتہ کچھ شیطان ۔ اور کبھی بہت کچھ فرشتہ اور کچھ شیطان ۔ اور کبھی بہت کچھ شیطان اور کچھ فرشتہ ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونے است — از ملائک سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں شود کم ازیں — ور رود سوے آں شود بہ ازاں

انسانوں کی اس قسم میں سے پیغمبروں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے ۔ اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ قوائے فطری بلا استثنائے احدے کُل انسانوں میں یکساں ہیں ۔ مگر افراط و تفریط اور اعتدالِ قُویٰ کی رُو سے لوگوں کے مدارج متفاوت ہیں مثلاً مبدءِ فیاض نے سب آدمیوں کے دماغوں میں حافظے کی ایک قوّت رکھی ہے ۔ لیکن کسی میں وہ قوت ضعیف ہے کسی میں قوی اور کسی میں معتدل ۔ اسی پر دوسرے قُویٰ کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے ۔

کسی نے پیغمبروں کے بارے میں کیا اچھی جچی تلی مثال بیان کی ہے کہ ایک ثمردار درخت میں ایک ہی قسم کے سیکڑوں پھل لگتے ہیں ۔ اُن میں معدودے چند ہر طرح سب پر فوقیت رکھتے ہیں کہ کوئی پھل اُن کی خاص قسم کی لذّت کو نہیں پاتا ۔ یہی حال پیغمبروں کا ہے کہ اُن میں بشری خواص تو سب موجود ہوتے ہیں مگر درجۂ اعتدال میں ۔ اُن کے قُویٰ میں افراط ہوتی ہے نہ تفریط ۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُہَا کی رُو سے وہ انسانِ مکمل ہوتے ہیں اور اسی اعتدالِ قُویٰ کی وجہ سے خدا اُن کو خدمتِ رسالت کے لیئے منتخب فرماتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں ۔

بہر حال استثنائے بالا کے سوا عام انسانی سرشت جیسی کچھ بھی واقع ہوئی ہے وہ سب جانتے ہیں تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو صاحبِ سوانح اکثر اتنے قصوروار نہیں ہوتے جتنے سوانح نگار ہوتے ہیں ۔ سوانح نگاروں میں اکثر یہ عیب بہت دیکھا جاتا ہے کہ وہ نئے نئے قسم کے من گھڑت اوصاف تصنیف کر کے سوانح عمریوں میں ٹھونستے ہیں ۔ بعض مورخین کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ اپنی قوم کے کسی نامور شخص کی سوانح عمری لکھنے بیٹھیں گے تو اُس کے عیبوں کو پسِ پشت ڈال دیں گے اور اگر کہیں صاحبِ سوانح کی بدقسمتی سے اُس کے عیب طشت از بام ہو چکے ہیں تو اُن کو مارے تاویلوں کے اس طرح چھپائیں گے جیسے بلّی اپنے غلیظ کو چھپاتی ہے ۔ اس قسم کے عیوب پر ور مورخین

ہیں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں کے مورخین کے قلم میں بھی یہ مرض آ لپٹا ہی۔ وہاں اگر اس کو ہیرو ورشپ[1] سے تعبیر کرتے ہیں تو یہاں اسلاف پرستی سے ؎

ای ہنرہا نہادہ برکفِ دست عیب ہا را نہفتہ زیرِ بغل

تا چہ خواہی خریدن ای مغرور روزِ درماندگی بہ سیم دغل

انھیں حالات کی بنا پر غالباً ہندوستان کا ایک علامہ اور مشہور مورخ مآثر رحیمی پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ "اس کتاب (مآثر رحیمی) میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہی کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں۔ حال آں کہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہی۔ لیکن اس طریقے کو ہم آج کل کے پُرفریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعوے کر کے سوانح عمری کی بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہی اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہی تو اِس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے۔ یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہی تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہی اس طریقے کی عمدہ مثال ہی"

سوانح نگاروں کے متعلق ہماری مذکورۂ بالا رائے دیکھ کر بعض لوگ ہمارا مُونہ نوچ لیں گے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اُن کی زبان اور اُن کے قلم کو کس نے پکڑا ہی۔ کیوں کہ ہماری رائے نے ایک طرف سے کل سوانح عمریوں پر پانی پھیر دیا ہی۔ مگر اُسی کے ساتھ ہم کو امید قوی ہی کہ جب اُن کے غصّے کا اُبال بیٹھ جائے گا اور ٹھنڈے دل سے اُس پر غور و خوض فرمائیں گے تو ایک دن خود اُن کی بھی یہی رائے ہو جائے گی۔

بہ خشمم ناسزا می گوید و از لطفِ گفتارش گماں دارم کہ حرفِ دل نشینی بعد ازیں گوید

بہر حال اگر مورخین کی راست بیانی کا یہی حال رہا تو واقعاتِ نفس الامری رفتہ رفتہ جھوٹ میں جذب ہو جائیں گے اور پھر کسی کیمیاوی تحلیل سے بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ پھر کوئی کسوٹی ایسی مل سکتی ہی کہ کھرے کو کھوٹے سے الگ کر سکے آخر اس لغویت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ تمام سوانح عمریاں طوطا کہانی کے زمرے میں شامل ہو جائیں گی اور اِس صنفِ مفید کا جو مقصود ہی وہ مفقود ہو جائے گا۔

راقم کی اِس رائے کو جب اُس کے ایک مخلص دوست مولوی سید مظہر الحسن[2] نے دیکھا تو جواب میں لکھا کہ "درحقیقۃً مجھے اِس خیال سے کامل اتفاق ہی۔ یورپ کے سوانح نگاروں کے متعلق تو ہیرو پرستی کا اعتراف خود آپ نے کیا ہی۔ اور ایشیا کے موجودہ مورخوں کی نسبت میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ اِسی رنگ میں اُن کی تصانیف رنگی ہوئی ہیں۔ ہاں اِس میں مجھے اِس قدر استثنا ضرور کرنا پڑتا ہی کہ اس سے کچھ پہلے مسلمان مورخین نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں اُن میں روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پہ کافی روشنی ڈالی ہی۔ بہر حال بصورتِ موجودہ آپ کے خیال سے کامل اتفاق ہی" عبارت مذکورہ کو ختم کر کے ہمارے دوست

---

[1] نامور پرستی ۱۲ [2] یہ صاحب ریونیو کورٹ ریاست بھوپال میں ملازم ہیں۔ جوان صالح اگر کسی نے نہ دیکھا ہو تو ان کو آ کر دیکھ لے ۱۲

نے خط کے ایک گوشے میں عنوانِ مکرر کے تحت میں راقم کو چھیڑنے کے لئے ایک فقرہ یہ بھی لکھ دیا کہ "وہ آپ کی صداقتِ رائے کے لئے دُور کیوں جائیں آپ کی حیاۃ النذیر خود موجود ہی"۔
بہرکیف اِس چھیڑ چھاڑ کا جواب تو بعد کو دیا جائے گا لیکن راقم کو اِس امر سے بہت مسرت ہوئی کہ اُس کے ایک کنسرویٹیو (جدّۃ ناپسند) دوست نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم اگر راقم کی یہ رائے صحیح ہی تو اِس حساب سے کسی کی سوانح عمری بھی قابلِ اعتبار نہیں ٹھیرتی۔ تو کیا فی الواقع دنیا میں جتنی بھی سوانح عمریاں تالیف ہوئی ہیں وہ سب یک قلم غلط ہیں؟ کیا اُن میں صداقت کی بُو بالکل نہیں؟ کیا اُن میں ساقط الاعتبار واقعات درج ہیں؟ اگر ایسا ہی تو دنیائے سوانح عمری میں ضرور کایا پلٹ ہونی چاہیئے اور اِس سمندر میں اتنا بڑا طوفان اُٹھنا چاہیئے کہ تمام جہان کی سوانح عمریوں کو دریا بُرد کر دے۔ اور صفحۂ ہستی سے اس بے کار بلکہ مُضر صنف کو مٹا دے۔
ادپر جو کچھ لکھا گیا ہی اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بالکل صحیح ہی۔ لیکن اگر بے اعتباری کے توہّمات اِسی طرح ترقی کرتے رہے تو نہ صرف اقلیمِ سوانح نگاری میں بلکہ دنیا کے کل کاروبار میں ایک آفت برپا ہو جائے گی اور سارا کارخانۂ عالم درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ غرض ہمارے نزدیک اگر مندرجۂ ذیل اصولوں پر وقائع نگار کار بند ہو کر سوانح عمریاں لکھا کریں تو ایک نکتہ چین کو تمام واہموں اور وسوسوں سے نجات مل سکتی ہی۔
(۱) صاحبِ سوانح کے اقوال و اعمال کی تنقید کی جائے۔ یعنی جس واقعے کی اُس سے نسبت دی جائے اُس کے متعلق محققانہ طور پر یہ بات دریافت کرنا کہ اُس نے ایسا کہا اور کیا بھی ہی یا نہیں۔ اگر معتبر ذرائع سے واقعات کی شہادتیں بہم پونہچ جائیں تو اُن پر بلا وسواس اعتبار کر لینا چاہیئے ورنہ نہیں۔
(۲) صاحبِ سوانح کے اقوال و اعمال کو اُس کے دل کا ترجمان معتبر سمجھنا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ وہی کرتا ہو جو کہتا ہو اور جو کرتا ہو وہی کہتا ہو یہ نہ ہو کہ کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ دل اور زبان کا تطابق افعال سے بخوبی ہو سکتا ہی۔
اگر اِس طرح کوئی اپنے اقوال و اعمال کی کسوٹی پر اُتر جائے تو پھر اُس کے دلی عقائد کی ٹٹول سے کچھ فائدہ نہیں۔ مثلاً ایک شخص مسلمانوں کی سی وضع رکھتا ہو۔ مسلمانوں کے ساتھ کھان پان ہو۔ مسلمانوں کے سے عقائد رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ شرعِ اسلام جو ظاہر پر حکم کرتی ہی اُس کی رُو سے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ اُس کو غیر مسلم یا کافر ٹھیرائے۔ ایسا شخص ضرور مسلمان سمجھا جائے گا اور وہ ضرور مسلمان ہی **قطعہ**

هرکرا جامه پارسا بینی | پارسا دان و نیک مرد انگار
ورنه دانی که در نهانش چیست | محتسب را درونِ خانه چه کار

اِن دونوں اصولوں کے ساتھ ساتھ اگر سوانح نگار خوش قسمتی سے صاحبِ سوانح کی زندگی میں اُس کے حالات قلم بند کر لے تو اُس کو اتنی دقتیں پیش نہیں آ سکتیں جتنی کہ صاحبِ سوانح کے انتقال کے بعد۔ خود صاحبِ سوانح زندہ ہو۔ اُس کے دیکھنے اور برتنے والے زندہ ہوں۔ اُس کے اعمال و اقوال کا سلسلہ جاری ہو تو صحیح صحیح واقعات

کے جمع کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو سکتی ہے۔ کنبہ برادری اور محلے ٹولے اور شہر والوں سے اُس کی عادات و خصائل کا ٹھیک ٹھیک پتا چل سکتا ہے۔ راویوں کی دیانت و امانت کا اندازہ کر کے کھوٹے کھرے واقعات الگ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انھیں اصولوں کو مدِّنظر رکھ کر فاضل اجل جناب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل کی سوانح عمری حیاۃ النذیر تالیف کی ہے۔

راقم الحروف کو اپنے مہربان دوست کی ایک بات کا جواب اَور دینا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس نے حیاۃ النذیر میں یورپین مورخین کی طرح صاحبِ سوانح کے عیبوں میں کہیں رنگ آمیزیاں کر کے میناکاری تو نہیں کی ہے۔ یا اپنی طرف سے فرضی اوصاف گھڑ گھڑ کے تو سوانح عمری میں نہیں ٹھونسے ہیں۔ اس کا جواب راقم کے پاس اس کے سوا اَور کچھ نہیں ہے کہ حیاۃ النذیر کی تالیف میں نہ کوئی پُر فریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ نہ کسی طمع یا لالچ کی وجہ سے اُس کی تالیف ہوئی ہے نہ حبک الشئ یعمی ویصم میں مبتلا ہو کر اُس پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔ بلکہ جس چیز نے راقم کو اُبھارا یا اُکسایا ہے وہ یہ ہے کہ صاحبِ سوانح کی کل تصانیف اور مخصوص مذہبی تصانیف نے وہ کام دیا ہے جو ایک پیاسے کو آبِ کوثر کام دے سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان میں اَور اَور لوگوں نے بھی اس قسم کی اسلامی خدمتیں کی ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی تصانیف تو ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ کے سوا اَور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا بعض کی تصانیف رہبری کی جگہ رہزنی کرتی ہیں۔ بعض کی تصانیف سے تسکین کی جگہ اَور اضطراب پیدا ہوتا ہے مگر بعض تصانیف ان میں الا ماشاء اللہ بھی ہیں۔ البتہ مولانا کی تصانیف میں یہ ایک خاص صفت ہے کہ وہ قلبِ مشکوک کو قلبِ مطمئن بنا دیتی ہیں۔ اس کے سوا مولانا کی اَور غیر معمولی صفات ایسی ہیں جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں ہے بلکہ سمندر پار بھی اُن کے علم و فضل کا ڈنکا بج رہا ہے۔ غرض صاحبِ سوانح کے ان احسانات کا معاوضہ اگر کچھ ہو سکتا تھا تو وہ اُسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ راست بیانی کے ساتھ حیاۃ النذیر پبلک میں پیش کر دی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا ؏ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔

مولٰنا نذیر احمد فی الواقع اُن بزرگانِ دین میں سے ہیں جو خطابی شمس العلماء اور ایل ایل ڈی اور ڈی او ایل کے سوا امام الاسلام اور حکیم الامۃ ہونے کا فخر رکھتے ہیں۔ ان کی فضیلت نے نہ صرف ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو روشن کیا ہے۔ بلکہ ہندوستان سے باہر یوروپین ممالک میں بھی اُن کی علمی و عملی شعاعیں دماغوں کو منور کر رہی ہیں۔ اُن کی اسلامی تہذیب اور تمدنی شان و شوکت اور پولٹیکل عظمت اور لٹریری ادب کے درخشاں سیارے ہمیشہ رہنمائی کا کام دیں گے۔ وہ علومِ مشرقیہ کے مہرِ نیم روز اور علومِ مغربیہ کے ماہِ نیم ماہ ہیں۔ وہ سلف اسٹڈی[1]۔ سلف ہلپ اور سلف میڈ کی زندہ مثال ہیں۔ ان کی اسلامی حمیت۔ ملکی ہم دردی۔ گورنمنٹ کی سچی وفاداری مستقل مزاجی۔ دُور بینی۔ ثباتِ عقل مُلک اور قوم کو مفید نتائج پر پہنچاتی ہے۔

[1] سلف اسٹڈی سلف ہلپ اور سلف میڈ کا اردو ترجمہ خود ساختہ و پرداختہ ہو سکتا ہے ۱۲

وہ کبھی اُمورِ خانہ داری میں مراۃ العروس ہیں اور کبھی جنسِ لطیف کے لئے دلچسپ معلومات بہم پونچانے میں بنات النعش۔ کبھی خدا پرستی اور اصلاحِ خاندان میں توبۃ النصوح۔ کبھی اُلجھی ہوئی باتوں کو سلجھانے میں مبادی الحکمۃ۔ کبھی علمِ ہیئت میں سمٰوات۔ کبھی صرفِ عربی میں صرف صغیر۔ کبھی احکامِ شرعی کے خلاف کثرتِ ازدواج کے نتائج میں محصنات کبھی اظہارِ قبائح وضعِ انگریزی میں مصنف ابن الوقت۔ کبھی تطبیق فطرۃ و اسلام میں رویائے صادقہ۔ کبھی قواعدِ املا میں رسم الخط۔ کبھی میاں بشیر کی تعلیم و تربیت میں موعظۂ حسنہ۔ کبھی مرثیۂ قوم میں اتمامِ حجۃ۔ کبھی شریعتِ اسلامی اور فرائض انسانی اور دستور العمل زندگی میں الحقوق والفرائض۔ کبھی مقدس اسلام کے معتقدات اور اصولِ اعمال کی دلائل عقلیہ و شواہدِ مسلمہ میں اجتہاد۔ کبھی ازالۂ اعتراض تعددِ ازواج آں حضرت میں مصنفِ اُمہات الامہ۔ کبھی ترغیب و تشویق و تحریصِ قرآن خوانی میں ترجمۃ القرآن۔ کبھی تفسیر و توضیح فرقان مجید میں مطالب القرآن۔ کبھی طلاقتِ لسانی اور فصاحت و بلاغتِ اُردو لٹریچر میں مجموعہ لکچر۔ کبھی سحرالبیانی میں مجموعۂ نظم بے نظیر۔ کبھی ہم دردی سنر لیسنی میں خیرخواہِ بنی انسان۔ کبھی متعصب مولویوں کے کفر کے فتووں سے نہ ڈر کر تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں سرسید کے دست و بازو کبھی انگریزی تعلیم و ترغیب میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز لکچرار۔ کبھی مواعظ و پند دینی میں انجمن حمایت الاسلام کے مقدس واعظ۔ کبھی اجرائے طبِ یونانی کے لئے مدرسۂ طبیہ میں حاذق الملک۔ کبھی سرسید کے خطاب کو صحیح ثابت کرنے میں زندہ دلانِ پنجاب کے سرتاج۔ کبھی لطیفہ سنجی میں ایک زندہ دل۔ کبھی استعمالِ اشیاء اور طرزِ معاشرت میں سودیشی۔ کبھی دولت کے مصرفِ صحیح میں کلوا واشربوا ولاتسرفوا۔ کبھی امدادِ مدرسۃ العلوم میں اسٹرپچی ہال اور بورڈنگ کے کتبے۔ کبھی ادبِ انگریزی میں بغیر ڈگری حاصل کئے ہوئے گرایجواٹیوں سے بالا جیتنے والے۔ کبھی نظمِ عربی و اُردو میں مجموعۂ نظم بے نظیر[1]۔ غرض کبھی وہ ان سب کے مجموعے میں حیاۃ النذیر

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

آخر میں راقم الحروف ناظرین کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اُس نے اپنے کانشنس (دافی الضمیر) کے خلاف کوئی واقعہ حیاۃ النذیر میں درج نہیں کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کو کسی واقعے میں غلط فہمی واقع ہوگئی ہو۔ دیدہ و دانستہ کوئی واقعہ بڑھایا گیا ہے نہ گھٹایا گیا ہے۔ نہ کسی واقعے میں جھوٹی تاویلیں کی گئی ہیں اور نہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ اس کے سوائے راقم نے ایک بڑی جرأت اَور بھی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ یوں تو معمولی لوگوں پر بھی نکتہ چینی کرنا اگرچہ وہ نیک نیتی ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو ایک ایسا دشوار کام ہے جس کو عام طور سے ہر شخص جانتا ہے مگر مخصوص اُس شخص کی نکتہ چینی کرنا جس نے برملا ایک مقام پر یہ کہہ دیا ہو کہ "یہی (لاہور) وہ جگہ ہے۔ جہاں توحید کے بارے میں ہر سال کچھ نہ کچھ کہہ جاتا ہوں اور یہی وہ مضمون ہے جس کے صلے میں تمہارے اس شہر سے مجکو نیچری مہاند کا خطاب عطا ہوا تھا یاد ہے یا نہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ اسی مضمون کو میں اَور شد و مد کے ساتھ بیان

[1] مجموعۂ نظم بے نظیر مولانا نذیر احمد صاحب کی کل مطبوعہ و غیر مطبوعہ اُردو و عربی نظموں کا مجموعہ ہے ۱۲

کرتا اور پھر تم سے کوئی بھڑکتا ہوا خطاب لیتا اور عدالت میں مقدمہ دائر کر کے اُس کی رجسٹری کراتا"۔ یا مثلاً ایک اَور مقام پر کہا تھا کہ "وہ اخباروں کی جیسی ردّی حالت ہے ظاہر و آشکارا ہے اور میں نے اس کے شواہد بھی جمع کیے تھے۔ مگر اِن دنوں میرے پاس فنڈ کی کوتاہی ہے۔ شواہد پیش کروں تو اخبار والے ضرور گالیاں دیں جیسی اُن کی عادت ہے اور گالیاں دیں تو میں ضرور انتقام لوں جیسی میری طبیعت ہے"۔ کتنا دشوار کام ہے۔ لیکن مؤلفِ حیاۃ النذیر کو صاحبِ سوانح کے فنڈ سے خوف ہے نہ اُن کے انتقام سے۔ کیوں کہ اُس نے کسی بدنیتی سے کوئی نکتہ چینی نہیں کی ہے نہ تحقیر و تذلیل کے لیے کوئی افترا پردازی کی ہے اور نہ کوئی بہتان باندھا ہے صاحبِ سوانح انسان ہیں انسان سے خطا کا ہونا حق الیقین ہے۔ مولانا سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں خطائیں ہوئی ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ ؎

جائے کہ برقِ عصیاں بر آدم صفی زد — ما را چہ گونہ زیبد دعویِ بے گناہی

کہتے ہیں کہ لوگ کسی ادنیٰ آدمی کو بھی اُس کے مُونہ پر بُرا نہیں کہتے۔ لیکن پیٹھ پیچھے بادشاہ کو بھی بُرا کہنے سے نہیں چُوکتے۔ مگر راقم نے اس کے خلاف عمل کیا ہے۔ یعنی بادشاہ (صاحبِ سوانح) کے عیب اگر کچھ ہیں تو اُس کے مُونہ (حینِ حیاۃ) پر رکھ دیے ہیں۔ بہرحال حیاۃ النذیر میں صاحبِ سوانح کے تاریک و روشن دونوں رُخ دکھا دیے گئے ہیں۔ خوبیوں کی جگہ خوبیاں اور کمزوریوں کی جگہ کمزوریاں بیان کی گئی ہیں۔ ہاں بے ادب اور گستاخ بن کر دل آزاری نہیں کی ہے اور نہ نمک مرچ لگا کر بہ نظرِ تحقیر بات کا بتنگڑ بنایا ہے ؎

چشمِ بداندیش کہ برکندہ باد — عیب نماید ہنرش در نظر

اور نہ خوبیوں میں اپنے حسنِ اعتقاد کو سمو کر پیراں نمی پرند مریداں می پرانند پر عمل کر کے مناقب کی کتاب تیار کی ہے۔ ؎

در ہنرے داری و ہفتاد عیب — دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر

بہرحال اس کو تمہید کہیے یا تقریب۔ دیباچہ کہیے یا مقدمہ یا چھوٹا مُونہ اور بڑی بات غرض جو کچھ کہیے وہ یہ چند سطریں ہیں جو راقم کے قلم سے ٹپک پڑی ہیں۔

اقرارِ قصور ایک ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر انسان اس پر کاربند ہو تو اُس کو بہت کم خفیف ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا راقم الحروف کو علیٰ رؤس الاشہاد اس امر کے اقرار کرنے میں کچھ حجاب نہیں کرنا چاہیے کہ مولانا نذیر احمد کی لائف لکھنا اُس کا کام نہ تھا یہ کام تھا اُن بزرگوں کا جو مولانا کے علم و فضل کے ہم مرتبہ ہوں اور اُن کو لائف لکھنے کا سلیقہ بھی ہو۔ راقم نے کچھ اُلٹے سیدھے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان واقعات سے ناظرین کو کچھ فائدہ پہنچے یا صاحبِ سوانح کی لائف پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ بے شک ابھی صدہا واقعات ایسے ہوں گے جو حیاۃ النذیر میں درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ ترتیبِ مضامین میں بھی کچھ نہ کچھ بے ربطی ہو گئی ہو گی اور اگرچہ کتاب پر نظرِ ثانی کی گئی ہے مگر ایک غلط انداز نظر سے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر واقعات کی

بخوبی توضیح نہیں ہو سکی۔ بعض ناظرین کے ذہن میں ایک اعتراض یہ بھی آئے گا کہ مولانا کی تصانیف کے نمونے دے کر کتاب کے حجم کو ناحق بڑھایا ہی بے شک یہ سچ ہی۔ لیکن یہ کوئی اعتراض میں اعتراض نہیں ہی کسی کتاب پر ریویو کیا جائے اور اُس کا نمونہ نہ دکھایا جائے تو اُس کو ریویو نہیں کہہ سکتے۔ اِس کے سوا ممکن ہی کہ اسلوب بیان میں بھی کچھ نقص رہ گیا ہو۔ یا اسی قسم کے کچھ نقص اَور بھی ہوں۔ ممکن تھا کہ اِن نقائص کو دُور کرنے کے لیے حیاۃ النذیر قبلِ طبع کسی مشہور مورخ اور انشا پرداز کو بنظرِ اصلاح دکھادی جاتی جیسا کہ اکثر لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر مؤلف کو اس کا بھی موقع نہیں ملا۔ پس ایسی حالت میں مؤلف دادِ تحسین اور صلہ و انعام کی توقع کِس مُونہ سے کر سکتا ہی۔

راقم اب ان چند سطروں کو دو شکریوں اور ایک شکایت پر ختم کر کے تخفیفِ تصدیع کرتا ہی اوّل شکریہ ہی صاحبِ سوانح کی تصانیف کا جنھوں نے مؤلف کو اتنی گراں بہا امداد دی ہی کہ اگر اُن کا وجود نہ ہوتا تو حیاۃ النذیر کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔

دوسرا شکریہ ہی اپنے دوست مولوی بشیر الدین احمد کا جنھوں نے حیاۃ النذیر کے مضامین کے متعلق راقم کی اِس قدر معاونت کی ہی جتنی کہ جنابِ ممدوح صاحبِ سوانح کے خلف الرشید ہونے کی وجہ سے کر سکتے تھے۔ اگر وہ اِس قسم کی امداد نہ کرتے تو کتاب تشنہ رہ جاتی۔

شکوہ ہی خود صاحبِ سوانح کا جنھوں نے باوجود ایک طول طویل مراسلت اور بارہا حاضر باشی اور جائز خوشامد کے راقم کو کچھ مدد نہیں دی۔ جس کا تحریری ثبوت ناظرین کو جناب ممدوح کے اُس خط سے ملے گا جو اُن کے فوٹو کی صورت میں اُسی جگہ چھپاں ہی۔ صاحبِ سوانح اگر راقم کی امداد کرتے تو حیاۃ النذیر سونے میں سہاگہ ہو کر ایک بے نظیر لائف ہوتی۔ غالباً جناب ممدوح نے راقم کو اِس قابل ہی نہیں سمجھا ورنہ سے

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا — عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدی سب پر

خاکسار سید افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی

ملازم دربار بھوپال

یکم جنوری ۱۹۱۲ء عیسوی

عکسی چربا ۲!

حیاۃُ النَّذِیر

اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ

کوئی اُمت ایسی نہیں (ہوئی) کہ اُس میں (عذابِ خدا سے) کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنہ ۱۸۳۶ء لغایت سنہ ۱۸۵۴ء

ولادت ہندوستان میں بڑی پُرانی رسم ہے کہ جب مولود سال کے بارہ[۱۲] مہینے خیر و عافیت سے طے کر لیتا ہے تو اُس کے والدین اس خوشی میں شادیاں رچاتے اور رت جگے کرتے ہیں۔ سال گرہ کی تقریب کی دعوت دی جاتی ہے۔ مہمان جمع ہوتے ہیں۔ ڈومنیاں دائرے پر مبارک باد کے گیت گاتی ہیں۔ دھوم دھام کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ رنگین کلاوے میں پہلے برس کی گرہ لگائی جاتی ہے۔ بعض جگہ گلے میں ہنسلی پہنا کر اُس میں ہر سال چاندی کا گھڑا ہوا ایک چھوٹا سا چاند ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح بعض اللہ آمین اور ارمان چوچلوں کے بچوں کی رسم سال گرہ عنفوانِ شباب تک اور بعض کی بڑھاپے تک جاری رہتی ہے مگر اس ترقی میں ایک تنزل بھی ہے۔ یعنی

غافل تجھے گھڑیال یہ کرتا ہے منادی ‏ ‏ ‏ ‏ خالق نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

ناظرین میں سے اکثر کو معلوم ہے اور جن کو معلوم نہیں وہ معلوم کر لیں کہ صاحبِ سوانح عمری کا خاندان۔ مولویوں مفتیوں اور مشائخ کا خاندان تھا۔ وہاں اِن مراسم کا کیا ذکر۔ یہ باتیں تو وہاں بدعت میں شامل ہوں گی۔ اگر یہ رسمیں مولٰنا کے خاندان میں جاری ہوتیں تو کلاوہ کھول کر گرہ شماری یا ہنسلی اُتار کر چھوٹے چھوٹے چاند گن لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر جہاں کلاوے اور

ہنسلی اور چاند کا وجود ہی نہ ہو وہاں کوئی کیا کرے ٭

ہاں ہندوستان کے بعض خاندانوں میں یہ رواج بھی ہے کہ مولود کا نام تاریخی رکھتے ہیں۔ یا نظم و نثر کے کسی فقرے میں سے تاریخ نکالتے ہیں۔ مگر محمد نذیر احمد یا صرف نذیر احمد کے اعداد بھی حسابی قاعدے کی رُو سے اِس رواج کا مولنا کے خاندان میں پتہ نہیں دے سکے۔ نام کے سوا کسی مادّۂ تاریخ کا بھی باوجود تحقیقات کے پتہ نہیں چلتا ٭

خاندانی بزرگوں میں کوئی واقفِ کار اس وقت ایسا نہیں جس سے کوئی جا کر پُوچھے۔ خدا ہمارے مولانا کی والدہ ماجدہ کو حیّ و قائم رکھے۔ اِن سے کئی مرتبہ کان کے پاس مونہہ لے جا کر اور ذرا بلند آواز سے پُوچھا گیا کہ مولنا کا سالِ ولادت بتا یئے۔ جواب میں کچھ اتنے پتے تو دیئے مگر کبرسنی کی وجہ سے وہ اس قدر نامفہوم پتے تھے کہ سالِ ولادت کا ٹھیک پتہ نہ چل سکا۔ اور حساب گڑبڑ ہو کر رہ گیا ٭

یہاں سے بھی جب تشفی نہ ہوئی تو مولنا کے ہم سنوں۔ ہم مکتبوں۔ اور دوستوں کی طرف لوگوں کے دل کی تسکین کے لیئے رجوع کی۔ وہاں ایک بڑے مشہور شخص کا پتہ چلا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب ایک بزرگ مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول۔ مرحوم دہلی کالج کے صاحب زادے تھے۔ ہمارے فاضل مولنا اور یہ صاحب ایک زمانے میں ہم مکتب اور ہم سبق تھے۔ انھوں نے مدرسۂ دیوبند میں بڑا نام پایا ہے۔ اِن کا تاریخی نام تھا **منظور احمد** بحساب جمل اس نام کے اَعداد ۱۲۴۹ھ کے برابر ہیں۔ متعلمی کے زمانے میں جیسا کہ دستور ہے لڑکے آپس میں ایک دوسرے کی عمریں پوچھا ہی کرتے ہیں۔ مولنا نے بھی ایک روز مولوی محمد یعقوب صاحب سے پُوچھا اُنھوں نے سالِ ولادت کی جگہ **منظور احمد** بتایا۔ مولنا نے حساب لگایا تو خود کو مولوی محمد یعقوب صاحب سے دو برس چھوٹا پایا۔ لڑکپن کی باتیں بھی کیا ہی بھولی بھالی ہوتی ہیں۔ مولنا فرمانے لگے "یار کوئی دو برس ہم تم سے چھوٹے ہیں"

اگرچہ مسلمانوں میں جنم پترے کا رواج نہیں لیکن حسنِ اتّفاق دیکھیئے کہ جن دنوں ہمارے مولنا کان پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے تو مولانا کے ماتحت "کنجن" نام ایک پنڈت جی تھے۔ وہ جوتش کے بڑے عالم تھے اور اُن سے بڑے بڑے راجہ جنم پتروں کی فرمایش کیا کرتے تھے۔ چوں کہ آدمی تھے صوفی مزاج اس لیئے اُن کے ساتھ مولنا کو بھی اُنس ہو گیا۔ غرض پنڈت جی نے ایک روز از خود مولنا سے کہا کہ کہیئے تو آپ کا نشٹ[1] جنم پتر بنا دوں۔ مولنا ہنس کر چپ ہو گئے۔ پنڈت جی الخاموشی نیم رضا سمجھے۔ پنڈت جی نے کئی مہینے کی محنت سے وہ جنم پترہ بنا کر مولنا کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اُس کو اُٹھا کر اپنے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب کے پاس تصدیق کے لیئے بھیجا تو ٹھیک اُترا۔ یعنی ۲۳ رجادی الاولیٰ ۱۲۵۲ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء روز سہ شنبہ۔ پنڈت جی نے مولنا صاحب کو پڑھایا[2] بھی تھا ٭

اَب ہم خود مولنا کے ارشادات سے آپ کے سنہ ولادت کا پتہ لگاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس طرح یہ مرحلہ بآسانی

---

[1] غائب گم شدہ جنم پتر کو کہتے ہیں ۱۲

[2] سارست چندرکا' اور ہتوپ دیش۔ یہ دونوں کتابیں جو زبانِ سنسکرت میں ہیں مولنا پنڈت جی سے پڑھا کرتے تھے۔ انھیں پنڈت جی مہاراج نے ایک وحشت ناک پیشین گوئی بھی کی تھی جس کا ذکر آگے چل کر ہوگا ۱۲

طے ہوجائے گا۔ مولانا اپنی عمر کی نسبت سنہ ۱۸۸۱ء میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "میں زمانے کے حال پر نظر کرتا ہوں پھر اپنی طرف دیکھتا ہوں کہ اربعین سے متجاوز ہوا۔ ضعفِ قویٰ مجکو محسوس ہونے لگا۔" اور اسی طرح سنہ ۱۸۹۵ء میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہی۔ ساٹھ برس کی عمر تو میری ہونے آئی۔ ہم نے تو انفلوئنزا کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ اَب یہ حال ہی کہ تمام روے زمین پر انفلوئنزا کا ہلچل مچا ہوا ہی۔"

اگرچہ یہ شہادتیں ثبوتِ مدعا کے لیئے کافی ہیں اور ان پر جرح و قدح کرنی بے سود ہی۔ لیکن لوگوں کی بدگمانی کا کیا علاج۔ وہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے قواعد و قوانین میں پنشن کے لیئے عمر کی قید ہی۔ اِس لیئے اکثر عہدے داروں کو حضرت سعدی کے اِس مشہور چٹکلے؎ "دروغ مصلحت آمیز بہ" سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ملازمت کے وقت اپنی عمریں چھپائی پڑتی ہیں بڑے بڑے متدین عہدہ داروں کو ایسا کرتے دیکھا ہی کہ پوری تنخواہ میں پنشن کا گھن جلد نہ لگ جائے۔ اِس رسم کا رواج آج کل انگریزی خوان طلبا میں بھی بکثرت پایا جاتا ہی۔ اسکول میں نام درج کرائیں گے تو عمر گھٹا کر۔ وہاں دیر میں پنشن لینے کے لیئے۔ اور یہاں دیر تک نوکری کے مستحق بنے کے لیئے۔ اِسی بنیاد پر لوگ کہتے ہیں کہ مولانا نے بھی ایسا ہی کیا ہی۔ یعنی جب ترجمۂ تعزیراتِ ہند کے صلے میں ڈپٹی کلکٹری کے لیئے سرکار میں نقشہ بھیجا گیا تو اُس میں ولادت ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۳۳ء درج کرائی۔

اِس میں شک نہیں کہ سرکار میں مولانا کی عمر غلط ظاہر ہوئی ہی۔ مگر جس غرض سے لوگ اپنی عمریں گھٹا کر لکھایا کرتے ہیں یہاں اُس کے برعکس تھا جس وقت ڈپٹی کلکٹری کا نقشہ جانے لگا تو ہمارے مولانا لڑکے تھے بے ریش و بروت۔ چنانچہ مسٹر لو سکرٹری بورڈ آف ریونیو نے رول دیکھ کر میر ناصر علی خاں؎ ذوالقدر مرحوم سے جن کی معرفت وہ رول پیش کیا گیا تھا فرمایا کہ "یہ نوعمری یہ لڑکا ڈپٹی کلکٹری کا اہل نہیں" لیکن بعد کو میر ناصر علی خاں صاحب نے رول کی اصلاح کردی ہوگی یا خود مسٹر لو نے رعایت کی ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ مولانا کا **منظور احمد** صاحب سے یہ فرمانا صحیح تھا کہ "یار کوئی دو برس ہم تم سے چھوٹے ہیں" اور اس سے زیادہ قابلِ وثوق پنڈت جی کا بنایا ہوا جنم پترہ تھا۔ کیونکہ اُس پر ہمارے مولانا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب صاد کرچکے تھے۔ بہرکیف اِس وقت ماشاء اللہ چشمِ بد دُور ہمارے شمس العلماء۔ ڈاکٹر۔ مولانا مولوی۔ حافظ نذیر احمد صاحب۔ ایل ایل۔ ڈی۔ کی عمر ۷۶ برس کی ہی **مصرع** صد و سی سال اس کو اَور رکھیو اے خدا باقی

مولد۔ وطن۔ مسکن مولانا کا مولد ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور جیسے غیر معروف قریے میں ہی لیکن وہ یہاں بہت کم رہے۔ کیوں کہ اُن کے والد مولوی سعادت علی صاحب خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بجنور چلے آئے تھے

۱؎ گلستاں کی پوری مثل یہ ہی "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اِس پر معترض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام خاص خاص صورتوں میں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہی۔ حالانکہ جھوٹ بولنے کی اجازت مقولۂ سعدی سے ثابت نہیں ہوتی۔ سعدی کا مطلب یہ ہی کہ دروغ مصلحت آمیز راستی فتنہ انگیز سے بہتر ہی یعنی ہیں تو دونوں بُرے مگر دروغ مصلحت آمیز کی بُرائی بمقابلہ راستی فتنہ انگیز سے کم ہی ۱۲ (از الحقوق والفرائض)

۲؎ اِن کو گورنمنٹ سے ذوالقدر کا خطاب تھا۔ جو ترجمہ ہی آنریبل کا۔ اور یہ خطاب ان کو غدر کی خیرخواہی کے صلے میں ملا تھا۔ اِن کے متعلق ایک عجیب بات یہ تھی کہ چار بھائی اور چاروں ڈپٹی کلکٹر۔ اِن کے تعلقات ہمارے مولانا سے جو کچھ تھے اُن کا حال آیندہ ملاحظہ کیجیئے گا ۱۲

اور اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ تو بجنور بقول ہمارے مولنٰنا کے "بجنور میرا مولد نہیں۔ وطن اقامت نہیں۔ بلکہ وطن اصلی ہی"
یا دوسری جگہ اپنے صاحب زادے کو لکھا ہی "آخر بجنور کا بھی کچھ حق ہی۔ مَیں وہیں کا کہلاتا ہوں۔ کیوں کر کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر لوں"۔ لیکن آپ چوں کہ عرصہ دراز سے مولنٰنا دہلی میں تشریف فرما ہیں اس لیئے صاف صاف تو نہیں ہاں اشارۃً کنایۃً بجنور چھوڑ دلّی کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔ اوّل وہ دلّی کی تعریف اِس طرح کرتے ہیں۔

"مَیں جس بات کو دیکھتا ہوں وہ یہ ہی کہ دلّی کو دوسرے بلادِ ہند پر ایک دینی فضیلت ہی۔ یہ امام ہی اور دوسرے شہر مقتدی۔ یہ مجتہد ہی اور دوسرے شہر مقلد۔ یہ اصل ہی اور دوسرے شہر نقل۔ یہ اسلام کا تنہ ہی اور دوسرے شہر فروع۔ مَیں اِس کو ہرگز مبالغہ نہیں سمجھتا۔ کہ اسلام کے اعتبار سے جو نسبت مکّے مدینے کو عرب سے ہی وہی نسبت دلّی کو ہندوستان سے ہی۔"

اِس کے بعد فرماتے ہیں۔

"مَیں اِس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ مَیں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اگرچہ دہلی (ہائے دہلی) جو سیکڑوں برس تمام ہند کا دار السلطنت۔ خلائق اور حاجاتِ خلائق کا مرجع۔ لیاقت اور کمالات کا مرکز حکومت اور دولت کا منبع رہی اب مضافاتِ لاہور میں سے ہی۔ مگر دہلی والے تو کیوں اپنے تئیں پنجابی سمجھنے لگے۔ پنجابی بھی ان کو پنجابی نہیں سمجھتے۔ اور وہ پنجابی ہیں بھی نہیں۔ اور ہو سکتے بھی نہیں۔ جغرافیے کی رُو سے دہلی اور پنجاب کے مواقع مختلف۔ دونوں کے باشندوں کی زبان مختلف۔ وضع مختلف۔ خیر تو غرض یہ ہی کہ مَیں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اور اس بات کو میں اِس غرض سے ظاہر نہیں کرتا کہ خدانخواستہ میں پنجاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنا وطن عزیز ہی۔ مجکو بھی وطن کے ساتھ اُنس ہی اور ہونا چاہیئے۔ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

یا مثلاً ایک مقام پر اور فرماتے ہیں کہ۔

"اگرچہ مَیں میرٹھ کے نزدیکانِ بے بصر میں سے ہوں یعنی دلّی رہتا ہوں اور میرٹھ دلّی کا ایک محلّہ ہی"۔ یا مثلاً "۵۷ء میں ہندوستانیوں نے ایک مرتبہ نادانی کی اُس کا ایسا خمیازہ جھگتا کہ کوئی ہم دلّی والوں کے دل سے پوچھے"

غرض مولنٰنا ریہڑ میں پیدا ہوئے بجنور کو اپنا وطن بنایا وہاں سے دلّی پہنچے۔ ابتدا میں اگرچہ دلّی سے دل اُچاٹ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اُس کا اُنس دل میں بیٹھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہیں رہ پڑے۔ اب جو کچھ کہیئے وہ دلّی ہی ہی۔ مولد وہی۔ مسکن وہی۔ وطن وہی۔ پس مولنٰنا کو بجنوری نہیں بلکہ دہلوی کہنا چاہیئے جسکی نسبت میر صاحب فرما گئے ہیں۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم گاہ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے مار کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

دلّی کو کیوں وطن بنایا؟

مولنٰنا کا عقد چوں کہ دہلی میں ہوا تھا۔ اِس تعلق کے وقت اِس بات کا ضرور خیال کیا

ہوگا کہ وطن کیا چیز ہی؟ اور مستقل سکونت کے لئے آدمی کو کسی خاص جگہ کا پابند ہونا مناسب بھی ہی یا نہیں۔ اور ہی تو میں کون سی جگہ اختیار کروں؟ آخر کار مولنٰنا نے اِن سوالوں کا یہ فیصلہ کیا کہ تمدّن سے مقصودِ اصلی ہی آسایش۔ اور وہ جیسی شہروں میں مُیسّر آسکتی ہی دیہات میں ممکن نہیں۔ شہروں میں ہر قسم کا آدمی موجود۔ ہر طرح کی چیز مُہیّا۔ بے شک دیہات میں بھی خاص خاص فائدے ہیں جو شہریوں کو نصیب نہیں۔ جیسے آب و ہوا کی عمدگی۔ دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلّف زندگی۔ اُن کی شرافت یعنی غور سے دیکھا جائے تو انسانی فطرت کا رنگ اہلِ دیہات میں زیادہ جھلکتا ہی بہ نسبت اہلِ شہر کے۔ ہیں تو دیہاتی بھی آدم ہی کی اولاد مگر پھر بھی ان لوگوں میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی شہریوں میں۔ مگر ویسے ہی دیہات میں عقلی ترقی کے سامان نہیں۔ شہریوں کے ناشایستہ حالات روی خیالات دیکھ کر ہمارے مولنٰنا کا دل دیہات کی طرف جُھکتا تھا۔ مگر طالب علمی کا عشق اُن کے پیچھے ایسا لگ گیا تھا کہ یہ شوق بے شہر کے پورا نہیں ہو سکتا تھا پس مولنٰنا نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ رہوں گا تو شہر میں اور اُنھوں نے اِسی وجہ سے اپنی تجویز اور رضامندی سے دہلی میں بیاہ کیا۔ دلّی کو مولنٰنا نے اَور شہروں پر برتری دی۔ کیوں کہ یہ بڑا اور بادشاہی شہر ہی۔ مدتوں دارالسلطنۃ رہا ہی۔ شاہجہاں نے پہلے اِس کا نقشہ جما لیا اِس کے بعد لوگوں کو بسنے کا حکم دیا تو اِس کی آبادی بہت ہی خوش قطع واقع ہوئی ہی۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اور چوک۔ یہ تین چیزیں تو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور یوں شہر سے لے کر قطب صاحب تک چھ سات کوس کے گرد ایسی ایسی عمارتوں کے بیشمار کھنڈر پڑے ہیں کہ دیکھ کر خدا یاد آتا ہی۔ بڑے بڑے باکمال لوگ اِس سرزمین میں ہو گزرے ہیں۔ اور اگرچہ بہار کا موسم نکل گیا مگر ایسا بھی کیا ہی کہ ہوا میں ذراسی بھی مہک نہ ہو۔ زبان جیسی یہاں کی مستند ہی کہیں کی ہو نہیں سکتی۔ لوگوں کی وضع بھی بھلے مانسوں کی سی ہی۔ منھ پر مقطع ڈاڑھیاں۔ نیچے نیچے انگرکھے۔ تنگ موری کے پاجامے۔ مگر ٹخنے کھلے ہوئے۔ مسجدیں بکثرت اور سب آباد۔ دین کے اعتبار سے مولنٰنا نے دلّی کو ہندوستان کا مکّہ مدینہ کہا ہی تو بالکل بجا کہا ہی۔ غرض انھیں خیالات نے مولنٰنا کو دلّی کا گرویدہ بنا دیا۔

خاندان اور خاندانی حسب و نسب

خاندان کے متعلق ہم زیادہ لکھنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آدمی کا سب سے بڑا جوہر یہ ہی کہ وہ کسی خاندانِ عالی کا بانی ہو۔ اور یہ جوہر ہمارے مولنٰنا میں نہایت روشن طور پر موجود ہی۔ گو انسانی کمزوری کی وجہ سے خود بھی اپنی شرافتِ خاندانی کا شجرہ لے کر چشمک کرنے والے ہم چشموں میں استشہاد کے لئے موجود ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"مجکو اِس بات کا فخر حاصل ہی کہ اَباً عن جدٍ موروثی مسلمان ہوں اور اپنے نسب نامے میں انقراضِ سلطنتِ دہلی تک بلا فصل مشائخ اور مفتی اور علماء کے نام پاتا ہوں"

مگر ہمارے خیال میں مولنٰنا کو اِس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اُن کے شجرے کی کسی شاخ کو وہ سرسبزی حاصل نہیں جو اُن کے قلم کو حاصل ہی۔ پس مولنٰنا کو اِس بارے میں عرفی و جامی کا ہم زبان ہونا چاہیئے۔

المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست | اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را
بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی | کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ناظرین معلوم کریں گے اور اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ جو شرف و اعزاز ہمارے مولنٰنا کو حاصل ہی وہ آج تک اُن کے خاندان میں

کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ انصاف یہ کہتا ہے کہ مولانا نے اپنی خاندانی گم شدہ اور مردہ عزت وعظمت کو از سر نو زندہ کیا ہے۔

مولانا کو شاید اپنا شجرۂ نسب پیش کرنے کی ضرورت دہلی میں پیش آئی ہوگی۔ ہندوستان میں کیا تمام ممالک اسلام میں شادی بیاہ کے وقت شجرۂ نسب پیش کرنے کی رسم قدیم سے جاری ہے۔ دہلی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں یہاں کا دستور ہے کہ جب شادی بیاہ کا پیام بھیجا جاتا ہے تو اس کے ساتھ رقعہ جاتا ہے اور اس میں آبا و اجداد کے اسمار گرامی ایک قایم شجرہ نما طریقے کے ساتھ لکھ کر بھیجے جاتے ہیں تاکہ شرافت ونجابت کا کافی اندازہ ہو۔ شہروں میں حب ذات برادری کی چنداں پابندی نہیں ہے اور اچھا خاصا ست نجا ہے تو پھر اس چھان بین کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دلی والوں کے موقع پر یہ رسم ہمارے خیال میں کچھ بہت زیادہ زیب نہیں دیتی اس لئے کہ وہاں تو بقول شخصے شیخ بھی معجونی ہیں اور سید بھی۔ ایسے معجونی حسب نسب کے لوگوں میں کسی عزت کے موقع پر ہمارے مولانا کا شجرۂ نسب واقعی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہوگا اور اس کا وہ مستحق بھی تھا۔ دیہات میں بالعموم ہڈی بوٹی بہت ٹٹولی جاتی ہے تاہم اگر مولانا کے شجرے کا سرسری ریویو کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ددھیالی سلسلے میں کچھ دنوں سجادۂ مشیخت کو رواج رہا، پھر محکمۂ افتار میں فتووں کو مُہر سے زینت ہوئی ہے۔ اخیر میں علم وفضل کو بھی عمامۂ شرف حاصل ہوا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا نے جو کچھ برتری حاصل کی ہے وہ ضرور ان کا کسب ہے لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وضع داری۔ شرافت۔ وقار۔ علمناہت خاندانی صفات ہیں متوارث جو بزرگوں سے ان کی نسلوں میں منتقل ہوتی چلی آتی ہیں اور اس قاعدے سے ہمارے مولانا نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ باپ سے بیٹے دادا سے پوتے یا اپنے سارے خاندان سے ہمارے مولانا اچھے ہوں۔

ددھیال اور ننھیال

حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کے نامور خلفار میں شاہ عبدالغفور اعظم پوری[1] ایک بزرگ تھے ہمارے مولانا انھیں کے خاندان میں ہیں۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔ مولانا نذیر احمد۔ ابن مولوی سعادت علی۔ ابن پیرجی نجابت علی۔ ابن پیرجی فیض اللہ ابن مفتی نصراللہ۔ ابن شیخ ابوالفضل ملقب بہ پیر فضل۔ ابن شاہ حاتم۔ ابن شاہ مبارک۔ ابن شاہ ابواسحٰق۔ ابن شاہ عبدالغفور اعظم پوری۔ ان بزرگ کی نسبت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں۔

"شاہ عبدالغفور اعظم پوری از خلفائے شاہ عبدالقدوس گنگوہی بسا صاحب کرامات ومقامات بودہ اند روزے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم را در خواب دیدند وآں جناب ایشاں را درودے تعلیم فرمودہ"

کچھ عجب نہیں کہ ہمارے مولانا کو اس پر بڑا ناز ہوگا کہ ان کا ددھیالی سلسلہ شاہ عبدالغفور اعظم پوری تک منتہی ہوتا ہے جو شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید اور مرید بھی صاحبِ کرامات ومقامات تھے۔ مگر ہمارے نزدیک کل کرامات ومقامات سے شاہ عبدالغفور صاحب کو اپنی اس کرامت پر بڑا ناز ہونا چاہیے کہ ان کی اولاد میں مولانا نذیر احمد سا صاحبِ مقامات پیدا ہوا۔

مولانا کے والد مولوی سعادت علی صاحب فارسی میں بڑے قابل تھے۔ عربی بھی اچھی خاصی تھی جتنی کہ فارسی کو درجۂ اعلیٰ پر پہنچا سکنے کے لئے کافی ہو۔ فارسی کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔ سنا ہے کہ ان کی خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی چند کتابیں ابھی تک محفوظ ہیں۔ مولوی صاحب موصوف دین دارانہ مصلے پر ہمیشہ خدا پرستی کیا کرتے تھے۔ وضع داری میں اگلے زمانے کے بزرگ تھے۔ خاص ضلع

[1] اعظم پور تحصیل چاند پور ضلع بجنور میں ایک قصبہ ہے ۱۲

بجنور میں نقلِ وطن کی وجہ بظاہر اس کے سوا اَور کچھ نہ تھی کہ وہاں کے قاضی عبد النبی صاحب نے اپنی بیٹی شاہ حاتم سے منسوب کی چوں کہ اُن کے سوا قاضی صاحب کے کوئی اَور اولاد نہ تھی جو کُل جائداد کا اُن کے بعد انتظام کرتی اِس لیئے اُنھوں نے اپنے نواسے شیخ ابو الفضل صاحب کو اپنا جانشین قرار دیا۔ یہ وہی ابو الفضل ہیں جن کی نسبت شہنشاہِ اکبر نے خاص طور سے ایک رقعہ تحریر فرمایا تھا جس میں یہ الفاظ تھے "شیخی شیخ ابو الفضل" یہ رقعہ ہمارے مولٰنا کے ہاں موجود تھا معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ یہ ابو الفضل مولٰنا کے ہم اجداد ہیں شیخ ابو الفضل کے پانچ بیٹے ہوئے۔ مگر خود شیخ صاحب پیری و مُریدی کا سلسلہ جاری رکھنے کے باعث پیر فضل کہلائے۔ اور اُن کی نسل پیرزادے۔ ہمارے مولٰنا جس محلے میں رہتے تھے وہ اسی وجہ سے پیرزادوں کا محلہ کہلاتا ہے۔ قاضی غلام علی شاہ مولٰنا نذیر احمد صاحب کے نانا چوں کہ مرفّہ الحال تھے اِس لیئے اُنھوں نے مولوی سعادت علی صاحب کو خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ جب قاضی صاحب نے قضا کی تو جائداد کی نسبت جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مولٰنا کی والدہ اپنی سُسرال میں بجنور جا کر رہنے لگیں۔ اِس وقت ہمارے مولٰنا کی عمر تقریباً ۴ سال کی ہوگی۔ غرض مولوی سعادت علی صاحب نے بعارضۂ سلّ و دق بجنور میں انتقال کیا۔ +

ہمارے مولٰنا کے ننھیالی سلسلے میں بھی مسندِ قضا پر عزتِ شاہی تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ شاہ عبد الغفور صاحب سے اُتر کر شاہ مبارک اور شیخ ابو الفضل بھی ہیں۔ مگر شیخ مبارک[1] وہ مبارک نہیں جن سے نامبارک بیٹے پیدا ہوئے اور نہ ابو الفضل[2] وہ ابو الفضل جو مبارک باپ کا نامبارک بیٹا کہلایا۔ یہ ابو الفضل وہ ابو الفضل ہیں جن کے پانچ بیٹے اور پانچوں کے پانچوں مفتی اور وہ بھی بادشاہی شیخ وقت تو تھے ہی شاید یہ بھی اُن کی کوئی کرامت ہو۔ مولٰنا نذیر احمد صاحب کی ننھیال بھی وہی ہے جہاں اُن کا مولد ہے +

مولٰنا نذیر احمد صاحب سے پہلے اُن کے ایک بھائی مولوی علی احمد صاحب پیدا ہو چکے تھے اور اُن کے بعد بھی ایک اَور بھائی ضمیر احمد صاحب پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ہمارے مولٰنا خَیرُ الاُمُورِ اَوسَطُہا میں داخل ہیں۔ مولٰنا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب بڑے ادیب تھے۔ زبانِ عربی میں پوری دست گاہ تھی۔ مولٰنا کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی دونوں بھائی سررشتۂ تعلیمات میں پہلے پہل ملازم ہوئے۔ قدرتِ خدا کہ ایک نے معراجِ کمال پر ایسی ترقی کی کہ آج آسمانِ علم و فضل میں آفتاب ہو کر چمک رہے ہیں اور ایک باوجودے کہ اپنے چھوٹے بھائی سے کسی طرح لیاقت میں کم نہ تھے بلکہ مذہبی پابندی اور تقوے میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے عالمِ گُمنامی میں رہے۔ تاہم وہ سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ ایک عرصے تک بریلی کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقۂ بجنور ہو گئے۔ اور آخر کار پنشن پر رٹائر ہوئے۔ اور ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو بمقام بجنور انتقال کیا۔

اِن کے تقدّس کی ایک مثال یہ مشہور ہے کہ مرض الموت میں ہمارے مولٰنا اِن کے پاس بجنور پہنچ گئے تھے۔ مولوی صاحب کی حالت ردی تھی۔ یونانی علاج نے فاقوں کے مارے سارا جسم گھلا ڈالا تھا۔ طاقت بالکل سلب ہو گئی تھی۔ مولٰنا نے انگریزی علاج شروع کرانا چاہا۔ مگر مولوی علی احمد صاحب نے سخت تنفّر ظاہر کیا کہ انگریزی دواؤں میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے مجھے مرنا منظور مگر انگریزی دوا کھانا منظور نہیں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ وہ مرتے مر گئے مگر انگریزی دوا نہ پی۔ مولوی صاحب مرحوم ایک خلیق آدمی تھے نہایت نیک نفس اور منکسر المزاج۔ اپنی طرح ساری دنیا کو ایمان دار جانتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ہمیشہ لوگ اُن کو مالی نقصان

[1] دربارِ اکبری کا شیخ مبارک جو فیضی اور ابو الفضل کا باپ تھا ۱۲ [2] ابو الفضل شیخ مبارک کا بیٹا کہ دونوں دربارِ اکبری میں بہت بدنام ہیں ۱۲

پونہچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو قرضِ حسن دینے کے خوگر تھے لیکن معلوم ہوا ہو کہ مرتے دم تک ایک حبہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ ہمارے مولنا کو مولوی علی احمد صاحب کی یہ حالت بخوبی معلوم تھی۔ اِسی وجہ سے آپ اُن کو ایک معتدبہ رقم ماہواری دیا کرتے تھے۔

مولنا کے ایک چھوٹے بھائی ضمیر احمد صاحب بھی تھے۔ اِن کی تعلیم واجبی ہی واجبی تھی۔ اِن کی یہ حالت ماں کے لاڈ پیار نے بنائی تھی۔ سب میں چھوٹے یہی تھے۔ چھوٹوں پر علی العموم مائیں مہربان ہوا ہی کرتی ہیں ان پر ایک خاص وجہ سے لاڈ پیار تھا وہ یہ کہ مولنا نذیر احمد صاحب اور مولوی علی احمد صاحب دونوں ماں سے الگ دہلی میں رہتے تھے۔ اگر ضمیر احمد بھی الگ ہوجاتے تو بھلا ماں کا دل کس سے بہلتا۔ غرض یہ تعلیم کی طرف سے بالکل کورے رہے۔ گورکھپور میں انھوں نے اپنی ساری عمر بسر کی دیکھنے میں قوی ہیکل اور خوش رو جوان تھے۔ پہلے کچھ دنوں میونسپلٹی میں نوکر رہے۔ اِس کے بعد پولیس کے تھانہ دار ہوگئے لیکن یہ نوکریاں مولنا کے مارے باندھے کی تھیں۔ مولنا جب گورکھپور کی ڈپٹی کلکٹری سے دوسرے ضلع میں بدل گئے تو ان حضرت نے بھی نوکری چھوڑ دی اور گھر جا کر بیٹھ رہے اِس کے بعد کچھ دنوں زراعت سے خوشہ چینی کی۔ لیکن وہاں بھی رائی کے برابر جب نفع نہیں ہوا تو اس کو بھی چھوڑ چھاڑ دیا۔ انھوں نے وہیں گورکھپور میں ایک عقد بھی کر لیا تھا۔ سُنا ہی کہ اسی عقد نے انھیں بہت سی مضرتیں بھی پہونچائیں۔ اِن کی والدہ نے ہرچند وطن میں بُلایا مگر نہ آئے آخر ایک مرتبہ ماں کی مامتا نے جوش کھایا اور خود باین کبر سنی گورکھپور پونہچیں مگر مرحوم نے ٹال دیا اور والدہ کے ساتھ وطن کو نہ گئے جب ان کی بی بی کا انتقال ہوگیا تو آخر عمر میں بے بلائے بجنور چلے آئے اور ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۰۵ء کو وہیں انتقال کیا۔ یہ صاحب لاولد گزرے ❊

ہمارے مولانا کے بھائیوں کے سوا تین بہنیں بھی ہوئیں۔ سب سے چھوٹی عالم جوانی میں بہ قیام نگینہ ضلع بجنور اپنی سسرال میں عسر ولادت سے مریں۔ دو اب بقیدِ حیات ہیں۔ دونوں مولنا سے عمر میں چھوٹی ہیں۔ اِن دونوں میں بڑی پیرجی صادق علی صاحب سے منسوب تھیں۔ اِن کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چار لڑکے حافظ ہیں۔ یہ خود بڑی دین دار شب زندہ دار ہیں حج بھی کر آئی ہیں اکثر حصہ راتوں کا عبادت میں صرف ہوتا ہی قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ اُنگلی میں کپڑا لپیٹ کر ورق اُلٹتی ہیں۔ کوئی بیمار پڑا تو اس کی تیمارداری گویا اُن کا فرض ہو۔ اور کوئی مرتا ہی تو تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کو ثوابِ عظیم سمجھتی ہیں ❊

مولنا کی دوسری بہن منشی رفیع الدین صاحب تحصیلدار پنشنر سرکار عالی نظام سے منسوب ہیں۔ ان کے بھی کئی لڑکے لڑکیاں ہیں۔ رفیع الدین صاحب کے یہاں بڑی بھاری زمینداری ہی یہ صاحب نگینہ ضلع بجنور میں رہتے ہیں۔

خدا کے فضل سے مولنا کی والدہ بقیدِ حیات ہیں آنکھوں کی بینائی ماشاءاللہ چشم بد دور ابھی تک موجود ہی۔ دانت دو ایک باقی ہیں چل پھر بھی سکتی ہیں بلکہ آٹا سیدھا کچھ سی پرو بھی لیتی ہیں۔ ہوش و حواس کبھی درست رہتے ہیں اور کبھی نہیں۔

دس برس نہیں گزرے ہوں گے کہ مولنا کی نانی نے انتقال کیا ان کی بھی مرتے دم تک یہی حالت تھی اِس سے معلوم ہوتا ہی کہ درازیِ عمر بھی اس خاندان کی ایک خصوصیت ہی۔ خدا کرے کہ مولنا کو بھی نصیب ہو ❊

غرض مولنا کی خاندانی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم ہمیشہ ان کے خاندان میں منتہائے شرافت رہا ہی۔ مرد تو مرد عورتیں بھی تعلیم یافتہ اور پابند مذہب ہیں۔ مولانا اصل میں شیخ صدیقی ہیں ❊

خاندانی جائداد | سلاطینِ یورپ سے دُور شاہانِ ایشیا اور خصوصاً شاہانِ اسلام کا گویا یہ شیوہ سا ہوگیا تھا کہ اپنے اپنے

دَور میں بطور عطیات شاہانہ کسی ملکی یا مذہبی یا کسی دوسری خدمت کے عوض میں کچھ نہ کچھ جاگیریں مرحمت فرمایا کرتے تھے اِس قسم کی کچھ جایداد مولٰنا کے خاندان میں بھی تھی جو بوجہ سلسلۂ مشائخین بصورت معافی مولٰنا کے والد کی زندگی تک موجود رہی۔ مولوی سعادت علی صاحب کے قبضے میں حصۂ بخرہ ہوتے ہوتے کوئی ساٹھ ستر بگیہ اراضی معافی عطیۂ شاہان دہلی موجود تھی۔ مولوی نصر اللہ[1] خاں صاحب مرحوم ومغفور اور مولٰنا نذیر احمد صاحب کے دادا پیر جی نجابت علی صاحب سے حد درجہ اُلفت تھی۔ مولوی نصر اللہ خاں صاحب اُن دنوں ضلع بجنور ہی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ بڑے مقدّس بزرگ تھے قانون سے مجبور ہوکر پیرجی نجابت علی صاحب کی خاندانی معافی ضبط کرلی۔ مگر جناب پیر جی صاحب سے کہا کہ پیر جی بندوبست قبول کرلو تو میں دو آنے بگیہ جمع لگان باندھ دوں اور کل معافی کا اسی طرح بندوبست کردوں۔ مگر مولٰنا نذیر احمد صاحب کے دادا قواعد وقوانینِ گورنمنٹ سے بالکل ناواقف تھے۔ خان صاحب سے صاف دلی اور بڑی سادگی سے فرمایا "بھئی خاں صاحب ہماری معافی تو بادشاہ کی دی ہوئی ہے۔ اور ہم لندن سے معاف کراکر لائیں گے"۔ آخر ان کے اِس کہنے اور ڈپٹی صاحب کی بات نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل اراضی پر زر مالگزاری قائم ہوگیا

جس خاندان میں کے ہمارے مولٰنا ہیں اُس کے اکثر اراکین میں شائبہ جذب پایا جاتا ہے۔ یہ شاید اُسی کا اثر ہو کہ خاندان میں ایک زمانے تک تعلقِ درویشی اور پیری مریدی کی وجہ سے جذبِ حقانی مسلسل رہا ہے۔ مولٰنا نذیر احمد صاحب کے دادا کا ڈپٹی نصر اللہ خاں صاحب کو یہ جواب دینا کہ "بھئی خاں صاحب ہماری معافی تو بادشاہ کی دی ہوئی ہے اور ہم لندن سے معاف کراکر لائیں گے" اُسی جذب کا اثر تھا۔ مولٰنا نذیر احمد صاحب کے والد کا اپنے سسرے کے انتقال کے بعد جایداد سے دست بردار ہوکر بجنور چلے آنا بھی اُسی جذب کا نتیجہ تھا۔ خود ہمارے مولٰنا نذیر احمد صاحب بھی بااِیں ہمہ علم وتہذیب اِس اثر سے اپنے تئیں بالکل محفوظ نہ رکھ سکے حیدرآباد دکن کی نوکری سے اُن کا مستعفی ہونا کچھ اِسی قسم کی بات نہیں تو اور کیا ہے ÷

غرض مولٰنا سعادت علی صاحب نے اِس زمینداری کے ضمن میں چند سال تک کھنڈسار کے ذریعے سے شکر کی تجارت بھی کی تھی۔ آخر کار اُس سے بھی دل کھٹا ہوگیا اور معلّمی کا عمامہ باندھ کر بعض رؤسا کے لڑکوں کو بسم اللہ کہہ کر پڑھانا شروع کیا۔ معلموں کی تنخواہیں اُن وقتوں میں نقد اور خوراک ملاکر ہوتی تھیں وہی اُن کی ہوگی ÷

بچپن اور عنفوان شباب

نہایت جستجو کے بعد بھی مولٰنا کے بچپن اور شباب کے حالات اس قدر مختصر دستیاب ہوئے کہ گویا اُن کا عدم وجود برابر ہے۔ مولوی سعادت علی صاحب مولٰنا نذیر احمد صاحب کے نانا کے انتقال کے بعد خاص بجنور میں اپنے آبائی مکان میں آکر رہنے لگے۔ اُس وقت مولٰنا کی عمر کوئی چار برس کی ہوگی عسرۃ اور توکل دو ملازم ان کے ماں اور باپ کے ساتھ آئے تھے۔ کوئی چھوچھو۔ انّا۔ یا دودا مولٰنا کے لیے نہیں رکھی گئی۔ وہاں تمام کھلائیوں کا مجموعہ صرف ایک ماں تھیں جنھوں نے اپنی محبت آمیز متبرک گود میں آرام سے سُلایا اور مقدّس ہاتھوں کے جھولے میں چھوٹی چھوٹی پینگوں سے اُن کو جھلایا۔ اور چونکہ ہمارے مولٰنا بچپنے میں گداز جسم بھی تھے تعجب نہیں کہ اُن کی والدہ گیند کی طرح اُچھالا بھی کرتی ہوں ÷

مولٰنا ہونہار اور ہوشیار لڑکوں کی طرح بچپنے میں نہایت چلبلے تھے۔ اُنھوں نے کبھی ایک جگہ بیٹھ کر ایک نشست میں

[1] مولوی نصر اللہ خاں صاحب کا وطن خورجہ ضلع بلند شہر تھا۔ بجنور اور مظفر نگر وغیرہ میں ڈپٹی کلکٹر رہے تھے اور آخر کار سرکار نظام میں صدر تعلقہ دار یعنی صوبہ ہوگئے تھے۔ جن سے تاریخ دکن یادگار ہے ۱۲

پُوری حجامت نہیں بنوائی - آدھی بنوائی اور بھاگے - دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہو کر آتے تھے تو وہ آدھی پوری ہوتی تھی اور اسی وجہ سے جابجا چوٹیں ہی لگا لیا کرتے تھے جس کے نشان اب تک موجود ہیں - بے وضو نماز کا پڑھنا گویا ایک معمولی بات تھی - اکثر ایسا ہوا ہو گا کہ سحری اور افطار کے لالچ میں روزے رکھے ہوں گے اور کچھ عجب نہیں کہ پوشیدہ طور پر توڑے بھی ہوں -

ایک لکچر میں مولنا علی گڑھ کالج اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے ہوئے عام مسلمانوں کے لغو شکوک یا بہانے بیان فرما رہے تھے وہاں یہ بھی فرمایا تھا کہ

"اگر فی الواقع علی گڑھ کالج میں پڑھنے سے مذہب میں فرق آتا ہے تو نفس انگریزی کی وجہ سے آتا ہو گا ورنہ یوں تو وہاں نماز کی بھی تاکید ہے - لڑکوں سے رمضان کے روزے بھی رکھوائے جاتے ہیں - اب یہ شیطانی لشکر نماز کو بے وضو پڑھتا ہو یا سحری اور افطاری کے لالچ سے روزے دار بنتے اور وضو کرتے میں کلیاں پی جاتے ہوں - تو سید احمد خاں اس کو کیا کریں - اور کیوں کر یقین ہو کہ گھروں میں لڑکے ایسا پاجی پن نہیں کرتے - چھوٹی عمر میں میں نے آپ کیا ہے "

غرض اسی قسم کی طفلانہ خوش آیند حرکتیں مولنا رات دن کیا کرتے تھے اُن طفلانہ حرکتوں کی اگر فہرست کہیں مل جاتی تو اُن کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا - برخلاف اِن کے مولوی علی احمد صاحب بچپن ہی سے سلیم المزاج تھے - باپ کے ڈر سے نماز پڑھتے تھے مگر گنڈے دار اور روزے بھی رکھتے تھے مگر غیر مسلسل -

عنفوانِ شباب کے نامناسب جلسوں سے مولنا بالکل علٰحدہ رہے - کبھی رنگین صحبتوں کا لطف اُٹھایا نہ راگ رنگ کے جلسوں کو گرمایا - کبھی گلستاں کے سبق سے عشق وجوانی کے بوستان میں گل چینی کی نہ دوستوں کی صحبتوں میں مینا بازار کے کوچوں کی خاک چھانی - نو برس کی عمر تک پدر بزرگوار نے بیٹے کی لوحِ دل پر اخلاقِ محسنی کے پھول بوٹوں کی بیل چڑھائی - مولوی نصر اللہ خاں صاحب کی فیضِ صحبت نے ان پھولوں میں خوشبو پیدا کی کہ دماغ معطر ہو کر رہ گیا - دہلی پہنچے تو مسجد کی گداگری اور بعض اُستادوں کی نامہربانی نے اِن پھولوں کو مُرجھانا شروع کر دیا کہ دہلی کالج میں داخل ہوئے - وہاں کی آبیاری نے وہ کام دیا کہ ہمارے مولنا کے خیالات کا چمن سدا بہار ہو گیا - کالج کی تعلیم ختم ہوتے ہی نوکری کی سوجھی +

یہ سب کچھ سہی لیکن ہمارے مولنا زاہدِ خشک بھی نہیں ہیں اُن کے پہلو میں دل ہے اور دل میں مفہوم حُسن سمجھنے کا کافی مادّہ موجود ہے - حسنِ صورت کے متعلق مولنا کے مفصّل حالات اگر دیکھنے منظور ہوں تو مُبتلا اور عارف کا مباحثہ حسنِ صورت "پُرفسانۂ مبتلا" میں ملاحظہ فرمایئے "اُمہات الامۃ" کو دیکھیے "رویائے صادقہ" کا مطالعہ کیجیے اور "الحقوق والفرائض" حصۂ سوم پڑھیے - ہم اِس بارے میں مولنا کی رائے اگر لکھیں گے تو اُس حصے میں لکھیں گے جہاں ان کے عام حالات اور طبعی خصائل وعادات کا تذکرہ ہے +

تعلیم | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولنا نذیر احمد صاحب کی تاریخ زندگی میں صرف اُن کی تعلیم کا حصّہ بڑا ہی دلچسپ واقع ہوا ہے جو عجیب و غریب واقعات سے لبریز ہے - اِس حیثیت سے نہیں کہ اُنھوں نے کتابوں کی جگہ کوئی طلسم توڑا تھا - یا ہفت خوان طے کیے تھے بلکہ اس اعتبار سے کہ اُنھوں نے اساتذہ مستعد سے بالغ استعداد اور پوری قوتِ مطالعہ کے ساتھ طالب العلمانہ

طور پر بڑے بحث مباحثے سے کتابیں تمام کی تھیں جس کے بہت سے معرکۃ الآرا مسائل و مباحث اگر ہمیں مل جاتے تو ضرور قابلِ نقل تھے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے مولانا کی سوانح عمری میں یہ حصہ معرکۃ الآرا ہی۔ مگر ہم تو یہی کہیں گے۔

اے شیخ چہ جوئی ز شبِ قدر نشانی ہر شب شبِ قدر ست اگر قدر بدانی

مولانا کی زندگی کا ہر حصہ دلچسپ ہی ہر واقعے میں ایک لطف ہی اور ہر لطف میں عجیب قسم کی روحانی لذت ہی جس سے سیری نہیں ہوتی۔ بہرحال مولانا نے انگریزی اُنیسویں صدی کے وسط میں اپنے پدر بزرگوار مولوی سعادت علی صاحب سے پُرانے قاعدے کے بموجب غالبًا کیا یقینًا قاعدہ بغدادی پڑھا ہوگا۔ جب مولانا کو حرف ملانے آ گئے تو مقدس رحل پر اُن کے سامنے قرآن مجید کھولا گیا۔ قرآن مجید بھی باپ نے پڑھایا۔ مگر اُسی پُرانے طریقے پر طوطے کی طرح بے فہم مطلب و معانی۔ ابتدا میں ہمارے مولانا اس طرح سے قرآن کے پڑھنے کو بے سود جانتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے ابتدا میں اپنے بچوں کو طوطے کی طرح قرآن مجید نہیں پڑھایا۔ شاید ہمارے مولانا حیدرآباد میں تھے وہاں سے اپنے بیٹے کو ایک خط لکھا ہی اُس میں تحریر فرماتے ہیں

"آج ایک تقریب سے تمھارے بچپن کی دو باتیں یاد آ کر دل کو بڑی ہی خوشی ہوئی اور تاکہ تم کو بھی خوشی ہو یاد دلاتا ہوں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میری عادت تھی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [1] بر می آید ز من احصائے نعمتہائے تو بشکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن تم نے پوچھا کہ ابا کھانے کے بعد یہ کیا پڑھا کرتے ہو۔ میں نے کہا خدا نے روزی دی اُس کا شکر کرتا ہوں۔ تم نے کہا مجکو بھی سکھا دو۔ میں نے کہا تم عربی فارسی زبانیں نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے میں نے تم کو جیسا کہ دستور ہی پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا کہ تم اُس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا دُہرانا بے فائدہ اور لاحاصل ہی تم اپنی بولی میں ادائے شکر کر لیا کرو۔ تم کچھ ملول ہوئے تو میں نے تھوڑی دیر تامل کر کے یہ شعر موزوں کر دیا۔

یہ رزقِ طیب بلا مشقت۔ خدا کی قدرت کا دیکھو جلوا گناہ گاروں کو منّ و سلویٰ کیا عنایت گدھوں کو حلوا

چوں کہ کَی اچھی تھی تم نے بہت پسند کیا اور چند بار دُہرانے سے یاد ہو گیا۔ مگر بجائے "گدھوں کو حلوا" کے "گدھوں کا حلوا" تمھاری زبان پر چڑھ گیا۔ تم دونوں وقت کھانے کے بعد بالالتزام یہ شعر پڑھتے اور ہم سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے۔ مدتوں بعد تم کو غلطی پر تنبہ ہوا ہنسی تو گئی گزری ہوئی نری شکرگزاری رہ گئی"

لیکن اب مولانا کی رائے بالکل بدل گئی ہی اور اب وہ قرآن مجید کو لڑکپن میں طوطوں کی طرح پڑھنے کو مسلمان بچوں کے حق میں چند حیثیت سے مفید اور فالِ نیک سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"...... تاہم طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمانوں کے بچوں کے لیئے ضرور ہی کیوں کہ اُردو میں عربی کے الفاظ اِس کثرت سے رواج پا گئے ہیں کہ جس کو عربی نہیں آتی وہ درستی کے ساتھ الفاظِ عربی کو ادا نہیں

[1] خدا کا شکر ہی جس نے ہم کو کھانا کھلایا۔ اور پانی پلایا۔ اور ہم کو مسلمان پیدا کیا۔ اور ہماری آخری بات یہ ہی کہ سب طرح کی تعریفیں خدا ہی کو زیبا ہیں۔ جو سارے جہان کا پالنے والا ہی"

کرسکتا۔ بڑے ہوکر خدا جانے اعصابِ دہن میں کچھ اس طرح کی خشونت آجاتی ہے کہ زبان جن حروف کے ادا کرنے کی ابتدا سے خوگر نہیں ہوئی پھر وہ اُس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہوتے........" مسلمانوں کے بچے خدا رسول اور مذہبی باتوں سے کسی قدر آگہی حاصل کرتے ہیں اگر یہ بے سود ہو تو مولود کے کان میں اذان کا دینا اِس سے زیادہ بے سود اور فعلِ عبث ہے مگر خدا تو آوازوں کو نہیں نیتوں کو دیکھتا ہے...... ما بروں را ننگریم وقال را٭ ما دروں را بنگریم وحال را٭ قرآن سے بچوں کی تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مماثلتِ خطی کے سہارے قرآن کا اُردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہوجاتے ہیں۔ یک کرشمہ دو کار٭
سب سے بڑا فائدہ جو بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہمِ مطلب قرآن شریف پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ چاہے کوئی اس کو حسنِ عقیدت سمجھے یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مؤدّب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ وہ قرآن شریف پڑھنے کے لیئے مؤدب بٹھائے جاتے ہیں اور ادب رفتہ رفتہ داخلِ عادت ہوجاتا ہے"
"اپنے خیالات تو بچپن میں قرآن پڑھانے کی نسبت یہ ہیں مگر ہم میں سے جو لوگ تمام پُرانی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ایسے بہت ہیں اور افسوس بہت ہوتے جاتے ہیں اُنھوں نے تو یہ جدید شیوہ اختیار کیا ہے کہ بچے میں حروف شناسی کا مادّہ پیدا ہوا اور اُنھوں نے اُس کو اُردو کی پہلی اور دوسری کے سلسلے میں جا لگایا اور بقیۃ العمر اُن کو قرآن مجید پڑھنا نصیب نہیں ہوتا٭
"تعلیم کے پُرانے طریقے کی رُو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیئے یاد کرلیا کرتے تھے ہائے اب یہ حال ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقے سے تعلیم پارہے ہیں مُرُوْا صِبْیَانَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْھُمْ اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا[1] سے متجاوز ہوجاتے ہیں اور اُن کو الحمد تک پُوری نہیں آتی درود اور التحیات کی کون کہے اور آئے کہاں سے بیچاروں کو اس رستے پر ڈالا ہی نہیں گیا۔٭
بہرکیف ہمارے مولٰینا کی ابتدا میں وہ رائے تھی اور اب یہ رائے ہے۔ بعض لوگ جو گوشِ شنوا نہیں رکھتے اور جن کی آنکھیں سرسری نگاہیں رکھتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ مولٰنا کی اصلی رائے تو وہی ہے جس کو اُنھوں نے اپنے صاحبزادے کے خط میں ظاہر کیا ہے اور یہ دوسری رائے کوئی رائے نہیں ہے بل کہ ترجمۃ القرآن کا ایک اشتہار ہے جو اس پیرائے میں دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ لوگوں کی ایک بڑی غلطی ہے اور ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا کے برخلاف غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں رائیں اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور درست ہیں پہلی رائے اس لیئے ٹھیک ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اور مقصود بالذات مجموعی کام انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کو درست کرنا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ انسان ترقی پاکر دنیوی اور اُخروی اعلیٰ سے اعلیٰ درجات حاصل کرے اور تقربِ ذاتِ مقدسِ الٰہی۔ اور حیاتِ ابدی اور عالمِ محسوس وغیر محسوس کی غیر محدود سعادت کا تاج اپنے سر پر رکھے اور وہ اپنی ظاہری اور سوشل اور تمدّنی حالت کی عظمت وشوکت کے نقارے بجائے۔ اور عزت وعروج اور حسنِ معاشرت کی نیکیوں کو بدرجۂ اتم حاصل کرکے اشرف المخلوقات

---

[1] تمھارے بچے سات برس کے ہوں تو نماز کا حکم دو اور دس برس کے ہوجائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مارو ۱۲۔

کے لقب سے سرفراز ہو +

پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی غرض و غایت ہی لوگوں کے معتقدات اور اخلاق اور معاملات کی اصلاح اور جہاں کہیں اس میں واقعاتِ گزشتہ کا بیان ہی وہ بھی اسی غرض سے ہی کہ لوگ دوسروں کے حالات سُن کر متنبّہ ہوں اور عبرت پکڑیں اور اپنا چال چلن درست کریں

اگر فی الواقع قرآنِ مجید کے وُرُود کا یہی منشا ہی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی منشا ہی تو ہمارے مولٰنا کی پہلی رائے بالکل صحیح ہی کیوں کہ قرآن کو بے سمجھے بوجھے پڑھنا بالکل طوطے کی طرح کا پڑھنا ہی۔ طوطے کو پڑھایا جاتا ہی "نبی جی بھیجو" "حق اللہ پاک ذات اللہ صحیح تو خدا اور خدا کا رسول + تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول" مگر ان فقروں کا مطلب طوطا کچھ نہیں سمجھتا۔ سچ کہا ہی ؎ کچھ نہ سمجھا سوائے ٹیں ٹیں کے۔ ؎ آدمیت اور شئے ہی علم ہی کچھ اور چیز + لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا + جب طوطے کی طرح لڑکے بھی قرآن مجید کے معنی نہیں سمجھتے تو اُس کے اوامر و نواہی کا اثر اُن کے دل پر کیا ہونا ہو گا لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ فرض کیجیے ایک عرب نژاد ہندوستان کے کسی جنگل میں پیاسا تڑپ رہا ہو اور دُور دُور تک اُس جنگل میں کہیں پانی کا پتہ نہ ہو۔ اتنے میں کوئی جاہل دیہاتی اُس طرف سے گزرے اور اُس کے پاس کسی ظرف میں ٹھنڈا پانی ہو وہ عربی دیکھ کر ماءٌ ماءٌ یا مَی یا مَی پکارے تو وہ دیہاتی گنوار ان الفاظ کو کیا سمجھ سکتا ہی اور کیا تشنۂ عرب کو پانی پلا سکتا ہی۔ ہمارے نزدیک بعینہ یہی حال ہی قرآن مجید کو بے فہم مطلب پڑھانے کا۔

میرے ایک دوست بڑے تند مزاج پٹھان اور معمولی پڑھے لکھے تھے تلاوتِ قرآن مجید کا اُن کو بہت شوق تھا میں نے اُن سے ایک دن کہا کہ خاں صاحب آپ اگر ترجمے کے ساتھ قرآن مجید پڑھا کریں تو آپ کو بہت فائدہ ہو خالی لفظوں کے پڑھنے سے قرآن مجید کی غرض و غایت ہرگز پوری نہیں ہوتی جس کے لیے وہ نازل ہوا ہی کیوں کہ آپ اُس کے معنی نہیں سمجھتے اور جب معنی نہیں سمجھتے تو پڑھنا لاحاصل۔ خاں صاحب نے مارے غصے کے قرآن مجید کو تو کر دیا بند اور لگے مجھ سے کٹ حجتی کرنے۔ آخر یہ ارشاد کیا کہ میں تو ثواب کی غرض سے پڑھتا ہوں۔ میں نے کہا آپ بہت اچھا کرتے ہیں لیکن اگر آپ ترجمہ بھی ساتھ ساتھ پڑھتے رہیں تو آپ کو دوگنا ثواب ہو گا۔ بین السطور ترجمہ موجود ہی اور وہ بھی اَور کسی کا نہیں شاہ عبدالقادر صاحب کا یہ کہہ کر میں نے اُن سے اپنا پیچھا چھڑایا اور اپنی جگہ پر سوچنے لگا کہ حقیقت میں بے فہم مطلب قرآن مجید پڑھنے سے کوئی فائدہ یا ثواب ہو سکتا ہی یا نہیں۔ میں نے عرصۂ دراز تک باوجودے کہ بہت کچھ غور و خوض کیا لیکن اس وقت تک تو حصولِ ثواب کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔ قرآن مجید کے پڑھنے سے ثواب حاصل ہونا اور نہ پڑھنے سے محروم رہنا مسلّم لیکن ثواب کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہیں کہ کسی نے بے فہم مطلب ایک پارہ پڑھ لیا اور اُس پر گٹھری بندھا بندھایا ثواب آسمان سے اُتر پڑا میرے نزدیک ثواب عذاب کا مطلب یہ ہی کہ قرآن کے اوامر و نواہی کو ہم سمجھیں اور اُن پر عمل کریں اِن اعمال سے جو کچھ فائدہ ہم کو ہو گا یہی ثواب ہی اور قرآن مجید کے احکام کے خلاف جو عمل ہم سے سرزد ہوں گے اور اُن سے جو کچھ نقصان ہم کو پہنچے گا وہی ہمارے لیے انجامِ کار عذابِ الٰہی ہو گا۔ میرے نزدیک تو

۱؎ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔
اور البتہ ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری میں اِن کو (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور (عمدہ) عمدہ چیزیں اُنھیں (کھانے کو) دیں۔ اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہی اُن میں بہتیروں پر اُن کو برتری دی ۱۲ +

۲؎ جو (مُنہ سے لفظوں کے بُڑبُڑا لینے کے سوا کتابِ (الٰہی کے مطلب) کو (کچھ بھی) نہیں سمجھتے وہ فقط خیالی تُکّے چلایا کرتے ہیں ۱۲

عذاب ثواب کے یہ معنی ہیں نہ وہ کہ بے فہمِ مطلب قرآن پڑھ لیا اور آسمان سے ثواب مینہ کی طرح برس پڑا۔

تاہم ہر سمجھ دار اور انجام بیں مسلمان کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلمان بچوں کو اگرچہ قرآن کا پڑھانا طوطوں کو پڑھانا ہے لیکن قرآن مجید پڑھ کر اُن کو نماز کی عادت پڑتی ہے خواہ وہ اس کے معنی سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں اور خواہ وہ نماز کو ابتدا میں بے وضو ہی ٹرخاتے ہوں ہمارے نزدیک وہ شخص بڑا احمق ہے جو نادان کو دانا کے پاس بیٹھنے سے روکے نادان دانا کے پاس بیٹھے گا۔ تو اَلصُّحْبَۃُ تَاثِیْر کی رو سے کچھ نہ کچھ تو دانائی کا حصہ لے ہی نکلے گا ؎ سگ اصحاب کہف روزے چند ٭ پئے نیکاں گرفت مردم شد ٭

ہمارے نزدیک بعض انگریزی تعلیم یافتوں کا یہ خیال باطل غلط اور تجربے کے خلاف ہے کہ جب لڑکا سمجھ دار ہوگا تو وہ خود بخود قرآن پڑھ لے گا افسوس ہم نے سیکڑوں ایسے انگریزی داں طالب علم دیکھے ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی پڑھنا تو درکنار قرآن کو ہاتھ تک نہیں لگایا لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ کی رو سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو چھونے کی عادت نہیں ڈلوائی گئی۔ والدین بیچارے اس اُمید میں بیٹھے تھے کہ بلند اقبال ماشاءاللہ اب صاحب فہم و فراست ہوئے قرآن مجید جو اُن کی دینی اور آسمانی کتاب ہے اس کو ضرور پڑھیں گے اور جیسا کہ سمجھنا چاہیئے سمجھیں گے۔ اُس کے اوامر و نواہی پر کاربند ہوں گے لیکن صد افسوس ہے کہ اس خیال کے برعکس دیکھا جاتا ہے۔ بل کہ ہم اس کو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں اکثر ایسے سعادت مند بھی موجود ہیں جن کے کتب خانے کلام مجید سے خالی ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ خیر اگر ہم نے نہیں دیکھا نہ سہی نئے نوجوان تعلیم یافتہ خود اپنے ایمان سے کہہ دیں کہ کتنے ایسے نئے تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر میں ایکبار بھی قرآن مجید کو شروع سے آخر تک سمجھ کر پڑھا ہے یا صرف پڑھا ہے سچ یہ ہے کہ یہ قصور اولاد کا نہیں۔ قصور ہے ماں باپ کا جنھوں نے بنیاد ہی غلط ڈالی ؎ خشتِ اول چوں نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج ٭ الغرض بے فہمِ مطلب قرآن ختم کرنے کے بعد مولٰنا ایک مکتب میں "وے بر نذیر" بٹھائے گئے ہاتھ میں تختی اور بغل میں وہی خالق باری۔ محمود نامہ۔ کریما۔ مامقیماں دبا کر تشریف لے جاتے تھے۔ اور آگے پیچھے ہل ہل کر ایک خاص لَے میں پڑھتے تھے ؎ مامقیمانِ کوئے دل داریم ٭ رُخ بدنیائے دوں نمی آریم ٭ مکتب کے پڑھنے کی لَے ہندوستان بھر میں ابھی تک رائج ہے اور جب تک آگے پیچھے کو لڑکا ہلے نہیں وہ آ نہیں سکتی اور نہ اُس لَے میں وہ سُر پیدا ہو سکتے ہیں[1] ٭

غرض اس طرح مولٰنا کا قیمتی وقت کچھ عرصے تک مکتب میں ضائع ہوتا رہا۔ پدر بزرگوار نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو مکتب سے اُٹھا لیا اور فارسی کی متداول کتابیں بیٹے کو خود پڑھائیں۔ انھیں کتابوں میں آئینہ بازار ریختہ تھا۔ اور سہ نثر ظہوری بھی شامل تھیں۔ جن کو امام بخش صہبائی کی شرحوں کے ساتھ پڑھاتا تھا۔ فارسی کے ساتھ مولوی سعادت علی صاحب نے عربی بھی شروع کرادی تھی ہمارے مولٰنا نو برس تک برابر اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے جہاں انھوں نے تعلیم سے زیادہ تربیت کے سبق سیکھے یہ پدر بزرگوار ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مولٰنا اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے شریفوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں ٭

باپ کا ارادہ تھا کہ بیٹے کو پُرانی وضع کا دین دار مولوی بنائیں۔ مگر اُن کی اُس وقت کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی تاہم مولٰنا

[1] مولٰنا نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ "انھوں (مسلمانوں) نے یا تو کچھ نہ پڑھا ہوگا یا پڑھا ہوگا تو وہی دیسی مکتب میں اور مقدور ہوا تو گھر پر پُرانے کھوسٹ میاں جی سے محمود نامہ کریما۔ مامقیماں، یا دستور الصبیان آور وہ بھی اُس ناص لَے سے جس کی نقل تیوس کے برس اسی کانفرس کے ہیٹر میں آنریبل سید محمود نے کی تھی۔ ابتدائی تعلیم تو میری بھی اسی طرز پر ہوئی تھی مگر بتو سبا ہے کرو، کہ سید محمود کو تو ایسی یاد رہی کہ نقل کو سن کر اصل کا سماں آنکھوں میں پھر گیا تھا اور مجکو ایسی بھولی کہ نقل کا قصد کرتا ہوں تو اُن سُروں میں ادا نہیں ہوتی"

نذیر احمد صاحب کی طبیعت میں شجرِ علم کی جڑ قائم کردی اور اس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم کردی تھی کہ اگر دوسرے اُستادوں کی مدد نہ بھی پونہچتی تو وہ بغیر سرسبز و شاداب ہوئے رہ نہیں سکتی تھی۔ باپ نے بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ مَنْ جَدَّ وَجَدَ وَمَنْ طَلَبَ غَلَبَ مولوی سعادت علی صاحب مولٰنا سے فرمایا کرتے تھے کہ "بیٹا! علم شرافت و بزرگی کا تمغہ ہے" بیٹا جب اس نصیحت پر عامل ہوا تو اب اُس کے کامل ہونے میں کسی کو کیا شک ہوسکتا ہے۔ بیٹے کی نوبرس کی عمر تھی کہ باپ نے اپنی تعلیم سے علحدہ کر کے مولوی نصر اللہ خاں صاحب کی فیضِ تربیت میں داخل کیا ✤

مولٰنا کے دوسرے اُستاد

مولوی سعادت علی صاحب کے بعد مولٰنا کے دوسرے اُستاد مولوی نصر اللہ خاں صاحب تھے جنھوں نے مولٰنا کی جدّی جائداد ضبط کرلی تھی یہ صاحب اُن دنوں بجنور ہی میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی سعادت علی صاحب مرحوم اور ڈپٹی نصر اللہ خاں صاحب مرحوم سے بجنور ہی میں ملاقات ہوئی۔ مولوی سعادت علی صاحب کبھی کبھی مولوی علی احمد صاحب اور ہمارے مولٰنا کو بھی ڈپٹی صاحب کے پاس سلام کے لیئے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ دونوں بھائی سنِ طفولیت میں پڑھنے لکھنے میں بڑے طاق تھے ڈپٹی صاحب نے دونوں کو ہونہار اور ذہین پایا دل میں خوش ہوئے اور زبان سے تعریف کے ساتھ دعائے علم دی اور التفاتِ خاص فرمانے لگے آخر دونوں کو اپنے حلقۂ درس میں لے لیا ✤

اب ان دونوں بھائیوں کی تعلیم مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے ہونے لگی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب کی بدلی مظفر نگر ہوگئی تو خان صاحب نے مولٰنا کے والد سے فرمایا کہ دونوں بچوں کو میرے ساتھ کردو خان صاحب کو شاگرد بنانے اور مرید کرنے کا بڑا شوق تھا غرض مولٰنا کے والد نے دونوں بھائیوں کو مظفر نگر پونہچا دیا خان صاحب کے ہاں مریدوں اور شاگردوں کا بڑا جمگھٹا لگا رہتا تھا اُن میں یہ دونوں بھائی بھی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی طبعی شوخی اور ذہانت کی وجہ سے خان صاحب بہت خوش ہو ہو کر پڑھاتے تھے اور اکثر لوگوں کے سامنے صرفِ عربی کے سوالات پوچھتے صیغے دریافت کرتے اور جواب پاکر اظہارِ مسرت فرماتے۔ جاڑے کے موسم میں دَورے پر ساتھ لے جاتے اور علم والوں سے صحبت ہوتی تو انھیں دونوں بھائیوں کو پیش کرتے جہاں ڈپٹی صاحب کو شاگرد بنانے اور مرید کرنے کا شوق تھا وہاں یہ بھی تھا کہ اپنی ہی تصنیف کی ہوئی کتابیں پڑھاتے۔ خان صاحب کے ایک نحوی رسالے کا نام قمقام تھا غرض ہمارے مولٰنا نے وہاں پانچ برس کے عرصے میں نحو عربی میں شرح ملّا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی اور فلسفے میں میبذی تک پڑھا ✤

اعظم گڑھ میں فتح خان صاحب مولوی نصر اللہ خاں صاحب کے ماموں تحصیلدار تھے۔ انھیں تحصیلدار صاحب کے ایک پیر و مرشد تھے شاہ عبد العلیم صاحب یہ بزرگ بھی اتفاق سے وہیں اعظم گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ اُنھوں نے مولوی نصر اللہ خاں صاحب کو اپنے پاس بُلایا تو خان صاحب نے ایک ساتھ چھ مہینے کی رخصت لینے کا مصمم قصد کیا اتفاق سے مولوی سعادت علی صاحب مرحوم اپنے صاحب زادوں کو دیکھنے اور خان صاحب سے ملنے مظفر نگر آئے تو خان صاحب نے اُن سے فرمایا کہ "اب اپنے بچوں کو دلّی لے جاکر پڑھواؤ۔ اول تو میں اب عدیم الفرصت ہوں اور دوسرے اِن کے پڑھانے کے لیئے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور مجھ کو اتنی فرصت نہیں" آخر کار مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں صاحب زادوں کو دلّی لے کر پونہچے اور دونوں کو اپنے ایک اُستاد کے حوالے کیا ✤

سلسلۂ جس نے کہ مصنف ... کی ... کامیاب ہوا اور جس نے جستجو کی غالب آیا ۱۲

مولٰنا نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا چال چلن اگر باپ کے ہاں وثیقہ تھا تو ڈپٹی صاحب کے ہاں اس کی رجسٹری ہوئی" اس میں کچھ شک نہیں کہ جس شخص میں جاہ و حشمت حکومت و وجاہت۔ علم و فضل و سیر چشمی۔ علم و تواضع۔ شریعت و طریقت اتنے اوصاف جمع ہوں تو ایسے شخص کے ہاں مولٰنا نذیر احمد صاحب کے چال چلن کے وثیقے پر کیوں کر رجسٹری نہ ہوتی۔ ❊

تیسرے اُستاد

ادھر مولوی نصراللہ خاں صاحب مشورہ دے کر اعظم گڑھ روانہ ہوئے اُدھر مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں لڑکوں کو دلّی لے پہنچے مولوی سعادت علی صاحب کو وہاں ایک بزرگ مولوی عبدالخالق[51] صاحب سے تلمذ تھا ان بزرگ کی خدمت میں اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم کی غرض سے پیش کیا مولوی عبدالخالق صاحب نے اِن کو پنجابی کٹرے[52] کی وسیع مسجد میں رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اگلے زمانے میں طالبِ علمی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا اور کثرت سے یہی تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں جہاں علم و فضل کے دریا بہتے تھے وہاں باہر کے لوگ دُور دُور سے طالبِ علمی کے لیئے بکثرت جمع ہوتے تھے اُن کی گزر اوقات کی حالت نہایت خراب تھی یہاں تک کہ کتاب بھی مشکل سے مانگے ملتی تھی۔ دس دس بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک سبق میں شریک ہوتے تھے سب کے سب سامع اور اُن میں سب سے زیادہ خوش نصیب قاری یہ بات مطبعوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے تھی۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ

"[53] لِکُلِّ شَیءٍ اٰفَۃٌ وَّلِلْعِلْمِ اٰفَاتٌ کسی کا مقولہ ہے جس کو بچپن میں سُنا کرتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ علم کا حاصل ہونا بہت سی شرطوں پر موقوف ہے۔ سات سُہاگنیں ہوں تو لاڈو کا اُبٹنا پسے یعنی یہ کہ شاگرد کو شوق ہو جی لگا کر پڑھے۔ اُستاد شفیق ہو دل سوزی سے شاگرد کو بتائے سمجھائے۔ دونوں کو ایک وقت مدت تک فراغ خاطر ہو کہ پڑھنے پڑھانے میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو۔ جو کتاب درکار ہو فی الوقت بہم پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنی شرائط کا جمع ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔ بہر کیف ہم تو لِلْعِلْمِ اٰفَاتٌ کے یہی محامل سمجھا کرتے تھے اور یہی محامل تھے بھی"

بہر حال جس مسجد میں مولٰنا نذیر احمد صاحب متعلمی کے لیئے اُترے تھے یہ اورنگ آبادی مسجد کے نام سے مشہور تھی جس میں سَو سَو سَو طالب علم ہندوستان کے مختلف اطراف سے آکر جمع ہوئے تھے انھیں میں سے بعض ائمۃ المساجد بن جاتے تھے اور بعض میاں جی گری اختیار کر لیتے تھے یہ پیشے مستقل طور پر اختیار نہیں کیئے جاتے تھے بل کہ دفع الوقتی اور متعلمانہ زندگی تک محدود ہوتے تھے غرض پنجابی کٹرے کی مسجد کے طالبِ علموں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس محلے کے ہر ایک گھر سے روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتا اور پیٹ بھرا کرتا۔ بعض اس قسم کے طالبِ علم جو اب اپنے علم اور خدا کے فضل سے برسرِ عروج ہیں ممکن ہے کہ آج وہ اپنی گداگری کو بھول گئے ہوں یا اس قسم کے طالب علموں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہوں لیکن ہمارے مولٰنا نے باایں ہمہ ثروت و عزت و علم و فضل دربار دہلی کی کانفرنس میں پکار کر کہہ دیا "اکثر طالب علم باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے۔ اور

---

[51] مولوی عبدالخالق صاحب ایک پنجابی بزرگ تھے آخر عمر میں دمے کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے حلقۂ درس و تدریس سے پہلو تہی کر کے اور مجالسِ وعظ و نصیحت کو خدا حافظ کہہ کر مسجد نشین ہو گئے تھے مگر مطالعہ کتب کا حد سے زیادہ شغف تھا اور روز و شب کتب بینی میں مصروف رہتے تھے اِسی وجہ سے اِن کے پاس مختلف علوم کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ انتقال کے بعد یہ سب کتابیں اُن کے وَرَثہ میں تقسیم ہوئیں جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں۔ ۱۲

[52] سنہ ۱۸۴۲ء و ۴۳ء میں جب کا یہ مذکور ہے پنجابی سوداگر اس میں آباد تھے اب تو یہ محلے کا محلہ ریل میں آگیا ۱۲

[53] ہر ایک شَے کے لیئے ایک آفت ہے اور علم کے لیئے بہت سی آفتیں ہیں۔ ۱۲

آپس میں بانٹ کھاتے اور انھیں میں ایک میں بھی تھا"

دوسری جگہ فخراً بیان کیا ہے "یہ لوگ اکثر مسجدوں میں رہتے اور صدقات پر گزران کرتے کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اس کو فخراً بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اسی طرح بسر ہوا ہے"

مولٰنا نے اِس زمانۂ طالبِ علمی میں ایسی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں کہ طلب صادق ہی اُس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ چناں چہ سردی کے دن اور دلّی کی کڑاکے کی سردی اور مسجد کے صحن میں پتھروں کی سلیں بچھی ہوئی اُس پر دونوں کہنیاں ٹیک کر جو مطالعہ کرتے تھے تو سردی کی شدت اور سخت فرش ہونے سے کہنیوں میں گہرے گہرے زخم پڑ گئے تھے جن کے نشان اب تک موجود ہیں۔

زمانۂ طالب علمی کا مذہب غرض مولٰنا نذیر احمد صاحب اورنگ آبادی مسجد میں رہ کر مولوی عبد الخالق صاحب پیش امام شاہی متولی مسجد کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ طالبِ علموں کی خوش قسمتی سے جن مولویوں کے خاندان کی تولیت میں یہ مسجد تھی اُن میں اختلافِ عقائد کی وجہ سے وہابی اور بدعتی دو گروہ تھے ایک دوسرے کے دشمن اور دونوں کے سرگروہ مولوی عبد الخالق صاحب (جو بعد کو ہمارے مولٰنا کے دَدِیا خسر ہوئے) اور مولوی حاجی قاسم صاحب تھے جو مولوی عبد الخالق صاحب کے عم زاد بھائی تھے۔ اِن دونوں نے طالبِ علموں کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ مولوی عبد الخالق صاحب اور مولوی حاجی قاسم صاحب میں اختلافِ عقائد بھی تھا اور انھیں میں ایک مولوی صاحب وہابی کہلاتے تھے اور دوسرے حاجی صاحب بدعتی۔ ہمارے مولٰنا اور اُن کے بھائی مولوی عبد الخالق صاحب کے گروہ میں تھے اِس وجہ سے نہیں کہ یہ دونوں بھائی بھی وہابی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ مولوی سعادت علی صاحب مرحوم مولوی اسمٰعیل صاحب شہید سرگروہِ طائفہ وہابیہ کے معتقدین میں تھے اور اُن کو اُن سے تلمّذ بھی تھا۔ بہر حال مولوی عبد الخالق صاحب اور مولوی حاجی قاسم صاحب کی تولیت میں یہ مسجد تھی دونوں متولیوں کے طالبِ علم اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے تھے۔ بعض کہیں لڑکے پڑھاتے تھے کوئی کسی مسجد کی امامت کراتے تھے۔ اِن طالبِ علموں کی غالب معاش گداگری تھی۔ کہ دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے اُن کی روٹی مقرر تھی۔ الغرض مسجد کے طالب علم بھی ان دو گروہوں میں منقسم تھے اور ہر ایک اپنی مخالف پارٹی پر زباں درازیاں کرکے دوزخ شکم میں خوب گرما گرم کھانے بھرا کرتا تھا۔ لیکن ہمارے مولٰنا نے صلحِ کل پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ نہ ادھر نہ اُدھر بلکہ دونوں طرف یعنی جدھر کچھ ملتا دیکھا اُدھر ہی کے ہو رہے۔ اس لیے جناب مولٰنا کا مذہب اِس زمانے میں مذہبِ رکابیہ تھا۔ جیسا کہ اکثر طالبِ علموں کا ہوا کرتا ہے ❖

نا مہربانِ اُستاد مولٰنا نذیر احمد صاحب جب مولوی عبد الخالق صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے تو ابتدا میں تھوڑی بہت اچھی تعلیم ہوا کی لیکن بہت دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ اُستاد نے تعلیم و تدریس کی جگہ اپنے خانگی کام لینے شروع کر دیے۔ اِن کاموں کی فہرست اگر دست یاب ہوتی تو ضرور دل چسپ ہوتی۔ نگر مشتے نمونہ از خروارے ایک کام یہ بھی تھا کہ مولوی عبد القادر صاحب[1]

[1] مولوی عبد القادر صاحب کے حالات بہت دل چسپ ہیں یہ بادشاہ کی بہو مرزا فخر الملک ولی عہد کی بیٹی محمدی بیگم کے اُستاد تھے اور مسجد اورنگ آبادی کے امام بھی تھے قلعۂ اور دربارِ شاہی میں باریاب تھے۔ مولوی ذی علم اور صاحبِ اقبال تھے۔ حاجی۔ حافظ۔ اور حکیم تھے۔ گو باقاعدہ مطب نہیں کرتے تھے لیکن فنِ طب میں عبور کامل تھا۔ اور خاص خاص معرکۃ الآرا علاج کیا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے مگر بطور ذریعۂ معاش نہیں نہ بالعموم بلکہ بطور خاص اپنی جان پہچان میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض عملیات مولوی صاحب کے اب تک مشہور ہیں ہمیشہ عاشورے کو وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ محمدی بیگم صاحبہ کی زندگی تک ان کو خاندانِ شاہی سے (بقیہ آئندہ)

مولوی عبدالخالق صاحب کے بیٹے تھے۔ خدا نے ان کو ایک بیٹی دی تھی جو اُس وقت پانچ برس کی تھی۔ ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب اِس لڑکی کو لاوڑے لاوڑے پھرا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ مسجد میں جو طالبِ علم کم سن تھے وہ مولویوں کے گھروں میں کام کاج بھی کیا کرتے تھے جیسے بازار کا سودا سلف لا دینا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیئے لیئے پھرنا وغیرہ وغیرہ ہمارے مولانا اور مولوی علی احمد صاحب دونوں چوں کہ کم سن تھے اِس لیے بلا تکلف مولویوں کے زنان خانوں میں آتے جاتے تھے۔ مولویوں کو اپنے طالب علموں کے پڑھنے لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا اور اکثر طالبِ علم بھی اسی قسم کے تھے اِلّا ما شاء اللہ کہ وہ صرف روٹیوں کے لیئے مسجد میں پڑے رہتے تھے غرض ہمارے مولانا کی کم عمری پر خیال کرنا چاہیئے اور ان مولویوں کی بے اعتنائی پر کہ جو کام ایک ماما کا تھا وہ ان سے لیا جاتا تھا ہمارے مولانا اُس وقت کی تضییع اوقات کی بہت شکایت کرتے ہیں اور باوجودے کہ اتنا عرصہ گزر گیا اب بھی وہ خفا نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خفگی اسپیچوں اور لکچروں میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے چناں چہ فرماتے ہیں۔

”مجکو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو خیر ایک بات ہے۔ شکایت تو اِس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ وہ اِس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور اُن سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا معاوضہ اُس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں پس مسجد اُن کے لیئے بھٹیاری کی سرائے تھی اور اُس کا کرایہ مولویوں اور مولٹوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے مَیں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ مَیں پنجابی کٹرے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں بدترین وقت تھا اور اگر اُس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہو تو مَیں دنیا اور دین

(بقیہ صفحہ ۱۷) پنشن ملتی رہی گورنمنٹ انگریزی سے بہ معاوضہ مسجد اور نگ آبادی ان کو معقول معاوضہ بطور انعام مل چکا تھا۔ ایامِ غدر میں لیسن کی میم کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں اعلیٰ درجے کے خیر خواہ گورنمنٹ خیال کیئے جاتے تھے اور سرکاری دربار میں حاضر باش رہتے تھے۔ دہلی کے اعلیٰ رؤسا میں آپ کا شمار کیا جاتا تھا۔ آدمی بڑے ذی وجاہت تھے تمام شہر ان کو مانتا تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے تاہم سارا کاروبار شادی بیاہ کا یہی سرانجام کرتے تھے کیوں کہ ان کو اس کام میں خاص قسم کا سلیقہ تھا۔ تیس برس ہوئے کہ انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت ان کی زبان پر کلمہ جاری تھا۔ مولوی صاحب رمضان شریف میں بالالتزام تراویح سُنایا کرتے تھے۔ قرآن مجید خوب یاد تھا اور خوش الحان بھی تھے۔ اِن کے حقیقی چھوٹے بھائی مولوی حاجی حافظ عبدالرب صاحب نے وعظ گوئی میں بڑا ملکہ حاصل کیا تھا۔ تمام ہندوستان میں اِن کے وعظ کی دُھوم تھی۔ اِنھوں نے سہارنپور میں چندے سے ایک بہت بڑی شان دار مسجد جامع دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر بنوائی ہے۔ یہ صاحب بھی پندرہ سولہ سال ہوئے کہ رخصت ہوئے دونوں بھائی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ کی درگاہ میں مدفون ہیں۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی آل اولاد کا بڑا کنبہ ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب انھیں کے صاحب زادے ہیں جو ڈپٹی کلکٹری کے درجے سے پنشن لے کر اب دہلی کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اِن کے بڑے بھائی مولوی حافظ عبدالواحد صاحب کے بڑے لڑکے حیدرآباد میں مددگار مہتمم بندوبست تھے انھوں نے وہیں انتقال کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی تین لڑکیاں تھیں۔ ایک مولانا کی حرم محترم جنھوں نے ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔ دو لڑکیاں اب بھی زندہ ہیں منجھلی صاحب زادی مولوی احمد حسین صاحب تحصیلدار اسپشنر کی زوجہ ہیں۔ اور چھوٹی صاحب زادی حافظ بھی ہیں۔ قاری بھی حاجی بھی۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں لاولد ہیں اس لیئے اُنھوں نے اپنا آخرت کا رستہ درست کیا گھر میں لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی ہیں جمعہ کے وعظ کہتی ہیں۔ رمضان شریف میں محراب بھی سناتی ہیں۔ +

مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کی حالت اِس کے خلاف تھی۔ اِن کی ایک لڑکی تھی وہ شادی ہوتے ہی جوان مر گئی۔ پھر ایک لڑکا ہوا محمد ادریس وہ باپ کے قدم بقدم تھا۔ اور شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا نواسہ داماد تھا۔ مگر وہ بیچارہ جوان ہیضہ میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مولوی صاحب کی ایک بیوی حکیم شرف الدین خاں صاحب کی بہن زندہ تھیں وہ بھی سال گزشتہ میں گزر گئیں۔ اور اس طرح مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کا ایک متنفس باقی نہیں۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ۱۲ +

دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا عَلیٰ شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ۔

تضییعِ اوقات پر ہمارے مولٰنا جس قدر بھی ناراض ہوں بجا ہے۔ لیکن لڑکی کا لادے لادے پھرنا کچھ مولویوں اور مولویوں پر احسان کرنا نہ تھا بلکہ ایک طور سے وہ اپنی ہی خدمت تھی۔ مَیں دبے الفاظ میں کیوں کہوں مجھے صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمارے مولٰنا بظاہر تو مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحب زادی کو لادے لادے پھرتے تھے مگر بباطن یہ خدمت اپنی اہلیہ کی خدمت تھی کہ بڑے ہونے کے بعد اسی لڑکی سے ہمارے مولٰنا کا عقد ہوا +

دہلی کالج میں داخل ہونا

جب زمانۂ تعلیم یوں برباد ہونے لگا تو مولٰنا نذیر احمد صاحب ایک عجیب حسن اتفاق سے دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ پنجابی کٹڑے کے طالب علموں کو جمعے کے جمعے چُھٹی بھی دی جاتی تھی اس طرح پر کہ صبح سویرے سعادت خاں کی نہر سے گیلی مٹی لائیں اور اُس سے نمازیوں کے استنجے کے ڈھیلے بنائیں اور صحن مسجد میں پھیلا دیں آخر میں ایک رپورٹ مولوی صاحب سے کی جاتی تھی کہ اتنے ڈھیلے بنائے۔ اِس کے صلے میں مولوی صاحب خمیری روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے یا بہت خوش ہوئے تو شیرمالوں اور باقرخانیوں کے سوکھے ٹکڑے انعام میں دیتے تھے ایک جمعے کو ایسا اتفاق ہوا کہ ڈھیلے بنانے سے چُھٹی ملی تو ہمارے مولٰنا نماز جمعہ کے لیے نہیں بلکہ شہر میں خدائی خوار گشت لگانے کے لیے پنجابی کٹڑے سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکوں کی ٹولیاں وردی کی طرح عمامے باندھے ہوئے چلی جا رہی ہیں دہلی میں ایک کالج تھا جہاں سالانہ امتحان کے بعد انعام تقسیم ہوا کرتا تھا اور اسی جلسہ میں طلبہ کے وظائف گھٹائے بڑھائے جاتے تھے اس کی شہرت وقتِ تقسیم انعام سارے شہر میں ہوئی اور خصوصیت کے ساتھ گوہ طلبہ میں غرض ہمارے مولٰنا بھی بطور تماشائی کے ایک ٹولی میں جا ملے وہاں جا کر دیکھا کہ امیروں کی سواریاں کھڑی ہیں کالج کے بڑے ہال میں اساتذہ اور طالب علم جمع ہیں انگریز ہیں شہر کے امرا ہیں۔ ہال کے دروازے پر آدمیوں کا ٹھٹ لگا ہوا ہے۔ لوگوں کی ٹانگوں میں گُھستے گُھستے مولٰنا بھی ہال کے دروازے پر پہنچے اتنے میں پرنسپل صاحب کسی ضرورت سے ہال کے باہر آئے چپراسیوں نے تماشائیوں کو دھکّے دیئے۔ برامدے میں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ سنگ آمد وسخت آمد کے طور پر لوگوں کے ریلے میں مولٰنا کا پاؤں پھسلا تو مولٰنا چاروں شانے چت فرش پر گرے اور کھٹاک سے پتھر پر سر لگا معلوم نہیں خون نکلا یا نہیں مگر گومڑا تو ضرور پڑ گیا تھا۔ چوٹ زیادہ آئی تو مولٰنا رونے لگے مسٹر کارگل پرنسپل کالج نے سمجھا کہ کوئی کالج کا لڑکا ہے مولٰنا کو روتا دیکھ کر فوراً ہمدردی کے قدموں سے لپکا اور شفقت کے ہاتھوں سے اُٹھا لیا اور دلجوئی کے طور پر کہا تم اپنی جماعت کے لڑکوں میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتے مولٰنا نے روتے روتے کہا میں مدرسے کا طالب علم نہیں ہوں پرنسپل نے کہا پھر کیوں آئے ہو۔ مولٰنا نے کہا سیر دیکھنے کو۔ پرنسپل نے کہا پھر تم کون ہو۔ مولٰنا نے کہا پنجابی کٹڑے کی مسجد میں رہتا ہوں اور طالبِ علم ہوں۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ جواب دیا شرح ملا۔ اور ابوالفضل۔ پرنسپل کو استعجاب ہوا تو مولٰنا کو ہال کے اندر لے گیا اور جا کر مفتی صدرالدین خاں صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا اور مفتی صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا کہتا ہے کہ مَیں شرح ملّا اور ابوالفضل پڑھتا ہوں ذرا اس کا امتحان تو لیجئے کہ یہ اپنے دعوے میں سچا ہے یا یوں ہی جھوٹ موٹ طفلانہ بات کہتا ہے۔ مفتی صاحب بڑے بدمزاج تھے کسی کو علم وفضل میں اپنا ہمپایہ نہیں جانتے تھے۔ اِس کے اور حکومت کے گھمنڈ میں کہ صدرالصدور تھے گو علم وفضل اور عمر کے لحاظ سے قابلِ ادب تھے اُن کی بدزبانی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ہر ایک سے تُو کر کے خطاب کرتے اور ہمیشہ آنکھیں ترچھی کر دیکھتے مولٰنا کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا اور تُو تڑاق سے گفتگو شروع کی پوچھا تُو کیا پڑھتا ہے۔ مولٰنا نے جواب میں عرض کیا کہ جناب مَیں نے آپ کا کیا

قصور کیا ہے - اس پر پرنسپل اور جو لوگ مفتی صاحب کے قریب بیٹھے تھے سب ہنس پڑے مفتی صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا اور سامنے کی ایک لماری میں سے شرح ملا نکالی اور مفعول لہٗ کی بحث اتفاقی طور پر ان سے سنی روکا ٹوکا کہیں نہیں اور نہ معنی پوچھے مولنٰنا فرّاٹے سے چند سطریں پڑھ گئے پھر انھوں نے ابوالفضل کے دفترِ دوم کی ایک جگہ نکال دی اور کہا کہ اس کو پڑھ مولنٰنا نے وہ بھی پڑھ سنائی مفتی صاحب تو امتحان لے کر کچھ نہ بولے لیکن پرنسپل نے مولنٰنا کی جسمانی اور دماغی ساخت پر جو نظر ڈالی تو ذہین پایا اور کہا کہ اب تو ایک مہینے کی چھٹی ہوگی ایک مہینے بعد آنا تو تمھارا نام لکھ لیا جائے گا اور چار پئے مہینہ تم کو وظیفہ ملے گا - مولویوں کے زنان خانے کے کاموں سے چوں کہ ہمارے مولنٰنا ڈرے ہوئے تھے اس لیئے پرنسپل سے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا کام لیں گے - پرنسپل نے کہا پڑھنا - اِس کے بعد مولنٰنا اُلٹے پاؤں مسجد میں آئے مولوی علی احمد صاحب بڑے بھائی حوض پر بیٹھے سر دھو رہے تھے مولنٰنا نے اُن سے کہا کہ بھائی میں تو چار روپے کا نوکر ہو گیا انگریزی مدرسے میں طالب علموں کی بھرتی ہو رہی ہے چلیئے میں آپ کو بھی انگریز سے ملا دوں - مولوی علی احمد صاحب نے حجت شروع کی مولنٰنا نے کہا دیر ہو رہی ہے وہیں چلیئے آپ کو معلوم ہو جائے گا ابھی اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ مولنٰنا اپنے بڑے بھائی کو لے کر بے تکلف ہال میں گھس گئے اور پرنسپل سے مولوی علی احمد صاحب کی خاتقریب کی کہ یہ میرے بڑے بھائی ہیں اور مجھ سے بھی زیادہ پڑھے ہوئے ہیں ان کو بھی نوکر رکھ لیجئے - پرنسپل نے مولوی علی احمد صاحب سے تو کچھ پوچھا پاچھا نہیں صرف اتنا کہا کہ تم بھی ایک مہینے بعد آنا - یہ ہے ابتدا مولنٰنا کے کالج میں داخل ہونے کی - اِس واقعے کی خبر جب پنجابی کٹڑے کے مولویوں کو ہوئی تو اُنھوں نے مولنٰنا کو مسجد سے نکال باہر کیا ہمارے مولنٰنا مسجد سے چلے آئے اور اُسی محلّے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرایہ پر لی وہاں رہنے سہنے لگے آخر کار جنوری ۱۸۴۵ء میں کالج کھلنے کے بعد اپنا نام داخل کرا لیا مہینہ ختم ہوتے ہی پہلا وظیفہ چار روپے کا ہاتھ آیا پھر ذہن و ذکا کی سفارش سے یہ وظیفہ وقتاً فوقتاً اتنا بڑھتا رہا کہ جماعتِ دوم سے جماعتِ اول تک چار سے چوبیس تک پونہچ گیا - اِس طرح خدا خدا کر کے مسجد کی گدایانہ زندگی سے مولنٰنا کو نجات ملی جہاں افسوس کہ بہتیرے طالب علموں کا یہ حال تھا کہ دو دو وقت روٹی کے ٹکڑے کو ترستے تھے اور کوئی سہارا نہیں دیتا تھا - کچھ دنوں تو مولنٰنا کرائے کی کوٹھڑی میں رہے بعد ازاں مولوی غلام حسین[۵۱] صاحب کے ہاں اُٹھ آئے جو مولوی عبدالقادر صاحب کے دُور کے رشتہ دار تھے - مولوی غلام حسین صاحب اور مولوی سعادت علی صاحب سے ایک دوستانہ خصوصیت بھی تھی - مولنٰنا نذیر احمد صاحب ان کو تین روپے ماہانہ کھانے کا دیتے تھے - بعدہ ان کی وساطت سے ہمارے مولنٰنا کی شادی مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی جس کا حال آیندہ آئے گا +

---

۵۱ مولوی غلام حسین صاحب صرف معمولی نوشت و خواند جانتے تھے مگر کہلاتے تھے مولوی صاحب ہی تعویذ گنڈے میں مشہور تھے علاج معالجہ بھی عطائی طور پر کرتے تھے غرض دعا اور دوا دونوں جاری تھیں آدمی بڑے متقی اور پرہیز گار تھے مولوی عبدالقادر صاحب کی منجھلی لڑکی ان کے لڑکے احمد حسین صاحب سے منسوب تھیں - جواب حیدرآباد کی تحصیلداری سے پنشن لے کر خانہ نشین ہیں - مولوی غلام حسین مولوی عبدالقادر صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور سب کو " دولھا میرے دولھا میرے " کہہ کر مخاطب کرتے تھے - مولوی عبدالقادر صاحب کے انتقال کے چند سال بعد انھوں نے بھی رحلت کی پہلے ان کا کارخانہ شال بافی اور زردوزی کا تھا مگر وہ خود کام نہیں کرتے تھے مالکِ کارخانہ تھے - کارخانہ جب بگڑ گیا تو صرف دوا درمن اور جھوچھا پر گزر تھی اس کے سوا آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا - اربابِ توکّل میں سے تھے اور اچھی خاصی گزران کرتے تھے ۱۲ +

باپ کا انتقال اور مولٰنا کا تحصیلِ علم کے میدان میں سرپٹ دَوڑنا۔

بے پدری ایسی سخت مصیبت ہے کہ بعض صورتوں میں مرجانا اِس سے بہتر ثابت ہوا ہے اور خیر ایسی صورتیں کثیر الوقوع نہ بھی ہوں تاہم کم عمری میں باپ کے سایہ کا سر پر سے اُٹھ جانا کہ وہ گھر بھر کا سرپرست ہے ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی جس باغ کا مالی جس کھیت کا کاشتکار جس بچے کا باپ نہ ہو اُس کے پھُولنے پھَلنے پنپنے کی کیا اُمید غرض باپ کی زندگی میں اگرچہ ہمارے مولٰنا پڑھنے لکھنے سے کبھی بھاگے نہیں مگر یہ بھی نہیں ہوا کہ شوق و محنت سے پڑھا ہو۔ بظاہر اس کے دو سبب تھے پہلی بات تو یہ ہے کہ باپ پر سب ہی ناز کرتے ہیں اور ناز میں جیسا پڑھنا ہونا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ دوسری بات یہ کہ خدا داد ذہانت کی وجہ سے تشفی کے لائق یاد کرنے اور اپنے ہم چشموں کے برابر رہنے کے لیئے زیادہ محنت کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی صرف پڑھتے وقت کتاب دیکھ لیا کرتے تھے اور ایک دفعہ کے دیکھنے سے اچھّی طرح سبق یاد ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی کتاب دیکھتے تھے نہ مطالعہ کرتے تھے امتحان کے چند روز قبل سرسری نظر کتابوں پر ڈال لیتے تھے اور امتحان میں کامیاب ہو جاتے تھے مگر جب باپ کی آنکھیں بند ہوئیں تو مختلف جواب دہیوں کے دروازے کھُل گئے۔ اُس وقت اِن کی آنکھیں کھُلیں اور خیال آیا کہ یہ موقع غفلت کا نہیں ہے اپنی خدا داد قابلیت کے حسن استعمال سے افلاس کے تیرہ و تار آسمان میں ایک آفتاب روشن کر دینا چاہیئے باپ کے انتقال کے وقت بیٹے نے عمر کے تیرہ مرحلے طے کر کے چودھویں سال میں قدم رکھا۔ وہ وقت بیٹے کے لیئے ایک کوہ مصیبت تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد جو دکھ درد اُٹھانا پڑا اُس کو بیٹا یوں بیان کرتا ہے ۞

دو کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا دو ڈھائی برس کی چھٹائی بڑائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑنا حقیقت میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑنا تھا مگر عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ[1] لَا تَیْأَسَنَّ اِذَا الْبَلِیَّہ ۞ فَلِلرَّحْمٰنِ اَلْطَافٌ خَفِیَّہ[2] ۞ والد کا قبل از وقت انتقال تحصیلِ علم کے لیئے کاری تازیانے کا کام کر گیا۔ والد کو رو پیٹ کر واپس آیا تو یہ خیال کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے ڈوبی اور نوٹ ڈوبی کا فیصلہ ہے - اِمَّا لِھٰذَا وَ اِمَّا لِذَا چناں چہ تحصیلِ علم کے میدان میں یا تو قدم بہ قدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے"

فی الواقع مولوی سعادت علی صاحب کے انتقال کے بعد مولٰنا نذیر احمد صاحب نے علم کے خمیر سے محنت کی پاؤ روٹی پر توجہ کا مکھن لگا کر کتابوں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ کالج میں عِلمِ ادب عِلمِ معانی عِلمِ فرائض اور ریاضی کی تکمیل کی۔ دیوانِ متنبی۔ قصائدِ سبعہ معلقہ تاریخ یمینی مقاماتِ حریری اور دیوان حماسہ وغیرہ وغیرہ یہ کتابیں دہلی کالج میں بطور نصاب اسی طرح داخل تھیں جس طرح کہ اب بھی مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جاری ہیں۔ پوری کتاب کوئی بھی نہیں اور پھر برائے نام سب کتابیں موجود۔ علمِ ادب اور ریاضی کا زیادہ خیال باقی یوں ہی برائے بیت اور مقدارِ سبق بہت کم۔ یہی حال دہلی کالج کی تعلیم کا تھا۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ "ایک ہی گاڑی میں بیل گدھے گھوڑے خچر سب ہی جُتے ہوئے تھے۔ تاہم بجائے خود مدرسے کی پڑھائی کا ایک انبار تھا"

---

[1] عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو ۱۲

[2] اے مصیبت مند ہرگز نا اُمید نہ ہو کیوں کہ خدائے رحمٰن کے پاس مخفی عنایتیں ہیں ۱۲

ہمارے ہاں کی پُرانی تعلیم میں ایک طریقہ نہایت خطرناک ہے۔ اگرچہ وہ عام نہیں مگر یہ بھی نہیں کہ صرف خواص سے متعلق ہو یعنی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ہاتھ میں کتاب لیئے رہنا طالب علم کی بڑی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ طالب علم جب تک بچے ہوتے ہیں تو ماں باپ ہزار اُن کو باندھ کر بٹھائیں مگر وہ کھیل کود سے باز نہیں آتے اور اس طرح وہ اپنی تندرستی کو صحت کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کو جب دیکھو چونچال اور بحال نظر آئیں گے۔ خیر ان کا ذکر نہیں۔ ذکر ہے اُن طالب علموں کا جن پر کسی کا دباؤ نہیں اور اُن کو از خود شوق ہوجاتا ہے تعلیم کا۔ مگر کس طرح کہ سونا حرام۔ کھانا پینا حرام۔ کھیلنا کودنا حرام۔ دوستوں سے ملنا حرام ہوا خوری حرام۔ غرض کتاب اور مطالعۂ کتاب کے سوا کل کام حرام طالب علم کو اپنے اُوپر اتنی چیزوں کے حرام کرنے کی اکثر یہ سزا ملتی ہے کہ دماغ مختل ہوجاتا ہے آدمیوں سے اس کو وحشت ہوجاتی ہے گویا وہ اُس کا ہم جنس ہی نہیں اگر بخت و اتفاق سے وہ مختل الحواس نہیں بھی ہوتا ہے تو نحافت اور کم زوری کی سزا اُس کو ایسی ملتی ہے کہ عمر بھر پنپنے نہیں پاتا۔ وہ دائم المرض ہوکر زندگی کے دن پورے کرتا ہے ضعفِ جگر سے عاجز کمزوری دماغ کا شاکی جب دیکھو آنکھوں پر عینک یا سرے سے اندھا مراق سے دق ضیق النفس سے تنگ غرض وہ ایک معجونِ امراض ہوکر رہ جاتا ہے۔ ہمارے مولنا بھی شروع شروع اس عام غلطی کے مرض میں مبتلا تھے اور اُنھوں نے بھی دن بھر کتاب رٹتے رہنے کو شرطِ طالب علمی قرار دے رکھا تھا۔ اول تو نصاب مدرسہ ہی کا انبار کیا کم تھا کہ جناب مولنا نے خارج از اوقات مدرسہ بعض اساتذہ وقت سے دو سبق اور شروع کردیئے تاکہ جماعت کی پیروی میں وقت کا نقصان نہ ہو اور یوں دوہری محنت کے ساتھ اُن کی استعداد دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی غرض اُن دنوں کا پڑھنا۔ پڑھنا نہ تھا بلکہ کتابوں کا پھانکنا تھا۔ اِس قسم کی تعلیم کے بارے میں مولنا نے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔ "دن کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانِ طالب علمی میں میں کسی ایک رات نیند بھر کر سویا ہوں میں اسکالرشپ ہوئے پیچھے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجکو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیئے جگادے۔ میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا تاکہ سو نہ جاؤں مجھ کو کوئی قسم کے عطیے اور تلکے معلوم تھے اور اگر میں سمجھتا کہ اس طرح کی طالب العلمی علی گڑھ کے طالب العلموں کے حق میں مفید ہوگی تو یقین جانو میں اُن لٹکوں کے بتا دینے میں دریغ نہ کرتا غرض مجھ کو کئی قسم کے عطیے اور لٹکے معلوم تھے اور اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً اُسی "وآل ورک اینڈ نو پلے"[2] کا یہ نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی ایک زمانے میں شطرنج کھیلا کرتا تھا تو ہمیشہ ماتیں کھاتا تھا اور برد دینے کو بڑی جیت سمجھتا۔ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں یہ غلط خیال ایسا جما ہوا ہے کہ اگر کھیل کو کمپلسری (جبری) نہ کیا جائے تو یہ خالی بیٹھے رہیں اور دوڑ دھوپ کے نام گھر سے پاؤں نہ نکالیں ایسے قدر ناشناسوں سے توقع رکھنی فضول ہے۔"

مولنا نذیر احمد صاحب باپ کے انتقال کے بعد زمانۂ طالب علمی میں مطالعۂ کتب کو جس قدر ضروری چیز سمجھتے تھے اتنا اور کسی چیز کو نہیں اگلے سبق کو اپنی زورِ طبیعت سے آپ نکالتے تھے۔ گھنٹوں کتاب پر سر جھکائے جھکائے اُن کی گردن شل ہوجاتی تھی اور مطالعۂ کتاب کے بعد طبیعت اِس قدر خستہ ہوجاتی تھی کہ گویا بڑی بھاری منزل طے کرکے آئے ہیں باوجود اس محنتِ شاقہ کے اگر کبھی امتحان میں ناکام رہتے تھے تو مولنا کو مدتوں ملال رہتا تھا کیوں کہ مولنا کا دعویٰ تھا اور بالکل بجا دعویٰ تھا کہ نحن رجال[3] و ھم رجال[4] سبب کیا کہ کوئی اُن سے اچھا ہو۔ غرض مولنا اس قسم کی محنت تو کرتے ہی تھے ماسوا اِس کے چند طریقے تحصیل علم کے ایسے بھی معلوم

[1] وہ دوائیں جن سے چھینک آتی ہے ۱۲ [2] کام ہی کام اور کھیل نہیں ۱۲ [3] ہم بھی آدمی ۱۲ [4] وہ بھی آدمی ۱۲

تھے جو بہت زیادہ مفید اور بکار آمد ہیں مثلاً اگر کوئی قاعدہ یا محاورہ یا کوئی مضمون قابلِ یادداشت آیا ایک نشان خاص حاشیہ کتاب پر کردیا یا بطور یادداشت ایک کتاب میں لکھ لیا اور اوقاتِ فرصت میں غور کرتے رہے اس میں تو کچھ شک نہیں کہ محنت تو بڑی تھی مگر ویسے ہی اُس کے فائدے بھی ملے مطالعۂ کتب کی بدولت پڑھا ہوا اس طرح ذہن نشین ہوگیا جیسے نقش کالحجر کہ برسوں کے بعد آج اگر خیال کرتے ہیں تو کتاب سامنے کھلی نظر آتی ہے وجہ یہ ہے کہ عربی وہ اس تحقیق سے پڑھتے تھے کہ ہر لفظ کا مادہ اور ماخذ اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ساری جماعت میں اول بلکہ بعض اوقات اُستاد[1] دبریز بریز کرتے پھرتے تھے اس طریقے سے جناب مولنا مشکل سے مشکل سبق فوراً یاد کرلیا کرتے تھے۔ پایداری محنت کی خاص صفت مولنا میں بہت زیادہ تھی اور یہی وہ صفت ہے جس نے اُن کے ہر قسم کے عروج میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بہرحال اس قدر محنت کے بعد اُن کو ایک تمغہ ملا تھا جس کی نسبت مدرسۂ طبیہ دہلی کے پہلے سالانہ جلسے میں ارشاد فرمایا تھا " عمر کے ساری عمر کی تحصیل میں ایک تمغہ نصیب ہوا وہ بھی کورس کی کتاب پر نہیں بلکہ جوابِ مضمون پر۔ تمغہ غدر میں لُٹ گیا اُس کا ملنا یاد ہے مضمون فراموش۔ شاید شمس[2] العلما رخان بہادر مولوی ذکاءاللہ کو یاد ہوگا۔ اول تو ان کا حافظہ ماشاءاللہ قوی ہے دوسرے ہم جماعت ہونے سے طالب العلموں میں ایک طرح کا محاسدہ قائم ہوجاتا ہے اور وہ محاسدہ محمود ہے جو شوق کو مشتعل اور مشقت کو ہلکا کرتا ہے تمغہ ملتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے مجکو ضرور بُری طرح گھورا ہوگا اور اب بھی باوجودیکہ صاحب ڈپٹی[3] کمشنر بہادر موجود ہیں بُری طرح گھور رہے ہیں "

تاریخ اور ریاضی سے نفرت یہ ایک کلیہ سا ہے کہ جن دماغوں میں ادب کی صلاحیت ہے وہ ریاضی سے یقیناً بھناتے ہیں ہمارے مولنا کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ مولنا ریاضی سے نفرت کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ " اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً اُسی " آل ورک اینڈ نو پلے " کا یہ نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلا کرتا تھا تو ہمیشہ بازی کھاتا تھا اور بُرد لینے کو بڑی جیت سمجھتا تھا " لیکن ہمارے خیال میں یہ کوئی وجہ معقول نہیں ہے بلکہ بحقیقۃ مولنا کا دماغ ریاضی کے لیے موضوع ہی نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم حافظے کی یہ حالت تھی کہ اُقلیدس کو کبھی سبق کے طور پر نہیں پڑھا اور نہ یاد کیا۔ اُستاد کے بیان کو صرف سُن لیتے اور بورڈ کو دیکھ لینے سے پوری شکل مستحفظ انگریزی طریقۂ تعلیم مروجۂ ہندوستان کے جتنے نقص بیان کیے جاتے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ متعلم کے رحجان طبیعت کی ذرا پروا نہیں کی جاتی تین تین چار چار درجن مختلف المذاق لڑکوں کی جماعت بنالی اور سب کو ایک لاٹھی ہانک چلے اور پڑھائی اتنی کہ غذائے نامرغوب کی طرح اوپر تلے ٹھونسی جاتی ہے اور وہ ہضم نہیں ہوتی جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ جس کو اصلی استعداد کہتے ہیں وہ کسی فن میں بھی حاصل نہیں ہوتی ؂

نہ محقق بود نہ دانشمند　　　چارپائے بر و کتابے چند

---

[1] اِن سے مراد مولوی سید محمد صاحب ہیں جو دہلی کالج میں عربی کے مدرس دوم تھے اور مولوی مملوک العلی صاحب کے انتقال کے بعد یہی اُن کی جگہ مدرسِ اوّل ہوئے تھے اِن کی استعداد بہت زبردست نہ تھی۔ لہذا شاگردوں سے دبتے تھے ۱۲

[2] شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب مولنا کے خاص دوستوں میں ہیں۔ اور اس طور کے دوستوں میں ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے " دریا ایام جوانی چناں کہ اُفتد دانی " ۱۲

[3] ڈپٹی کمشنر دہلی سالانہ جلسہ مدرسہ طبیہ دہلی کے صدر انجمن تھے ۱۲

ہاں تو ہمارے مولنا کا رجحانِ طبیعت ریاضی کی طرف نہ تھا اور نہ صرف ریاضی کی طرف بلکہ تاریخ کی طرف بھی التفات نہ تھا۔ اُن کو اِن دونوں علموں سے نفرت اور وحشت سی ہوتی تھی اور اب بھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"میں نے تو کسی طالب العلم کو جغرافیئے اور تاریخ کا شائق نہ پایا جس کو دیکھا رو تے جھینکتے ہی دیکھا۔ اور میں دوسروں پر کیا الزام دوں جغرافیئے اور تاریخ کے نام سے خود مجھکو نفرت ہے" دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"مجھکو جو ساری عمر سائنس سے گریز رہا اس کے دو سبب ہوئے اول یہ کہ سائنس کے بعض مضامین اُقلیدس جبر و مقابلہ وامثالہا بہت سوچ بچار چاہتے ہیں اسی کا ہو رہے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکے اور انبارِ تعلیم کے ہوتے کسی ایک کا کیسے ہو رہے پس بہت طالبِ علم اپنی پسند کی ایک چیز لے لیتے ہیں اُسی پر زیادہ توجہ کرتے اور اُسی میں اچھے بھی رہتے ہیں میں نے عربی ادب لیا تھا اور سائنس کو بے وضو ٹرخاتا تھا۔ دوسرا سبب سائنس کی طرف سے بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ انسان کی طبیعت واقع ہوئی ہے کنسرویٹو اور میری طبیعت میں اس کا عنصر زیادہ ہے۔ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا سائنس میں توغل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا"

فی الواقع مولنا اقلیدس کے ابتدائی مقالوں کے نئے دعووں اور جبر و مقابلے کی مشکل مساواتوں کو بآسانی حل نہیں کر سکتے تھے اور اِسی وجہ سے سائنس مولنا کے لئے غذاء نامرغوب تھی یا دوسری وجہ یہ بھی ہو کہ اُن کے مذہبی خیالات پر سائنس بے جا حملے کرتا تھا اِس وجہ سے اُن کی طبیعت نے اِس کو گوارا نہیں کیا غالباً اسی وجہ سے اُنھوں نے بیچارے سائنس کو "موذی" کا خطاب دے رکھا تھا مگر تھا کیا کہ ریاضی وظیفہ دلواتی تھی اِس لئے بقدرِ استحفاظِ وظیفہ بادلِ ناخواستہ ان مضامین پر بھی محنت کرتے تھے مگر نہ ایسی کہ جیسی ادب پر

نامہربان اُستاد کے پھندے سے بچنا

مولوی سعادت علی صاحب نے جب مولنا کو ریاضی میں بہت کمزور پایا تو اُن کو اس کی بہت فکر ہوئی آخر بیٹے سے ارشاد فرمایا کہ چلو تم کو مولوی قادر علی صاحب[1] کے پاس لے چلوں وہ تم کو اقلیدس وغیرہ بتا دیا کریں گے۔ دہلی کالج میں مولنا کے وطنِ اصلی ضلع بجنور کے بھی بہت سے طالب علم تھے اُن میں سے یہ مولوی قادر علی صاحب بھی تھے یہ منڈاور کے رہنے والے تھے جو بجنور سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہے۔ مگر جن

---

[1] بطور جملہ معترضہ یہ بات بھی اس کے ضمن میں لکھنے کے قابل ہے کہ یہ مولوی قادر علی صاحب رفتہ رفتہ چار صدی ڈپٹی کلکٹری تک پہنچے تھے اور اُن کے منڈاور میں مولنا کی خالہ منشی شہامت علی صاحب کے بھائی کو بیاہی تھیں۔ غرض خاندانی وقعت کے اعتبار سے مولنا کسی طرح مولوی قادر علی صاحب سے ہیٹے نہ تھے۔ اب سُنیئے ایک عجیب اتفاق کہ مولوی قادر علی صاحب تو ڈپٹی کلکٹر تھے اور ہمارے مولنا حیدرآباد میں صدرِ تعلقہ دار یعنی صوبہ دار۔ اِن دنوں مولوی قادر علی صاحب میرٹھ میں چار سو کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولنا حیدرآباد میں سترہ سو کے صوبہ دار۔ مولنا رخصت لے کر حیدرآباد سے دہلی تشریف لائے۔ رخصت ختم ہونے کو تھی کہ سر سالار جنگ وزیر حیدرآباد کا تار پہونچا کہ مسٹر محمود چیف جسٹس سے لڑے ہوئے علی گڑھ میں وکالت کر رہے ہیں اور ہم نے اُن کو ریاستِ حیدرآباد میں قانونِ مال گزاری بنانے کا حکم دیا ہے۔ تم اُن سے ملتے ہوئے آنا وہ تم سے مصطلحاتِ ریاست دریافت کریں گے اور کچھ حالات پوچھیں گے

چنانچہ مولنا علی گڑھ گئے اور سر سید کے پاس ٹھیرے۔ سر سید نے اپنے کمرے کے پہلو میں مولنا کو ایک کمرہ بتا دیا مولنا اُس میں فروکش ہوئے۔ تیسرے یا چوتھے دن سر سید نے بے وقت مولنا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولنا نے دروازہ کھولا تو سر سید نے اندر آکر مولوی قادر علی صاحب کا تار دیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ مولوی نذیر احمد صاحب آپ کے ہاں کب تک ٹھیریں گے میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ تار کے پڑھتے ہی مولنا کو ہنسی آگئی سر سید نے سبب پوچھا مولنا نے وہ طالبِ علمی کے وقت کا قصہ بیان کر دیا اور کہا کہ شاید مولوی قادر علی صاحب وہ وقت بھول گئے ورنہ شاید ایسا نہ کرتے ۱۲

وقتوں کا یہ مذکور ہے کہ وہ سشن جج کے محکمے میں اظہار نویس ہو گئے تھے مگر اجمیری دروازے کے مدرسے میں اپنے انھیں حجروں میں رہتے تھے جن میں اُنھوں نے طالب علمی کی تھی۔ غرض مولوی سعادت علی صاحب ہمارے مولٰنا کو مولوی قادر علی صاحب کے پاس لے گئے۔ مولوی قادر علی صاحب نے کہا کہ مجکو بہت کم فرصت ہوتی ہے اور میں کوئی وقت مقرر نہیں کر سکتا۔ ہاں اِس لڑکے کو میرے پاس چھوڑ دو میرے پاس رہا کرے مجکو جس وقت فرصت ہوگی میں اس کو بتا دیا کروں گا۔ اصل میں مولوی قادر علی صاحب کو ایک خدمت گار کی حبت وجو تھی اُنھوں نے چاہا کہ مولٰنا انھیں کے ہاں رہیں اور انھیں کے سر کھائیں اور اُن کی چلمیں بھرا کریں۔ مولٰنا کے والد یہ سن کر بہت افسردہ ہوئے اور مولٰنا کو لے کر چلے آئے ✦

غرض یہی عربی ادب تھا جو مولٰنا کو کالج میں ٹھیرائے ہوئے تھا ورنہ بقول مولٰنا "اسکالرشپ کے لیئے تاریخ و ریاضی کو چار و ناچار دیکھنا ہی پڑتا تھا ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا ✦ لیکن وہ دیکھنا پارے کا سا چھونا تھا مگر یہ بڑی جیت تھی کہ نمبروں کے مجموعے پر پاس اور فیل کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ خدا عربی کا بھلا کرے کہ وہ ریاضی وغیرہ کی تلافی کرتی رہتی تھی اور یہ نہ ہوتا تو میں کسی طرح جماعت میں بیٹھ نہیں سکتا تھا"

مزاحاً انکساری مزاح المؤمنین کا مذاق مولٰنا میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور یہ انسان میں ایک ایسی عمدہ صفت ہے جس کی تعریف میں بڑے بڑے صوفی رطب اللسان ہیں۔ بہر حال مناسب مقام مولٰنا کے چند مزاح درج کیئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "انگریزی پڑھنے سے ایک گُر تو معلوم ہوا کہ آدمی ایک زبان کو سلیقے سے حاصل کرلے تو دوسری زبان کے سیکھنے میں اُس کو بڑی سہولت ہوتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ لنگواسٹ (زبان دانی) ہونا کچھ بات نہیں مجکو انگریزی کی گرامر کی ٹکنکلیٹز (مصطلحات) تک معلوم نہیں۔ مگر میں نے عربی کسی زمانے میں اچھی طرح پڑھی تھی اب تو ایسا ذہول ہو گیا ہے کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں مگر زمانِ طالب العلمی میں ایک ایک لغت اور ایک ایک محاورے کے لیئے کئی کئی سندیں زبان کی نوک پر تھیں ؎ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ✦ ہو گئے خاک انتہا ہے یہ ✦

یا مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے "جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے عربی حاصل کی تھی اُن میں ایک کم سواد کٹھ مُلّا میں بھی ہوں۔

یا مثلاً :- یہاں ساری عمر عربی "دی اونلی لینگوئج" رہی۔ اور آئی تو اتنی ہی آئی کہ یوں تو تنہائی میں شاید صفحے کے صفحے اپنے دل میں گھڑتا چلا جاؤں مگر احیاناً کسی عرب سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو پہلے ہی جملے میں سٹّی بھول جاتی ہے۔ دو سطری خط قلم برداشتہ نہیں لکھ سکتا"

یہ سب مولٰنا کا مذاق یا انکسار ہے ورنہ ہمارے نزدیک تو اُن کا ہمتا نہیں۔ بہر کیف مولٰنا عربی علم ادب میں اس وقت وہ پایہ رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں چند کے سوا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور جو مقابلہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ہم پایہ ہوں گے عربی علم ادب سے چوں کہ مولٰنا کو فطری تعلق ہے اسی وجہ سے وہ ہمیشہ عربی کی زیادہ حمایت کرتے رہے اُن کی کوئی سی بھی کتاب یا لکچر یا کوئی خط اُٹھا کر دیکھیئے تو اُس میں قرآن مجید کی آیتیں۔ احادیث کی عبارتیں اور عربی کتابوں کے اشعار یا فقرے ضرور نظر آئیں گے۔ بعض لوگ مولٰنا کی اِس طرز پر معترض بھی ہوئے مگر اُنھوں نے اس کا یہی جواب دیا۔

"ابھی دو منٹ لکچر دیتے ہوئے نہیں گزرے کہ میں لگا عربی بگھارنے۔ یہ دقت مجکو ہر جگہ اور ہمیشہ پیش آتی ہے۔ کیا کیا جائے کہ یہی ٹوٹی پھوٹی عربی تو اپنی ساری عمر کا سرمایہ ٹھیری اور لکچر دینے پڑتے ہیں اسلام پر۔ مسلمانوں کی تعلیم پر۔ مسلمانوں کی

انجمنوں پر تو چار و ناچار قرآن وحدیث سے استشہاد کرنا ہوتا ہے اتنا وقت نہیں ملتا کہ پہلے عربی پڑھوں پھر اُس کا ترجمہ کروں۔ اِس پر مجھ کو اسد اللہ خاں غالب یاد آئے کہ وہ بڑے مشکل گو شاعر تھے وہ ابتدا میں فارسی کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پارسی اور پارسی بھی نا آمیختہ بتازی۔ اِس پر انوکھے استعارات اچھوتی تشبیہات۔ لفظی تعقیدات۔ تو اُن کا کلام مشکل ہوا ہی چاہے۔ کوئی شخص کہتا تھا کہ ایک مرتبہ اُن ہی کے شعر کے اُن سے معنی پوچھے تو کچھ دیر تامّل کرنے کے بعد فرمایا "بھئی اِس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا تھا" اُن کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا اور ریختہ گوئی کو مبتذل اور دوں مرتبہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک ریختہ گو معاصر کی طرف اشارہ کر کے ایک قصیدے میں تعریضاً فرماتے ہیں ع آنچہ فخر تست در گفتار آں ننگِ من است + لیکن انگریزی عمل داری کی وجہ سے جو انقلابِ عظیم واقع ہونے والا تھا اُس کی صبح نمودار ہو چکی تھی اور زمانہ کہہ رہا تھا کہ مرزا صاحب اِس بساط کو تہ کیجئے کہ زبان فارسی نہ تو ہندوستان کی ملکی زبان ہے نہ اس میں علوم ہیں کیوں آپ اِس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگلے لوگ کچھ مستقل مزاج بھی زیادہ ہوتے تھے مرزا صاحب زیادہ مدتوں تک اِسی فارسی کو پکڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی ضد کہاں چلے خاص کر شاعری تو پیٹ بھرے کے مشغلے ہیں۔ اُس وقت جیسا کچھ شاہی دربار تھا وہاں ریختہ ہی کی قدر تھی ناچار مرزا صاحب نے بھی بادلِ ناخواستہ ریختہ کا مونہ چڑانا شروع کیا میں صرف نمونے کے طور پر اُن کے اُس وقت کے چند شعر پڑھتا ہوں۔

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے ‌ ‌ دعوئے جمعیّتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ‌ ‌ یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام ‌ ‌ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

ایک اور تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں قصداً اتفاقی بندشوں کو چھانٹ کر لایا ہوں۔

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا + زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا + ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی + میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مرزا صاحب کی شاعری اِس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیوں کر اپنی جنتری میں سے لوگوں کو نکالتا ہے وہ مرزا جو ریختہ گوئی کو ننگ سمجھتے تھے آخر اخیر اپنی اُردوئے معلّٰی پر فخر کیا کرتے سنئے مرزا کے مونہ سے اُردو کے ساتھ معلّٰی کا لفظ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

خیر تو جن دنوں اُن کی مشق زوروں پر تھی اُس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل + سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل + آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش + گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل +

قریب قریب ایسا ہی حال میرا ہے۔ لکھ دوں گا تو عربی ضرور ہو گی۔ سمجھو یا نہ سمجھو۔ مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ بھئی عربی پڑھو تو وہ اُلٹا بُرا مانتے ہیں۔ کیوں جی آج کسی ادنیٰ درجے کے حاکم کا سمن آتا ہے یا کوئی ادنیٰ درجے کا حاکم کسی کے مقدمے میں فیصلہ صادر کرتا ہے تو کوئی تم میں ایسا بے پروا ہے کہ پڑھنا جانتا ہو اور اُس کو نہ پڑھے یا پڑھنا نہ جانتا ہو اور اُس کو پڑھوا کر نہ سُنے اور سمن اور فیصلے کو بھی چولھے میں ڈالو کبھی تار آ جاتا ہے تو اُس کے پڑھنے اور پڑھوا لینے تک گھر کے سارے کام بند ہو جاتے ہیں۔ ایک پیسے کے کارڈ کی بھی کچھ حقیقت ہے بے پڑھے نہیں رہا جاتا۔ لیکن قرآن احکم الحاکمین کا فرمان تیرہ سو برس کا آیا ہوا رکھا ہے۔ اب اپنی اپنی جگہ سمجھ لو کس کس نے پڑھا اور کس کس نے پڑھوا کر سنا اور اس پر اسلام کے لمبے چوڑے

دعوے اور بڑے جوش وخروش اور اگر کبھی کسی مسلمان بھائی کا دل علیٰ ع دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ؟ اور وہ تم کو سختی سے عربی کے پڑھنے کو کہے تو تم اس کا مونھ کھسوٹنے کو موجود ہو جاؤ۔ اگر عربی کی طرف سے یہی غفلت رہی تو اَلْحَمْدُ و اَلْحُمْدُ پر لڑا کریں گے اور کوئی اتنا کہنے والا نہ ہوگا کہ صحیح لفظ اَلْحَمْدُ ہے تم بوڑھے طوطے کیا پڑھ سکتے ہو لیکن اپنی نسلوں کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ اچھا بھائیو! جو تمھاری سمجھ میں آئے سو کرو اپنا کام تو کہہ دینا ہے وہ بھی اس سبب سے کہ بُلا بُلا کر کہلواتے ہو۔"

بہر حال اگرچہ مولانا کے دماغ کو ریاضی سے قطعی طور پر مغایرت تھی اور اُن کی طبیعت علم ریاضی کو شوق سے قبول نہیں کرتی تھی۔ اور وہ کڑوی دوا کی طرح دفع مرض کے لیے اس کو پیا کرتے تھے تاہم وہ ریاضی میں کسی سے ہیٹے بھی نہ تھے بلکہ ہم نے سُنا ہے کہ مولانا کو اقلیدس کی متعدد شکلیں مع دعوے و ثبوت کے اب تک نوکِ زبان ہیں۔ حساب، جبر و مقابلہ، علم مثلث، پیمایش ان سب فنوں میں مولانا کو دست گاہ کامل ہے اور ہم نے حیدرآباد کے دورانِ قیام میں بھی بعض اپنے دوستوں سے سنا ہے کہ مولانا عہدہ دارانِ بندوبست کو پیمایش تختہ مسطح اور دوربین کا کام رقبہ نکالنا، پلاٹ بنانا، پرت بندی کے کل مسائل اس طرح بتاتے تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا ماہر اس سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔ دہلی میں مولوی عبدالحامد صاحب خان بہادر آنریری مجسٹریٹ ہم سے ناقل تھے کہ "میں ایک زمانے میں پیمایش کے کام سے بالکل ناواقف بلکہ متنفر تھا لیکن مولانا نے ایک ہفتے میں پیمایش کا کام نہایت آسانی سے مجھے سکھا دیا اور مجھے عمر بھر پھر کسی سے اس کے سیکھنے کی ضرورت نہ پڑی۔"

بہرکیف اِس نامناسبتی پر بھی مولانا کے قوتِ حافظہ کے کرشمے ملاحظہ فرمایئے کہ اس سن و سال میں بھی کالج کے پڑھے ہوئے سائنس کے مسئلے اب تک نوکِ زباں ہیں مولانا کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے سائنس کے مسئلے تمثیلاً اور تاریخ کے واقعات مثالاً بیان نہ فرمائے ہوں۔ مثلاً فرماتے ہیں "میکینک (علم جر ثقیل) کا یہ مسئلہ بچپن کا پڑھا ہوا ابھی تک میرے خیال میں ہے کہ جب برابر کے دو محرک مقابل کے سمتوں سے ایک جسم کو ملانا چاہیں تو دونوں کا اثر ضائع۔ یہ قاعدہ کچھ اس طرح کا عام ہے کہ فزکس (جسمانیات) منٹل (ذہنیات) مارل (اخلاق) پولیٹیکل (نظم ممالک سیاست مدن) وغیرہ سب ہی جگہ چلتا ہے۔ بنائے علیٰ ذٰلک عرب کی ساری بہادری اور تمام فوجی قوت اکارت تھی۔ جو چاہے اس کو بخت و اتفاق سمجھے مگر ہم تو ایسی سرزمین اور ایسی سوسائٹی میں پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئے کو آیۃ من آیات اللہ معجزہ اور خرقِ عادت ہی مانتے ہیں۔" *

یا مثلاً دوسری جگہ فرماتے ہیں "اگر کسی مدرسے کا ایک احمق لڑکا ایسی بدیہی بات نہ سمجھے کہ مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے لیکن جب پوچھا جائے تو ماسٹر کے ڈر سے کہہ دیا کرے کہ ہاں ہوتا ہے اس صورت میں ماسٹر قصوروار ہے کہ اس نے لڑکوں پر اپنی ہیبت ناجائز حد تک بٹھا رکھی ہے یا لڑکا قصوروار ہے کہ ڈرپوک اور دل کا بودا ہے کہ نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ ہاں سمجھ گیا لیکن اصل مسئلہ کہ مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے ہر حالت میں صحیح ہے بعینہٖ یہی حال ہے اسلام کا کسی نے اس کو طوعاً تسلیم کیا تو، اور کرہاً تسلیم کیا تو۔ وہ فی حد ذاتہ مذہب صحیح تھا اور ہے اور رہے گا۔"

یا مثلاً "وہ بے شک ہم میں بھی کوئی کوئی بڑے مال دار ہیں۔ کوئی کوئی بڑی سے بڑی خدمت رکھتے ہیں۔ کوئی کوئی صاحب خطاب ہیں لیکن قوم! یہ کوئی کوئی ہیں کتنے۔ فی صدی بتاؤ تو آسانی سے سب کی سمجھ میں آئے۔ سو میں ایک نہیں آدھا۔ آدھا نہیں

تہائی۔ نہیں چوتھائی۔ نہیں پانچواں حصہ۔ غرض تم اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی کسر بولتے جاؤ اور میں برابر نہیں کرتا رہوں۔ یہاں تک کہ تم کسور اعشاریہ پر اتر پڑو اور میں ان میں بھی ایک بڑا لمبا کھنکھجورا چلتا ہوا دیکھ کر کہوں کہ شاید"۔

بامثال فرماتے ہیں "اگر ایک پتھر اوپر کی طرف کو پھینکا جائے تو وہ پھینکنے والے کی قوت سے ایک حد تک اونچا جائے گا۔ مگر اُس کا اونچا جانا ہی اُس کے گرنے کی دلیل ہے سے یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے + زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے + اونچا چڑھنے میں پتھر کی رفتار ابتدا تیز ہوتی پھر بتدریج دھیمی اور مدھم ہوتے ہوتے آخر کار فنا ہو جاتی ہے۔ اے کاش رفتار صعودی کے فنا ہوئے پیچھے پتھر کو سکون اور وقوف ہو لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اور ہو نہیں سکتا۔ ریٹری بیوشن یعنی مکافات کے قاعدے سے ضرور ہے کہ پتھر جیسا اونچا چڑھتا تھا ویسا ہی نیچے کو گرے۔ صعود و ہبوط حرکتیں دونوں ہیں فرق اگر ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ حرکت صعودی کی ابتدا فاسٹ (تیز) ہوتی ہے اور انتہا سلو (آہستہ) اور حرکت ہبوطی کی بالعکس یعنی ابتدا بطی اور انتہا سریع مجھے یاد نہیں۔ مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ حرکت صعودی جس نسبت سے سست اور حرکت ہبوطی جس نسبت سے تیز ہوتی جاتی ہے ہندسہ دانوں نے تحقیق کر کے اعداد میں اُس کا ٹھیک اندازہ ٹھیرا دیا ہے۔ جس کو شوق ہو اور وہ اس وقت کے مسلمانوں کو نہ ہوا ہے نہ ہو تاہم جس کو شوق ہو ہمارے شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب سے معلوم کر سکتا ہے۔ پتھر کے ہبوط اور صعود پر ہم قومی ترقی اور تنزل کو قیاس کر سکتے ہیں اور اسی غرض سے میں نے اِس کا تذکرہ بھی کیا ورنہ میں کہاں اور کہاں ریاضی کا مسئلہ +

الغرض مولٰنا کی طالب علمی کے زمانے میں تو بی اے اور ایم اے کے بکھیڑے تھے نہیں ورنہ یہ ڈگریاں بھی علی وجہ الکمال پاس کر لینا اُن کی خداداد قابلیت کے آگے کچھ بات نہ تھی اگرچہ مولٰنا کی طبیعت کو بمقابلہ لٹریچر۔ تاریخ وجغرافیہ وریاضی سے مناسبت کم تھی تاہم مولٰنا اِس قدر بیگانہ بھی نہ تھے کہ بقدر ضرورت اُس کے پاس کرنے میں پس پا رہتے اُن کی طبیعت میں اِس قدر استقلال اور توجہ ہے کہ جدھر متوجہ ہوں اُس کام کو پورا کر کے چھوڑیں رغبت اور شوق سے بحث نہیں صرف امتحان ہی کے لالچ کیا کم تھے جو اُن کی طبیعت کو ہر وقت اِن علوم کے سیکھنے پر آمادہ کرتے رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مولٰنا نے بحر امتحان میں غوطے لگائے تو پاس کے موتیوں سے اپنا دامن بھر کر لائے ہیں اور فیل کے بھنور میں نہیں پھنسے مولٰنا کی یہ ہمت طبع کچھ جوانی ہی کے عالم میں نہ تھی بلکہ جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے اُس وقت بھی اُن کی ہمت اور استقلال کی یہی حالت تھی چنانچہ ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

"گرامر تمہاری بہت خام ہے چاہے مدرسے میں تاکید ہو یا نہ ہو اس کو درست کرو ورنہ بے گرامر زبان کا آنا معلوم۔ اپنے تئیں میرے اُوپر قیاس مت کرو۔ برخوردار من میں نے اتنا بھی بے مدد استاد کیا تو بہت کیا اور سو بات کی ایک بات تو حاجت ہے تو مجھ کو اب کیا ضرورت ہے کہ اپنا سر خالی کروں لیکن اگر آج کوئی یقین کرا دے کہ بی اے کا درجہ حاصل کرنے سے میری تنخواہ چھ سو ہو جائے گی تو خیر اب بھی امتحان دینے کو موجود ہوں +

مولٰنا کا عقد نکاح قبل اس کے کہ مولٰنا دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوں ایک عجیب حسن اتفاق سے اُن کے عقد کا سامان ہو گیا۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ جب ہمارے مولٰنا مولوی عبد الخالق صاحب کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور وہاں پڑھنا پڑھانا خاک نہیں ہوا تو اُس وقت کی شکایت کا اظہار جا بجا کیا ہے وہ شکایت یعنی کہ بجائے پڑھنے لکھنے کے اُن سے مولوی اور مولونیں اپنی خانہ داری کا کام لیا کرتی تھیں منجملہ اَور کاموں کے ہمارے مولٰنا مولوی عبد القادر صاحب کی لڑکی کو کندھے پر لادے لادے پھرا

کرتے تھے ہمارے نزدیک ایک طریقے سے تو مولٰنا کی یہ شکایت بجا ہے کہ تعلیم کا زمانہ مولویوں کے خانگی کاموں اور سودے سُلف میں ضائع کیا لیکن لڑکی کو گود میں لائے لائے پھرنا وقت کا ضائع کرنا نہ تھا مولوی عبد القادر صاحب کی لڑکی کی خدمت کسی غیر کی خدمت نہ تھی۔ بلکہ درپردہ وہ اپنی اہلیہ کی خدمت تھی اور جب اپنی اہلیہ کی خدمت تھی تو شکایت بالکل بے سود۔ یہی لڑکی آگے چل کر ہمارے مولٰنا کی بیوی بنی اور عجیب حسن اتفاق سے اِس لڑکی کے ساتھ عقد ہوا *

مولٰنا چوں کہ کم سن بچے تھے مولویوں کے زنان خانے میں آیا جایا کرتے تھے اور اس سبب سے معمولی طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ جانے بوجھے ہوئے تھے۔ اِن کی عادات و اطوار ذہانت اور متانت ایسی نہ تھی کہ مولوی عبد القادر صاحب کے خاندان کو خاص طور پر معطوف نہ کراتی۔ مولوی عبد القادر صاحب کو مولٰنا کی ذاتِ خاص کی طرف سے تو اطمینان ہی تھا کچھ سوچنا سمجھنا نہ تھا لڑکے کو ہونہار پایا تو دل ہی دل میں سوچ لیا ہوگا کہ اگر اس لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے اس عقد کا قصہ نہایت دل چسپ ہے اور وہ یوں ہے کہ پنجابی کٹڑے کی مسجد سے نکل کر مولٰنا نذیر احمد صاحب کچھ مدت تک کرایے کی کوٹھری میں رہے پھر ایک مولوی غلام حسین صاحب تھے مولوی عبد الخالق صاحب اور اُن کے خاندان کے دُور کے رشتے دار۔ تعویذ گنڈے علاج معالجے کے علاوہ اُن کا ایک کارخانہ کارچوب کا بھی تھا۔ مسجد کے قریب ہی اُن کا کارخانہ تھا اور گھر بھی اُن کے بیٹے احمد حسین صاحب جو آخر کو ہمارے مولٰنا کے ہم زلف ہوئے مولٰنا سے کچھ فارسی بھی پڑھتے تھے مولوی غلام حسین صاحب نے مولٰنا سے کہا کہ "تم اکیلے مکان میں رہتے ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ہی کے آس پاس رہنا بھی چاہتے ہو اور تم کو کھانے کی بھی تکلیف ہے اس سے بہتر ہے کہ میرے کارخانے میں آ رہو۔ مجھے کھانے کے دام دے دیا کرو تم کو کارخانے میں ہر طرح کا آرام بھی ملے گا اور احمد حسین بھی ہر وقت تمھارے پاس رہے گا اور اُس کا پڑھنا بھی بخوبی ہوگا" مولوی غلام حسین صاحب کے کہنے سے ہمارے مولٰنا کارخانے میں جا کر رہنے لگے تین روپے مہینہ مولوی غلام حسین صاحب کو کھانے کا دیا کرتے تھے۔ مولٰنا کو پکی پکائی روٹی دونوں وقت مل جایا کرتی تھی۔ احمد حسین صاحب کے پڑھنے کی وجہ سے مولوی صاحب کے گھر والے ہمارے مولٰنا کو آسودہ بھی رکھنا چاہتے تھے مگر وہ خود غریب تھے اپنی غریبی کی حد کے اندر اندر پھر بھی تنہائی سے ہمارے مولٰنا بہتر حالت میں تھے۔ مولوی غلام حسین صاحب کے کارخانے میں چار پانچ کاری گر بھی بیٹھتے تھے اور دو تین شاگرد۔ بائیں دالان کے ایک طرف کارچوب ہوتی تھی اور دوسری طرف مولٰنا کے بیٹھنے کی جگہ تھی جو چار پانچ آدمیوں کے لیے کافی تھی۔ کاری گروں میں برکۃ اللہ اور وجیہ اللہ دو بھائی تھے ان میں سے برکۃ اللہ کی عمر ۲۵ برس سے متجاوز ہو چلی تھی اور وہ مشاطہ کی معرفت اپنی شادی کے رقعے دوڑاتے رہتے تھے مگر کہیں بات جمتی نہ تھی۔ ایک مرتبہ مولٰنا نے ازراہ شوخ طبعی برکت اللہ کے رقعے میں اپنا نام لکھ دیا۔ فریق ثانی کی طرف سے اِس کی تحقیقات ہونے لگی۔ شدہ شدہ مولوی غلام حسین صاحب تک نوبت پونہچی ہمارے مولٰنا مولوی غلام حسین صاحب کا ادب بھی کرتے تھے کیونکہ ایک تو وہ بوڑھے آدمی تھے دوسرے مولوی سعادت علی صاحب کے دوست بھی تھے۔ غرض کارخانہ برخاست ہوا تو مولوی غلام حسین صاحب کارخانہ برخاست کر کے اکثر بازار چلے جایا کرتے تھے ایک دن خلافِ عادت کارخانہ برخاست کر کے اپنی جگہ بیٹھے رہے ہمارے مولٰنا بھی اُس وقت اکیلے تھے اُنھوں نے رقعہ نکال مولٰنا کے روبرو ڈال دیا اور کہا کہ "برخوردار اگر تم نکاح کرنا چاہتے ہو تو اِس کام کو مجھ پر چھوڑ دو میں مناسب جگہ تجویز کر دوں گا" مولٰنا رقعہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے کیونکہ وہ ایک ہنسی تھی جو اُنھوں نے برکت اللہ کے ساتھ کی تھی۔ مارے رعب کے ہمارے مولٰنا مولوی غلام حسین صاحب سے ہست و نیست کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ الخاموشی نیم رضا سمجھے۔ بات

رفت وگزشت ہوئی۔ اُدھر برکت اللہ نے بُرا مانا کہ میری بات میں آڑے لگاتے ہیں اِس شوخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولنٰنا سے اور برکت اللہ سے بگاڑ ہوگیا۔ دعا سلام بات چیت موقوف آپس کے دو ڈھائی مہینے بعد پھر ویساہی اتفاق ہوا کہ مولوی غلام حسین صاحب کارخانہ برخاست کرکے بیٹھے رہے اور ہمارے مولنٰنا کو اکیلا پاکر کہا کہ "لو میں نے تمھارا نکاح ٹھیرادیا ہے" مولنٰنا نے بات سُنی کی اَن سُنی کردی اِس بات کو کوئی ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ایک قعب میں مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے کچھ مٹھائی ایک چمارٹی[1] لائی اور اُس نے وہ قعب مولوی غلام حسین صاحب کو دی۔ مولوی غلام حسین صاحب نے قعب لاکر مولانا کے آگے رکھ دی اور کہا کہ "لو برخوردار تمھاری سُسرال سے مٹھائی آئی ہے اُن کے ہاں برادری سے کوئی حصہ آیا ہوگا یہاں کے دستور کے مطابق اُنھوں نے تمھارا حصہ بھیجا ہے" اَب تو مولنٰنا کے کان کھڑے ہوئے مگر اس وقت بھی ہست نیست مولانا نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے تحفے تحائف مولنٰنا کے نام مولوی غلام حسین کے ہاں آتے رہتے تھے اور مولنٰنا کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اِس طرح پر چپ چپاتے مولنٰنا کے نکاح کی بحث وپز ہو رہی تھی۔ مولنٰنا نے جب تحصیلِ علم میں محنت ومشقت کی تو اُن کے علم وفضل اور ذہانت کا سارے شہر میں شُہرہ ہوگیا تھا اور باوجود سے کہ وہ ابھی طالب علم اور کم سن تھے لیکن لوگ اُن کو مولنٰنا مولنٰنا کہا کرتے تھے۔

مولوی عبدالخالق صاحب کے دو بیٹے تھے مولوی عبدالقادر صاحب ہمارے مولنٰنا کے خسر اور مولوی عبدالرب صاحب واعظ جنھوں نے سہارنپور میں مسلمانوں سے چندہ جمع کرکے بڑی مشہور مسجد بنوادی ہے اور وہ اب تک آباد ہے۔ مولوی عبدالخالق صاحب نے پنجابی کٹرے کی مسجد کی امامت اور قلعے کی اسامیاں اور نکاح خوانی اور نمازِ جنازہ یہ خدمتیں اپنے بڑے بیٹے کے سپرد کی تھیں۔ مولوی عبدالرب صاحب وعظ کی مشق کیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالخالق صاحب کے داماد شمس العلما مولوی سیّد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی درسِ طلبہ اور فتوٰی لیے بیٹھے تھے اِن سب میں اُن دنوں مولوی عبدالقادر صاحب پیش پیش تھے کیوں کہ سب میں بڑے تھے

لوگوں کو ہمارے مولنٰنا کے نکاح کا حال معلوم ہوا تو سب نے بہت تعجب کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی عظمت کے لحاظ سے لوگ اَور بھی متعجب تھے کہ ایک پردیسی لڑکے (مولنٰنا نذیر احمد) کو مولوی عبدالقادر صاحب نے کیوں کر بیٹی دینے کا ارادہ کرلیا۔ اصل یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب بڑے دور اندیش آدمی تھے اُنھوں نے دیکھا کہ مولوی عبدالرب نے وعظ لیا ہے اور مولوی نذیر حسین صاحب نے درس وافتا تو اُنھوں نے اِن دونوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو سُبک پایا اور اس سبکی کی تلافی اس طرح پر سوچی کہ ہمارے مولنٰنا کو اپنا داماد تجویز کیا۔ اُنھوں نے ہمارے مولنٰنا کی طالب علمی کی شہرت نہ صرف سُنی تھی بلکہ دیکھی تھی اور وہ ایک مرتبہ طالب علموں کے ساتھ مولنٰنا کے مناظرے بھی دیکھے تھے اُن کو معلوم تھا کہ یہ لڑکا ہونہار ہے اور اَب نہیں تو آگے چل کر یہی ہلالِ نو آسمانِ علم پر بدر کامل بن کر چمکے گا۔ اُنھوں نے سوچا تھا کہ اس لڑکے کو مولوی نذیر حسین صاحب کا مقابل بناکر مسجد میں بٹھائیں گے۔ مسجد کی چھ محرابیں تھیں ایک میں مولوی عبدالخالق صاحب بیٹھتے تھے دوسری میں مولوی نذیر حسین صاحب تیسری خالی تھی۔

مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی عبدالرب صاحب کو اپنے بہنوئی مولوی سیّد نذیر حسین صاحب سے ایک طرح کی چشمک بھی تھی تو لوگوں نے مولوی عبدالقادر صاحب کو یہ کہتے بھی سُنا تھا کہ یہ تیسری محراب ان شاء اللہ نذیر احمد سے زیب رونق پائے گی۔

[1] دلّی میں قاعدہ ہے کہ وہاں تقریبوں میں یہی قوم حصے بخرے برادری کنبے اور شہر والوں میں تقسیم کرتی ہے۔ غالباً ہندوستان میں اَور کہیں ایسا رواج نہیں ہے بعض جگہ جولاہے تقسیم کرتے ہیں اور اکثر مقامات پر حجام ۱۲

مسجد کی تین محرابین جانبِ یمین مع حجرہ اُن وہابیوں کی طرف تھیں اور جانب یسار کی تین محرابیں مع حجروں کے حاجی قاسم صاحب کی طرف۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ جس طرح اُن کے والد مولوی عبدالخالق صاحب نے اپنے داماد کو مسندِ درس و اِفتا پر متمکن کر دیا تھا اِسی طرح ہمارے مولانا کو مولوی نذیرحسین صاحب کے مقابلے میں مولوی بنا کر بٹھا تے۔ مگر کالج میں رہنے سے ہمارے مولانا کی آنکھیں چار ہو گئی تھیں اور ماسوا اِس کے ہمارے مولانا مولویت کی دوکان کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔

بہرحال کچھ عرصے تک مولوی غلام حسین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب میں ہمارے مولانا کے نکاح کی بابت کھچڑی پکتی رہی آخر ایک دن ایک درزی فیروزی بانات لے کر مولانا کا قد و قامت ناپنے کے لیئے آیا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں دولھا (مولانا نذیر احمد صاحب) کے جوڑے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اِس وقت ہمارے مولانا کو اس کی خوشی ہوئی کہ مجھ کو بانات کا انگرکھا پہننے کو ملے گا۔ الغرض تمام لوگوں کو مولوی عبدالقادر صاحب کی طرف سے دعوت دی گئی اور ہمارے مولانا سے مولوی غلام حسین صاحب نے کہا کہ تم اپنے مدرسے کے طالب علموں اور اُستادوں کو محفلِ نکاح میں بُلوا لینا بہرکیف کوئی تاریخ مقرر ہوئی اور مولوی صاحب کے مکان میں وقتِ مقررہ پر محفل عقد منعقد ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مولانا کا نکاح مفتی صدرالدین خاں صاحب مرحوم نے پڑھایا کہ وہ عمر اور علم اور حکومت اور تموّل اور عزت کی رو سے دلّی بھر میں اول درجے کے شخص تھے گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا اور اس طرح عقدِ نکاح کی رسم پوری ہوئی +

اِس نکاح کی بجنور میں مطلق خبر نہ تھی چند روز بعد وہاں خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ مولانا کی والدہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ اُن بیوہ کا لڑکا پردیس میں بیاہا جائے اُن کی خوشی یہی تھی کہ بجنور میں بیاہ ہوتا اور یہ ایک نیچرل خواہش تھی مگر مولانا کو دیہات کی عورتوں کی بدسلیقگی اور علم سے بے بہرہ ہونا لباس کا پھوہڑپن۔ زبان کی کرختگی سب معلوم تھی اَھْلُ الْبَیْتِ اَبْصَرُ مَا فِی الْبَیْتِ مولانا شہر کے تکلفات۔ یہاں کی سلیقہ شعاری زبان کی نفاست دیکھ کر ریجھ گئے تھے۔ مولانا کی والدہ نکاح کی خبر سن کر دہلی چڑھ آئیں اور بہت کچھ روئیں پیٹیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُن کے دل میں یہ سمائی کہ مجھ رنڈیا کے بچے کو بے وارث سمجھ کر دلّی والوں نے چھین لیا اِس وجہ سے مولوی عبدالقادر صاحب کی بیوی اور مولانا کی والدہ یعنی سمدھنوں سمدھنوں میں کبھی صفائی نہیں ہوئی۔ اور ہمیشہ کشیدگی رہی اب تک بھی مولانا کی والدہ کو اس کا قلق ہے کہ بجنور کی رونق اور بہار دلّی میں ہے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ پوتے پوتیاں پڑپوتے پڑپوتیاں اللہ کے دیئے سب ہی کچھ ہیں مگر بجنور میں کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ اسی کی کوفت مولانا کی والدہ ماجدہ کو ہے خود مولانا گنتی کے چند بار بجنور گئے ہیں۔ پوتے پوتیاں مدت العمر میں ایک دو دفعہ کھڑے کھڑے مہمان داخل گئے تو اس سے اُن کی کیا تسکین ہو سکتی ہے ساری چہل پہل شادی بیاہ سب دلّی ہی میں ہے اِس پر بعض دفعہ وہ جل کر کہہ بیٹھتی ہیں کہ "نذیر احمد ہیرا میرے پیٹ میں پڑا تھا۔ مگر اُس سے مجھے کیا لینا میں نے اُس کی یا اُس کی اولاد کی کیا بہار دیکھی۔ میرے کمائی دلّی والوں نے لُوٹ لی۔ اِس سے بہتر تھا کہ بجائے اِس ہیرے کے میرے پیٹ میں پتھر پڑتا مگر میری آنکھوں کے سامنے رہتا" اور یہ اُن کا کہنا ایک حد تک درست اور حق بجانب ہے +

ایک اقرارنامہ اِس کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب سے مولوی عبدالقادر صاحب کی بڑی لڑکی کا نکاح ٹھہرتے تو ٹھیر گیا مگر مولانا کے انوکھے مزاج سے مولوی عبدالقادر صاحب کھٹکتے ضرور تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکا بجنور چلدے یا کچھ رنگ لائے

پردیسی کی پیت کا کیا بھروسا اور مولوی عبدالقادر صاحب اگرچہ کھلے الفاظ میں خانہ داماد کہہ کر مولٰنا کو نہیں رکھ سکتے تھے تاہم اپنا باؤ ضرور رکھنا چاہتے تھے اِس لیئے اُنھوں نے مولٰنا سے ایک اقرار نامہ نکاح کے وقت لکھوالیا کہ لڑکی کو باہر پردیس میں نہ لے جائیں گے اور حین حیات اِس لڑکی کے دوسرا نکاح نہ کریں گے۔ پہلی شرط اپنی مَن سمجھونی کی تھی ورنہ مولٰنا کی بیوی کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں مولٰنا رہے ہوں اور وہ نہ گئی ہوں۔ دوسری شرط بطور حفظ ماتقدم تھی کیوں کہ مسلمانوں میں دو دو چار چار بیویوں کا اس کثرت سے اور ایسی بُری طرح رواج ہوگیا ہے کہ زندگی کا لطف کرکرا ہو جاتا ہے اور مولوی صاحب کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ بجنور والے کہیں دوسرا نکاح نہ کرادیں لیکن یہ اقرار نامہ کاغذ ہی پر رہا۔ پہلی شرط تو متعاقدین کی رضامندی سے ٹوٹی اور دوسری شرط کے توڑنے کے لیئے بجنور والے مدّت العمر ساعی رہے اور ہر وقت گھات میں لگے رہے اور آخر کار بعد خرابی بصرہ آخر عمر میں اُن لوگوں کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ یعنی یہ کہ مولٰنا نے کوئی بیس سال ہوئے اپنی والدہ کے اصرار پر اپنے کنبے کی ایک بیوی سے عقد کرلیا۔ مگر وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ مولٰنا ڈھونڈتے تھے دہلی کا سلیقہ بھلا کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ خلاصہ یہ کہ برس دو برس بھی نہ نبھی۔ جب مولٰنا کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اِس جمع میں تفریق کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا

پہلی بیوی کی نسبت ایک ہنسی کی بات

ہنسی کی بات یہ ہے کہ مولٰنا جب پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں رہتے تھے اور مولویوں کے زنان خانوں میں آنے جانے تھے تو جب یہ لڑکی گھر میں روتی تو مولٰنا کے حوالے کردی جاتی کہ اس کو گلی میں لیجا کر بہلا لاؤ۔ مولانا اِس کے بہلانے کی کوشش کرتے۔ جب یہ مچلے ہی جاتی تو مولٰنا اِس کو جھنجلا کر مار بھی بیٹھا کرتے۔ نکاح کے بعد مولٰنا کو اس لڑکی کی خالہ زاد پھوپی سے جو اس لڑکی کی ہم عمر تھیں معلوم ہوا کہ جب مولٰنا کا نکاح ہونے لگا تو پھوپی نے سہیلی کے رشتے سے مولٰنا کی اہلیہ سے چپکے سے کہا کہ تمھیں کچھ معلوم ہے کس سے تمھارا نکاح ہوا۔ انھوں نے اِس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر پھوپی نے مولٰنا کا پتہ دیا تو اُن کو مولٰنا کا مارنا بھی یاد آیا اور اپنی پھوپی سے کہا کہ کیا اب بھی مجھے مارا کریں گے؟" اُنھوں نے کہا کہ "نہیں وہ وقت اور تھے اب تو وہ تمھارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے"۔

بیوی کا نان نفقہ

ذرا اس غیرت اور حمیت کو ملاحظہ فرمایئے کہ نکاح سے پہلے ہمارے مولٰنا نے یہ شرط کرلی تھی کہ نکاح کے بعد سے اپنے کھانے پینے اور بی بی کے نان نفقے کا میں ذمّہ دار ہوں گا۔ اور اس شرط کو اس زور سے پیش کیا تھا کہ اگر یہ منظور نہیں تو میں عین نکاح کے وقت ایجاب و قبول سے اِنکار کردوں گا۔ اِس پر بڑی ردّوکد ہوئی۔ بعض شیخی باز اشخاص نے خیال کیا کہ یہ نمایشی شرط ہے صرف لوگوں کے دکھانے کے لیئے ایسی بات کہی جاتی ہے میاں کے پاس ہے کیا جو بیوی کو کھلائیں پہنائیں گے مگر مولوی عبدالقادر صاحب ہمارے مولٰنا کے تیور سے سمجھ گئے کہ نذیر احمد صاحب غیرت ہے ناچار اُنھوں نے کہا کہ "نذیر احمد کو الگ گھر کرنے کا مقدور نہیں ہماری بیٹی کو عادت نہیں پس کھانا پینا تو الگ ہو نہیں سکتا اگر وہ اِس کو موجب عار سمجھتے ہیں تو کھانا پینا ہمارے ساتھ رکھیں خرچ دے دیا کریں بڑی جرح و قدح کے بعد تین روپے ماہانہ ٹھیر گیا۔ یہ وہی تین روپے تھے جو ہمارے مولٰنا مولوی غلام حسین صاحب کو اکیلے دم کا دیا کرتے تھے۔ ہمارے مولٰنا نے اپنے دل میں پانچ روپے ٹھیرائے تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب پر جب یہ رقم ظاہر کی گئی تو وہ ناخوش ہونے لگے جب ہمارے مولٰنا نے یہ دیکھا کہ مزاج میں برہمی پیدا ہوگئی تو چپ ہوگئے لیکن مولٰنا نذیر احمد صاحب کو یقین ہوگیا تھا کہ تین روپے مہینا دو آدمیوں کے لیئے کافی نہیں اور مولوی عبدالقادر صاحب نے رعایتہً یہ رقم قرار دی ہے۔ اُن کی یہ رعایت مولٰنا کو

ناگوار تھی تو مولٰنا کیا کرتے کہ اُن کے لیئے دسترخوان پر کباب میٹھے چاول پراٹھے اِس قسم کی چیزیں ہوتی تھیں اور سب ہی جگہ نئے داماد کی خاطر و مدارات ہوا کرتی ہے۔ دسترخوان پر اچھے کھانوں کے علاوہ دال اور چپاتی بھی ہوتی تھی تو مولٰنا دال چپاتی پر قناعت کرتے اور عمدہ غذا کو ہاتھ نہ لگاتے مولٰنا سے پوچھا گیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ "وہ تین روپے میں آدمی یہی دال چپاتی کھا سکتا ہے اور سسرال کی بدولت الوانِ نعمت مجھ سے کھائے نہیں جاتے اور میں اِس طرح دھرنا نہ دوں گا نہ مفت کے ٹکڑے توڑوں گا جب تک خدا مجھے اپنے خزانۂ غیب سے فارغ البالی دے۔" اللہ رے غیرت!

اِس کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ تحریر ہے کہ جس طرح مولٰنا کو مولوی عبدالقادر صاحب نے عقد کے وقت بانات کا انگرکھا بنوا دیا تھا اُسی طرح دہلی کیا غالباً تمام ہندوستان کے دستور کے مطابق دولھا کو بھی دلھن کا جوڑا دینا ضرور تھا مگر مولٰنا اُس مفلسی کے زمانے میں اتنی رقم کہاں سے لاتے کہ دُلہن کا جوڑا بنواتے۔ غرض نہ مولٰنا کو اُس وقت جوڑا بنوا دینے کا مقدور تھا اور نہ کہیں اُن کو قرض مل سکتا تھا ہم نے سُنا ہے کہ مولٰنا نے مولوی عبدالقادر صاحب سے ایک سو روپیہ اس کام کے لیئے لیا۔ مگر مصرف یہ نہیں بتایا اور اُن کو اس رقم کا ایک تمسک اسٹامپ پر لکھ دیا تھا جس کے لیئے مولٰنا کو اپنے نام کی ایک مُہر کھُدوانی پڑی۔ مولٰنا چھ روپے ماہوار اُس تمسک کے ادا کیا کرتے تھے اور تین روپے ماہوار خوراک کے ✽

پہلی عید دہلی کا ایک یہ بھی دستور ہے کہ نئے بیاہے ہوؤں کو پہلی عید پر سسرال کے کنبے کے لوگ عیدی دیا کرتے ہیں۔ مولٰنا کے لیئے اِس رسم کے مطابق بیس یا بائیس روپے جمع ہوئے اتفاق سے اُن دنوں مولٰنا کے روز مرہ کے کپڑے فرسودہ سے ہو گئے تھے اور عید کے لیئے نئے کپڑے بنوانے کی گنجایش نہ تھی تو مولوی عبدالقادر صاحب نے مولٰنا کی عیدی کے روپے مولٰنا کی بی بی کے ہاتھ میں دے کر کہلا بھیجا کہ تم عید کے لیئے اس روپے سے کپڑے بنا لو مولٰنا نے اپنی بی بی سے کہا کہ یہ روپے ہیں تو میرے نام کے مگر حقیقت میں یہ عیدی تمھاری ہے میری نہیں اِس واسطے کہ تمھارے تعلق کی وجہ سے مجھے دی گئی ہے تو تم ان روپوں کو اپنی ضرورتوں میں صرف کر دیا کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوا لو۔ میں ان روپوں کو اپنے کام میں نہیں لا سکتا۔ مولٰنا کی بی بی نے وہ روپے اپنے والد کو یہی کہہ کر واپس کر دیئے۔ مولوی عبدالقادر صاحب بڑے غصیلے آدمی تھے اُنھوں نے ناخوش ہو کر کہا کہ "میں عید کے دن بچّوں کو اپنے ساتھ لے کر عیدگاہ جایا کرتا ہوں اُس نذیر احمد سے کہہ دینا کہ نئے کپڑوں کے بدون اُس کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔" ہمارے مولٰنا بھی مولوی عبدالقادر صاحب سے مزاج میں کچھ کم نہیں تھے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے کیا معقول بات کہلا بھیجی ہے کہ "میں سرے سے عید کی نماز ہی نہیں پڑھوں گا۔"

ایک اَور نقل اُن ایام میں جس عید کا مذکور ہے ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ مولوی عبدالقادر صاحب افطار اور سحری کا بڑا اہتمام کرتے تھے عصر کے وقت سے افطار کا سامان کر چلتے۔ حوضِ قاضی یا باغ کا کنواں اور کئی ایک اَور کوئیں جو ٹھنڈے کوئیں مشہور تھے عین وقت پر وہاں سے پانی منگوایا جاتا اور کئی قسم کے شربت تیار ہوتے اور مولوی صاحب اپنے بال بچّوں کو بٹھا کر روزہ افطار کرتے ہمارے مولٰنا روزے کا وقت ٹال کر دروانہ کے تکیے پاس لب نہر پانی اور املی کی تتّیوں سے روزہ افطار کرتے۔ سارے رمضان کبھی مولوی عبدالقادر صاحب کے افطار میں شریک نہیں ہوئے یہ بات اِن لوگوں کو سخت ناگوار تھی۔ اِس پر طرّہ یہ ہوا کہ سحری کے وقت کبھی دودھ اور میٹھے چاول اور کبھی

لہ دہلی میں ایک حوض ہے جو مشہور حوض ہے یہاں ترکاریاں بکتی ہیں ۱۲ ۔ ۵ یہ ایک بڑھیا فقیرنی تھی نہر پر تکیے میں اکیلی پڑی رہتی تھی ۱۲

نان پاؤ اور دودھ اور کبھی دودھ جلیبیاں اور سوئیاں مولٰنا کے لیے سحری کے واسطے بھیجی جاتی تھیں۔ مولٰنا اکثر عذر کر دیتے کہ شام کا کھانا ہضم نہیں ہوا اور کبھی نرا خشکہ کھا لیتے اور دودھ واپس۔ اِسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً سسرال کا لحاف نہ اوڑھتے تھے اور اپنی پتلی سی رضائی میں سُکڑا کرتے تھے۔ مولٰنا کی ساس خدا بخشے مولٰنا کی اس تنک مزاجی سے ناخوش تھیں اور اپنے شوہر سے کہتیں کہ تم نے کیسے اکھل کھرے سے میری بیٹی کو بیاہ دیا۔ مگر مولٰنا اپنی فطرت سے مجبور تھے غیرت اُن کو اجازت نہ دیتی تھی کہ سسرال کی بدولت اللّلے تللّلے اُڑائیں۔ ہمارے مولٰنا کی بیوی بھی ان باتوں سے بہت ہی آزردہ خاطر رہتی تھیں۔ لیکن مولٰنا ان کو سمجھاتے رہتے تھے کہ تم اس کو میری ناخوشی اور ناراضامندی پر محمول نہ کرو خدا اپنی قدرت سے مجکو فارغ البالی دے گا تو تم دیکھ لوگی کہ میں تم کو کیسا خوش رکھتا ہوں اور یہ تنگ دستی ان شاء اللہ چند روزہ ہے تم کو بیدل نہ ہونا چاہیئے۔" وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں ہمارے مولانا کا مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ کئی کئی مہینے سے مدرّسوں کی تنخواہیں اور طالب علموں کے وظیفے بند تھے۔ اکونٹنٹ اور پرنسپل کے حساب کے متعلق کچھ بحث ہو رہی تھی اور یہاں مولٰنا کے پاس جو کچھ آمدنی سمجھیے ایک وظیفہ تھا یا چند روپے ماہوار اُوپر کی آمدنی۔

دہلی کالج کی تعلیم سے سُبک دوش ہونا اور وہاں کی تعلیم کا شکریہ

مولٰنا نذیر احمد صاحب نے جو کچھ علم و فضل حاصل کیا اُس کے مقابلے میں وہ کالج سے بڑھ کر باہر کی تعلیم کے بھی شکرگزار ہیں لیکن یہ شکریہ بھی کالج ہی کی طرف عود کرتا ہے۔ اگر کالج کے وظیفے کا مولٰنا کو سہارا نہ ہوتا تو وہ کسی طرح یہ شغل جاری نہیں رکھ سکتے تھے اگرچہ کالج نے عربی میں اُن کی کافی مدد نہیں کی اور اگرچہ بے مناسبتی کی وجہ سے اُنھوں نے سائنس کو شوق سے نہیں پڑھا تاہم بقول اُن کے یہ معلومات کی وسعت۔ رائے کی آزادی۔ ٹالریشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی۔ اجتہاد علی بصیرۃ۔ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقۃً میں شرطِ زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال متعصب اکھل کھرا۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا متجسّس۔ برخود غلط ؎ ترکِ دنیا بمردم آموزند ✣ خویشتن سیم و غلّہ اندوزند ✣ مسلمانوں کا نادان دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔ بہرا صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ[1] - مَا اَصَابَنِیْ مِنْ حَسَنَۃٍ فِی الدِّیْنِ اَوْ فِی الدُّنْیَا فَمِنَ الْکَالِجِ[2]۔" بات یہ تھی کہ ابتدائے عمر سے ہمارے مولٰنا کو علمی مذاق نشے کے عمل کی طرح چمٹ گیا تھا۔ اُن کو ہمیشہ تحصیلِ علم کی جمائیاں آیا کرتی تھیں اور اُس کا خمار بس کتاب کے سوا کسی چیز سے نہیں اُترتا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ہمیشہ کتب بینی فرماتے رہے۔ ملازمت کی حالت میں بھی یہ ذوق اُن کے دل سے نہ گیا پنشن کے بعد چاہیئے تھا کہ بے کار زندگی بسر کرتے مگر اُن سے یہ نہ ہو سکا جس کے شواہد اُن کی وہ کل تصنیفات ہیں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

غرض ہمارے مولٰنا مولوی نذیر احمد صاحب ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۳ء میں آٹھ برس ختم کر کے کالج سے باہر آئے اور اس طرح عالمِ متعلمی سے نکل کر عالمِ کاروبار میں قدم رکھ کر۔ کالج کو ہمیشہ کے لیئے خیرباد کہا ✣

---

[1] بہرے۔ گونگے۔ اندھے کہ وہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آسکتے ۱۲

[2] مجکو دینی و دنیاوی جو کچھ فائدہ پہنچا کالج کی بدولت پہنچا ۱۲

حصّۂ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۸۵۴ء لغایت ۱۸۷۶ء

ملازمت اگرچہ مولانا نذیر احمد صاحب کو ضیقِ معاش کی وجہ سے ملازمت کی طرف جلد متوجّہ ہونا پڑا۔ جلد اس سے کہا گیا کہ اُن کا شوقِ تحصیلِ علم ہنوز باقی تھا۔ ورنہ جناب ممدوح نے ٹھیک وقت پر ملازمت کا خیال کیا۔ ہمارے نزدیک ملازمت کا زمانہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ مولانا کو دہلی کالج سے وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ چناں چہ خود مولانا کہتے ہیں "مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اِس کو سلسلۂ ملازمت کا آغاز سمجھا"۔ اِس حساب سے گویا وہ اول اول چار روپے ماہوار کے وظیفہ خوار ملازم ہوئے۔ جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں کہ مولوی سعادت علی صاحب کا انتقال مولانا کے حق میں ایک مصیبت تھا اور خوش قسمتی سے اگر دونوں بھائیوں کے وظیفے کا سہارا نہ ہوتا جو خانہ داری کے مصرف میں بھی آتا تھا تو نہ معلوم آج یہ گوہرِ بے بہا کس حال میں ہوتا۔ آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ اِن دو کم سن لڑکوں پر پڑتا تھا کہ دونوں نے اِس کو ہمت اور استقلال کے جبّۂ ثقیل میں لٹکا کر اُٹھا لیا اور منزلِ مقصود پر آسانی سے پونہچا دیا۔ متعلمی کے زمانے میں مولانا کو ایک رقم جو اُن کی اُس وقت کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ بجنور میں بھی اپنے خاندان کی پرورش کے لیئے دینی پڑتی تھی۔ تو مولانا خارج از اوقاتِ مدرسہ پنجابیوں کے دو تین لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے جن سے چار پانچ روپے مل جایا کرتے تھے اور اسی کے قریب قریب مطبع العلوم سے کیوں کہ مولانا اُس کی عربی کتابوں کی تصحیح کر دیا کرتے تھے اور یوں مفت کے پڑھنے والے تو کالج کی دوم عربی جماعت تک کے طالبِ علم مولانا کے پاس آیا کرتے تھے۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد وہ پنجابی کٹڑے کی مسجد کی نکبت تو دور ہو گئی تھی مگر فارغ البالی اَب بھی نہ تھی۔ اب وہ وقت قریب آتا جاتا تھا کہ مولانا کا تعلّق کالج سے منقطع ہو۔ تو کالج میں تراجم عربی کا ایک فنڈ تھا کہ عربی کی جماعتِ اول کے طالبِ علم مطبع العلوم[1] کی عربی کتابوں کے ترجمے کرتے تھے اور اُن کو فی صفحہ کچھ اُجرت مِل جایا کرتی تھی۔ اِس فنڈ سے بھی ہمارے مولانا ہر مہینے کچھ نہ کچھ جھٹک ہی لیا کرتے تھے۔ ایک اَور قسم کی بھی آمدنی مولانا کو ہو جایا کرتی تھی وہ یہ کہ عربی فارسی کے چھوٹے کلاسوں کے مدرس اپنی ضرورتوں کی وجہ سے کالج سے غیر حاضر ہوتے تو درس دینے کے لیئے اُن کی جگہ اول جماعتِ عربی کا کوئی طالبِ علم بھیجا جاتا اور قواعدِ رخصت کے مطابق غیر حاضر مدرس

[1] یہ عربی کالج کا ایک مطبع تھا۔

کی تنخواہ کا ایک جزو اُس طالبِ علم کو ملتا جو غیر حاضر مدرس کی جگہ کام کرتا۔ چناں چہ اکثر اوقات مدرس غیر حاضر ہوتے اور بار ہا مولنا کا تقرر اُن کی غیر حاضری تک رہتا۔ اِس طریقے سے بھی مولنا کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے تاہم توکل کی سی آمدنی تھی اور مولنا اپنے مستقبل کے لئے پریشان سے رہا کرتے تھے الغرض تنگ دستی اور فرسودہ حالی کی وجہ سے قبل از ملازمت کبھی کبھی دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا تھا کہ میاں جیوں کی طرح مکتب کے لڑکے لے کر بیٹھ جاؤ اور اِس خیال میں اِس وجہ سے بھی تقویت زیادہ ہوتی تھی کہ مولنا میں معلمی کی قابلیت کامل طور پر موجود تھی۔ مگر چوں کہ مکتب کا جما لینا تھا دیر طلب کام اِس لیئے ہمت ہار بیٹھے تھے تاہم آغازِ ملازمت مکتب سے نہ سہی اسکول سے ہوا۔ مشہور تو یوں ہے کہ "طفل بہ مکتب نمی رود وے برندش"۔ مگر مولنا کے لیئے "معلم بہ مکتب نمی رود وے برندش"، ہو گیا۔

دہلی کالج کی تعلیم قریب الختم تھی کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضلع گجرات (پنجاب) میں چھ اسکول پنجاب گورنمنٹ نے کھولے اور دہلی کالج سے مدرس طلب ہوئے۔ دہلی کالج کے اسٹاف میں زیادہ معلم ہوتے تو بھیجے جاتے۔ ناچار متعلم معلم تجویز ہوئے۔ کیوں کہ یہ بھی لیاقتِ علم کی وجہ سے معلموں کے برابر پونہچ چکے تھے شدہ شدہ طلبی مدرسین کا حکم ہمارے مولنا کے کان میں پونہچا سنتے ہی فوراً دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کوشش وکاوش کر کے مقصد حاصل کرنا چاہیئے چناں چہ پرنسپل کے سامنے اُمیدوارانہ حیثیت سے پونہچے اور عرض کی کہ میرا نام بھی منتخب کیا جائے ❖

ضلع گجرات کی ملازمت

اِس کا اصل قصہ یوں ہے کہ مولنا کی طالب علمی کے آٹھ برس پورے ہونے کو تھے کہ اسی اثنا میں مسٹر رچرڈ ٹمپل جو آخر کو سر رچرڈ ٹمپل اور بمبئی کے گورنر ہو گئے تھے اُن دنوں گجرات کے ڈپٹی کمشنر تھے اُنھوں نے اپنے ضلع میں سررشتہ تعلیم جاری کرنا چاہا۔ ہندوستان کے بعض اضلاع آگرہ متھرا وغیرہ میں سررشتہ تعلیم قائم ہو چکا تھا مسٹر ٹمپل نے اِس کی مختصر نقل اپنے ضلع میں کرنی چاہی اور یوں آفتابِ علم کی پہلی کرن پنجاب کے ضلع گجرات پر چمکی۔ اُدہر ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب جو آخر کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک شمال ومغرب (حال ممالک متحدہ آگرہ واودھ) کہلائے جنرل وزیٹر آف ایجوکیشن تھے ٹمپل اور ریڈ میں باخود ہا کچھ خط وکتابت ہوئی ہوگی۔ ٹمپل نے ریڈ سے چھ مولوی مانگے دہلی کالج بھی ریڈ صاحب کا ماتحت تھا۔ ریڈ نے دہلی کالج کے پرنسپل کو لکھا کہ پنجاب کے لیئے چھ مولوی تیار کرو۔ ہمارے مولنا از خود توقع لگائے بیٹھے تھے کہ اُن چھ میں ایک میں ضرور ہوں گا کیونکہ وہ عربی میں اچھے طالب علم سمجھے جاتے تھے امتحانوں میں کبھی اول اور کبھی دوم رہتے تھے اِس کے سوا پرنسپل کو بھی معلوم تھا کہ ہمارے مولنا نوکری کے حاجتمند ہیں۔ اِن اسباب سے قطعی اُمید تھی کہ پرنسپل مولنا کو ضرور منتخب کرے گا۔ لیکن اس کو نامساعدتِ زمانہ کے سوا اور کیا کہنا چاہیئے کہ پرنسپل نے اَور لوگوں کو نامزد کر دیا اور مولنا مُونہ تکتے رہ گئے۔ مولنا کے شیشۂ دل کو پرنسپل کی اس ناانصافی نے چور چور کر دیا رنج والم کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ چناں چہ ایک موقع پر ہمارے مولنا نے اِس صدمے کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا بھی تھا۔ "اِس زندگی میں مجھ کو بھی اتفاقِ ناملائم پیش آئے ہیں مگر جس قدر رنج اُس[1] ناکامیابی کا مجھکو ہوا میں بیان نہیں کر سکتا میں سچ کہتا ہوں کہ اُس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے"

بہر حال منتخب شدہ لوگوں میں ایک مولوی ضیاء الدین[2] صاحب بھی تھے جو دوسری جماعت سے ترقی کر کے ہمارے

[1] یہ اشارہ ہے منتخب نہ ہونے کی طرف ۱۲ [2] مولوی ضیاء الدین صاحب نے بعد میں شمس العلماء خان بہادر۔ ایل ایل ڈی کے خطاب پائے۔ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے عرصے تک پنشن پاتے رہے۔ کوئی دو برس ہوئے حج کو گئے اور مکے شریف میں انتقال فرمایا ۱۲

مولٰنا کے ساتھ اول جماعت میں شامل ہو گئے تھے مگر عربی میں وہ کبھی مولٰنا سے بازی نہیں لے جا سکے۔ لیکن وہ دلی کے رہنے والے تھے اُن کے والد شیخ محمد بخش صاحب خاص دہلی کے تھانے دار تھے اور تھانے دار بھی اُن وقتوں کے تھانے دار شیخ محمد بخش صاحب نے پرنسپل سے مل کر بیٹے کی سفارش کی اور اُن کا انتخاب ہو گیا۔ اسی نام کے ایک ضیاء الدین صاحب اور تھے مگر یہ خواجہ ضیاء الدین کے نام سے مشہور تھے اور وہ شیخ ضیاء الدین کے نام سے۔ خواجہ ضیاء الدین صاحب مولوی سید محمد صاحب مدرس اول عربی کے رشتے دار تھے۔ غرض شیخ ضیاء الدین صاحب باپ کی سفارش سے اور خواجہ ضیاء الدین صاحب سید محمد صاحب کی سفارش سے پنجاب کے لئے منتخب ہوئے اور ان کے سوا چار اور منتخب ہوئے اور ہمارے مولٰنا موہنہ تکتے رہ گئے۔ بہرکیف چھ مولویوں کی کھیپ پنجاب روانہ ہوئی۔ شیخ ضیاء الدین صاحب نے رستے میں ہیضہ کیا اور دہلی واپس گئے۔ اب پرنسپل نے ہمارے مولٰنا کو بلایا اور کہا تم پنجاب جاؤ۔ مولٰنا جلے ہوئے تو بیٹھے ہی تھے انھوں نے نہایت ترشی سے جواب دیا اور تیسری جماعت کے کسی طالب علم کا نام لے دیا کہ اب اس کو بھیج دیجیے۔ یہ کہہ کر مولٰنا کو پرانا صدمہ یاد آ گیا اور فوراً رو دیئے۔ پرنسپل نے دل جوئی کے رومال سے آنسو پوچھے اور اصرار کیا تو مولٰنا نے عرض کیا کہ "ضرورت مجکو مجبور کرتی ہے کہ میں پنجاب جانا قبول کروں مگر بایں شرط کہ میرا جبتنا چڑھا ہے وظیفہ ہے مجکو دلوا دیجیے کہ وہ میرے زادِ راہ کے کام آئے گا"۔ پرنسپل نے ایسا ہی کیا اور مولٰنا پنجاب کی تیاری کرنے لگے ان دنوں بڑے زور کی برسات تھی جیسی سال پیوستہ [۱]سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی۔ مگر ضرورت کے آگے کوئی مشکل خیال میں نہیں آتی تھی مولٰنا ایک اپنا پردیسی شاگرد اور ہم عمر [۲]ساتھ لے ٹٹو کرایہ کر چلتے ہوئے سسرال والوں کو مولٰنا کے رمضان اور عید کے سلوک اور مدارات سے بدگمانی تو ہو ہی گئی تھی اب ان لوگوں نے سمجھا کہ بس اب یہ لڑکا گیا تو گیا دلی کی طرف اگر کعبہ بھی ہو تو ادھر کی طرف کو موہنہ کر کے نماز تک نہ پڑھے گا اور زیادہ مایوسی ان لوگوں کو اس وجہ سے ہوئی کہ مولوی عبدالقادر صاحب یہ منصوبے باندھ رہے تھے کہ اب یہ مدرسے سے الگ ہوں گے تو میں مولوی نذیر حسین کے مقابلے میں مسجد کی ایک محراب میں اپنے داماد کو جگہ دوں گا اور اس طرح یہ خاندان کے افتخار کا باعث ہوگا ؂

بہرحال مولٰنا اپنے شاگرد کو ساتھ لے کرایہ کے ٹٹو پر دہلی سے پنجاب کو روانہ ہوئے ۲۵ دن کے سفر کے بعد گجرات شاہ دولہ پونہچے۔ پٹیل صاحب سے ملے پٹیل نے مولٰنا کا چالیس روپے ماہانہ مقرر کر کے کنجاہ [۳]میں تعینات کر دیا ؂

صعوبت سفر مولٰنا کو منظوریِ ملازمت کا پروانہ ملنے کو تو مل گیا لیکن سفر کے پروگرام بنانے میں بڑی دقت پیش آئی ریل ہوتی تو نہ پروگرام کی ضرورت ہوتی نہ سردی و گرمی کی پروا کی جاتی۔ اگرچہ عمل داری بدل گئی تھی مگر دشواریاں نہیں بدلی تھیں۔ آنے جانے کی تمام راہیں خراب پڑی تھیں موسم بارش نے اور بھی دقتیں پیدا کر دی تھیں چناں چہ ایک جگہ مولٰنا بھی ان مصیبتوں کا رونا روتے ہیں "........ مگر میں پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ عمل داری کو بدلے ہوئے کچھ ایسی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی بھری برسات تھی ندی۔ نالے اور نالے دریا ہو رہے تھے اور دریا سمندر۔ ٹرنک روڈ (شاہ راہ) جاری تھی مگر چونکہ پل نہیں بننے پائے تھے گویا کہ بند تھی اور اس پر مزید اپنی ناتجربہ کاری ناداری اور بے سامانی۔ غرض وہ جو کتابوں میں سفر کی

---

[۱] مدتہ ہوئی انتقال فرما گئے ۱۲ [۲] ان کا نام قاضی ہاں تھا اسند ضلع کرنال کے رہنے والے تھے یہی مولٰنا کے رفیق تھے اور مولوی عبدالقادر صاحب کے خاندان میں قاضی برہان کی بھی خاص وقعت تھی چناں چہ مرتے دم تک وہ اسی خاندان میں لگے لپٹے رہے مدتوں مولوی عبدالحامد صاحب کے پاس رہے اب چند سال ہوئے کہ بیچارے قضا کر گئے ۱۲ [۳] غنیمت صاحب کنجاہی کا وطن ۱۲

نہ تھیں پڑھی تھیں اُن کی تصدیق ہو گئی +

الغرض ہنٹیل صاحب نے گنجاہ میں مولٰنا کو تعینات کیا وہاں از سرِ نو اُن کو مدرسہ جاری کرنا تھا۔ پنجابیوں اور سکھوں اور کشمیریوں کے لڑکے گھر گھر پھر کر جمع کیے اپنے ہاتھ سے اُن کو الف۔ بے۔ تے کی تختیاں لکھ کر دیں اور درس شروع ہوا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ نہیں بے دے ہیٹیاں ایک بندی لڑکے مولٰنا کی بولی نہیں سمجھتے اور مولٰنا لڑکوں کی۔ پوری اجنبیت دل بستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ مولٰنا یہ حال دیکھ کر اپنی قسمت پر سخت افسوس کرتے اور کہتے تھے کہ "وہ الٰہی اتنا پڑھ لکھ کر بھی حرف شناس منڈے میری تقدیر کے تھے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ مکتب کے لونڈے میاں جی کی عقل چر لیتے ہیں"+

لڑکے ۱۲

دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایک خط کی آمد و شد میں بارہ آنے خرچ ہوتے تھے اور کم سے کم پندرہ دن۔ لیکن جب تنخواہ آتی تھی تو وہ تمام رنجوں کی تلافی کر دیتی تھی +

ایک تھے کرنیل دھن راج وہ دیوان مول راج کے کچھ عزیز بھی تھے اور دیوان مول راج وہ جن کا پنجاب کی لڑائیوں میں نام آتا ہی کرنیل دھن راج کشمیر میں کسی بڑے عہدے پر تھے اُن کی رانی کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت تھی۔ رانی صاحبہ نے مولٰنا کو بلا کر کہا کہ میرے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرو۔ مولٰنا نے کہلا بھیجا کہ بچوں کو یہاں مدرسے میں بھیج دیا کرو رانی صاحبہ نے کہا کہ یہ ہماری عزت کے خلاف ہی مولٰنا نے کہا تو پھر ڈپٹی کمشنر سے کہہ کر مدرسے کا مدرس اپنے ہاں بٹھوا منگوائیے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اِس موقع پر مولٰنا فرماتے ہیں۔ کہ "اَب میں مدرسی میں ذرا خوش حال ہو چلا تھا بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا کرنیل صاحب کے خدمت گار ٹہل کو گھوڑے ٹٹو سواری کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر"

مولٰنا کی طبیعت کے چونکہ یہ بالکل برخلاف تھا کہ خود خوش و خرم اور بآرام رہیں اور اپنی اہلیہ وغیرہ کا کچھ خیال نہ کریں چناں چہ اپنے خاندان کے آرام کا جناب ممدوح نے یہ انتظام کیا کہ اتفاق سے سرکاری خزانے کا خزانچی دہلی کے خزانچی[1] کے منیم (منیب) تھے یعنی نائب مولٰنا نے اُن کی معرفت یہ انتظام کیا کہ ہر مہینے کے شروع میں اُن کی تنخواہ اُن کے گھر پہنچ جایا کرتی اور یہ انتظام مولٰنا نے اول ہی مہینے سے کر دیا تھا۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ جب مولٰنا دہلی سے گجرات روانہ ہونے کو تھے تو اُس سے قبل رمضان اور عید کی رسوم میں بعض باتیں سسرال والوں کی خلافِ مرضی مولٰنا سے صادر ہوئی تھیں جس سے اُن لوگوں کو یقین سا ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا گیا تو گیا۔ اب جو مہینے کے مہینے اِن لوگوں کو تنخواہ ملنے لگی تو ان سب کو بڑا تعجب ہوا۔ اِس موقع پر مولٰنا کی اہلیہ نے اپنے والدین سے کہا اور بجا کہا کہ "وہ اُن[2] (مولوی نذیر احمد صاحب) کی تنک مزاجیاں جو تم نے دیکھیں وہ اُن کی عسرت کی وجہ سے تھیں"۔ بایں ہمہ مولٰنا صوبہ پنجاب میں خوش دل نہ تھے وہاں کا قیام اُن کو سخت ناگوار تھا اور بُعدِ وطن کسی قدر دل پر شاق۔ وہاں زیادہ رہنا پسند نہ فرماتے تھے نیا شہر نیا دانہ نیا پانی اور اُس پر طرہ اجنبیت ؎ پائے در زنجیر پیش دوستاں + بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں۔ سر رشتہ تعلیم ان دنوں محض بے قدر بھی تھا اور مولٰنا اسی وجہ سے کچہری کی نوکری کی تلاش میں تھے۔ وہاں پنجاب میں اُن کو نوکری مل

[1] یہ خزانچی اَب تک بنک بنگال دہلی کے خزانچی تھے چار پانچ سال ہوئے اِن کا انتقال ہو گیا ۱۲

[2] ہندوستان میں علی العموم رواج ہے کہ بیبیاں اپنے شوہروں کا نام نہیں لیتی ہیں بلکہ اَور لوگوں سے جب اپنے شوہروں کا ذکر کریں گی تو کہیں گی کہ "وہ" "اُن کا مزاج بھی بڑا چڑچڑا واقع ہوا ہے" یا "وہ اپنی نوکری سے کل آئیں گے" غائب کی ضمائر استعمال کرتی ہیں نام نہیں لیتیں یہ "اُن" بھی اُسی قسم کا ہے ۱۲

ملتی تھیں مگر چالیس پچاس کی کوئی بھی نہیں۔ غرض وہ وہاں اتنے گھبرائے کہ دو برس کے اندر ہی اندر پنجاب سے بھاگ کھڑے ہوئے یعنی صوبجاتِ متحدہ میں عرضیوں کے گھوڑے تلاشِ ملازمت کی گاڑی میں جوت کر دوڑانے شروع کر دیئے مگر وہی اپنے ہی محکمے میں۔ اور وار تو خالی گئے مگر اجمیر کالج سے سو روپے کی عربی مدرسی پیش کی گئی اور کان پور سے اسی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری۔ استخارے کے طور پر دونوں نوکریوں کے مآل پر فال دیکھی تو ڈپٹی انسپکٹری نکلی جس کو آیندہ کی توقعاتِ ترقی پر قبول و منظور کر لیا۔

کان پور کی ملازمت

اب کنجاہ چھوڑ جناب مولانا دہلی روانہ ہوئے اور وہاں سے سیدھے کان پور پہنچ کر ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے سے ممتاز ہوئے کان پور میں جب مولانا اول بار ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوتے تو کپتان فلر صاحب انسپکٹر مدارس حلقہ دوم تھے کان پور بھی اُن کے ماتحت تھا وہ اپنے میر منشی مولوی وجیہ الزمان (یا وجیہ الدین) سے مشرقی زبانیں پڑھتے تھے مولوی صاحب تھے بنگالی۔ اور بنگالیوں کی جیسی اُردو ہوتی ہے وہ انسپکٹر صاحب کے پروانوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ ہمارے مولانا کے ہاں سے جو پروانوں کے جواب یا رپورٹیں جاتیں اُن سے میر منشی صاحب کو پتا لگا کہ ڈپٹی انسپکٹر صاحب بہت اچھی اُردو لکھ سکتے ہیں فلر صاحب کو تصنیفات کا بھی بہت شوق تھا تو وہ اپنی تصنیفات میں منشی صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ میر منشی صاحب کی تقریب سے وہ تصنیفات اصلاح کے لیئے ہمارے مولانا کے پاس آنے لگیں۔ اِس اعتبار سے مولانا تمام ڈپٹی انسپکٹروں میں سر برآوردہ سمجھے جانے لگے مگر فلر صاحب فوجی آدمی تھے اور کسی قدر غصیلے بھی تھے۔ وہ ایک مرتبہ بتقریبِ دورہ ضلع کان پور میں آئے مدرسہ بھوگنی پور میں امتحان کا جلسہ منعقد ہوا مولانا نذیر احمد صاحب اِن دنوں پان بہت کھایا کرتے تھے۔ اِن سے یہ غلطی ہوئی کہ جلسۂ امتحان میں پان کی گلوری کلے میں دبائے شریک ہو گئے۔ فلر صاحب نے اِس کا بہت بُرا مانا اور جب وہ امتحان کے بعد اپنے خیمے میں جانے لگے تو مولانا اُن کی مشایعت کے لیئے اُن کے ہمراہ تھے۔ اکیلے ہوتے تو مولانا کو درشت الفاظ میں ملامت کی۔ بھلا مولانا کو اتنی کہاں تاب۔ اگلے ہی دن جھٹ استعفا دے دیا۔ استعفے کا دینا تھا کہ ایک اَور سانحۂ عظیم برپا ہوا یعنی ۱۸۵۷ء سالِ غدر دھم سے آ کودا۔ مولانا فرماتے ہیں "جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ کُنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ مُنڈوں کو بیٹھے بیٹھے کراؤ۔ مگر یہاں بھی قریب قریب ہماں آش در کاسہ بیچے نہ کراؤ پہاڑے سُنتے بھروا نتنے میں نو باراں فراموش کردند کا وقت آ گیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی نوکری اور کیسا پڑھنا جینے کے لالے پڑ گئے"۔ غرض فلر کی درشتی پر مولانا استعفا دے ہی چکے تھے اُنھوں نے بھی ترکی بترکی جواب دیا ہوگا۔ سُنا ہے کہ قبل استعفے کے اُس نے مولانا کی برخاستگی کی رپورٹ کر دی تھی۔ لیکن اس واقعے کے تھوڑے دنوں بعد غدر ہو گیا۔ مولانا کو اپنی برخاستگی کی تفتیش کرنے کی کوئی ضرورت واقع نہ ہوئی اور کان پور سے بھاگ کر دلّی جا کر دم لیا۔ سچ کہا ہے جان بچی لاکھوں پائے۔

مولانا کا ایک میم کی جان بچانا

دہلی جا کر ابھی مولانا نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ وہاں ایک اَور قضیۂ نامرضیہ پیش آیا یعنی وہی ۱۸۵۷ء کا غدر۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ مولانا کی سُسرال جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے مولویوں کے خاندان میں تھی ان میں بعض تو متوسلانِ شاہی تھے اور بعض متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مولوی عبد القادر صاحب کی طبیعت کبھی ناد رست ہوتی تو اپنی جگہ ہمارے مولانا کو بھیج دیتے یوں چند بیگموں اور شاہزادوں سے مولانا کی بھی شناسائی ہو گئی تھی۔ بیگموں میں محمدی بیگم اور فخر الملک ولی عہد کی دوسری بیگم اور خود بادشاہ کی بیگم نواب تاج محل کے ساتھ ایک خاص خصوصیت تھی نواب تاج محل نے

مولٰنا سے مثنوی نل دمن کا ایک حصہ بھی پڑھا تھا۔ محمدی بیگم مولوی عبدالقادر صاحب کو باپ اور مولٰنا کی بی بی کو خلیفہ کہا کرتی تھیں۔ ہوا غدر تو نواب تاج محل نے مولوی عبدالقادر صاحب سے کہا کہ میری چھوٹی بہن کو جو بیرون قلعہ چیلوں کے کوچے میں رہتی ہیں مع احمال و اثقال قلعے میں لوالاؤ اس کام کے لیئے شاہی گاؤ خانے سے چھکڑے تعینات ہو گئے مسجد فتح پوری کے طالب علم اس کام کے سرانجام پر مامور ہوئے۔ دہلی کالج سے پورب کی طرف میگزین تھا۔ تھوڑے فاصلے پر میگزین کے دو حصے تھے ایک حصہ ورک شاپ کہ وہاں اسلحہ وغیرہ بنائے جاتے اور دوسرے حصے میں جو اصل میگزین تھا ترتیب دے کر سجا دیئے جاتے۔ ورک شاپ اور میگزین کے بیچ میں سڑک تھی اب بھی ہے۔ ورک شاپ تو کھد کھدا کر ریل میں آ گئی۔ میگزین کی جگہ ڈاکخانہ ہے۔ ایک دن چھوٹی بیگم کے اسباب کی آخری کھیپ قلعے میں پہنچا کر مسجد کے طالب علم جو اس کام پر مامور تھے مغرب سے پہلے اور شاید تیسرا یا چوتھا روزہ بھی تھا واپس آ رہے تھے اور باوجودے کہ چہل پہل کا وقت تھا قلعے سے لے کر پنجابی کٹرے تک ایک سناٹا تھا۔ واپسی کی وہی راہ تھی جو ورک شاپ اور میگزین کے بیچ میں تھی۔ میگزین سے گزر کر کالج کے سامنے تھوڑا سا میدان پڑا تھا دیکھتے کیا ہیں کہ باغی تلنگوں نے انگریز قیدیوں کو جمع کر کے باڑ ماردی ہے غالباً ہمارے مولٰنا کے آنے سے تین چار گھنٹے پہلے انگریزوں کی لاشیں جن میں چند میمیں بھی تھیں بے حرمتی کی حالت میں بکھری پڑی تھیں۔ ہر ایک مردے کا خون نکل کر بہ رہا ہے اور سب کے چہروں پر مردنی کی سفیدی چھائی ہوئی ہے مگر ایک عورت مسن سین کہ اس کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی زندہ ہے اس کو اٹھایا وہ زخموں کی وجہ سے بے ہوش تھی اٹھائی گئی تو بولی "واٹر" محمد منیر اور محمد شعیب دو ولایتی پشاور کی طرف کے رہنے والے تھے اور تیسرے ہمارے مولٰنا۔ منیر نے چاہا کہ زخمی میم کا کام تمام کر دیا جائے۔ مولٰنا نے اور شعیب نے منع کیا۔ اس وقت افطار کا وقت ٹل گیا تھا۔ صلاح یہ ہوئی کہ کہیں سے اس کو پانی پلانا چاہیئے۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد کے سامنے شیخ رمضانی مولٰنا کے ایک دوست رہتے تھے ہمارے مولٰنا نے شعیب سے کہا تم یہیں کھڑے رہو۔ میں شیخ رمضانی کے ہاں سے پانی لاتا ہوں۔ شیخ رمضانی کے مکان پر مولٰنا پہنچے تو دروازہ اندر سے بند پکارا تو شیخ رمضانی نے اندر سے آواز دی کہ تم اس وقت کہاں؟ مولٰنا نے کہا کہ تم جلدی سے مجھے روزہ افطار کرنے کے لیئے پانی دو۔ شیخ رمضانی نے کہا کہ میں نے اندر سے پتھر اڑا رکھے ہیں دروازہ تو میں کھول نہیں سکتا۔ اچھا ذرا کی ذرا دم لو۔ میں بانس کے ذریعے سے باہر کی طرف کو لوٹا لٹکائے دیتا ہوں چنانچہ اُنھوں نے شربت کا لوٹا اوپر سے تخم ریحان اور فالودہ پڑا ہوا لٹکایا مولٰنا لوٹا لے میم کے پاس پہنچے۔ شعیب اور منیر کھڑے ہوئے تھے میم کو اٹھا لوٹے کی ٹونٹی اس کے مونھ سے لگا دی۔ میم کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش۔ مگر اس نے شربت خوب ڈگڈگا کر پیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بھی کھولیں شعیب اور منیر اور مولٰنا کو کھڑا دیکھا تو باغی سمجھ کر ڈری اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آخر شعیب نے اس کو اپنی چڈھی پر لیا اور یہ تینوں میم سمیت پنجابی کٹرے کی طرف روانہ ہوئے۔ رستے بھر کوئی متنفس نہیں ملا۔ لوگ مارے ڈر کے شیخ رمضانی کی طرح گھروں میں مغرب سے پہلے بند ہو گئے تھے۔ یہاں مولوی سید نذیر حسین صاحب کا ایک مکان زیر تعمیر تھا اور غدر ہو جانے کی وجہ سے مدد بند کر دی گئی تھی۔ اِس وقت اس کے سوا کچھ نہ سوجھی کہ میم کو اسی ادھورے مکان میں ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ دروازے میں تختے اڑا دیئے اور ہمارے مولٰنا نے دوڑے دوڑے جا مولوی عبدالقادر صاحب کو خبر دی

اور اُنھوں نے مولوی نذیر حسین[1] صاحب کو کہ یہی لوگ خاندان میں بڑے بڑے تھے شعیب منیر اور مولٰنا تو میم کو مولویوں کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ مسجد میں سیکڑوں جہادی بھرے ہوئے تھے مولویوں نے دو بوڑھے آدمی اپنے اعتبار کے متعیّن کر دیئے۔ زخموں کا علاج یہ کیا کہ کپڑا بھگو کر زخم پر رکھ دیا اور پانی ٹپکانا شروع کر دیا۔ مولویوں نے میم کے کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ میم نوجوان لڑکی تھی کوئی ۲۰-۲۲ برس کی عمر ہوگی مولٰنا نذیر احمد صاحب یا اُن کے ہم سن لڑکوں کو اُس کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی صرف رازداری کا حکم تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ مولویوں نے زنانے کپڑے بھی میم کو پہنا دیئے تھے اور مولوی عبدالقادر صاحب جو حکیم بھی تھے چپکے چپکے اُس کے زخموں کا علاج بھی کرتے رہے۔ بڑا سخت زخم پیٹ کا تھا نہیں معلوم سنگین گھسیڑ دی تھی یا اُچٹتی ہوئی گولی لگی تھی اُوپر کی جلد پھٹ گئی تھی خون کی وجہ سے خوب تمیز نہیں ہوتی تھی۔ یہ عورت مسٹر لیبن کی بی بی تھی اور وہ پرمٹ کے پٹرول تھے یہ میم اپنے باپ سے ملنے دلّی آئی تھی اور وہ مہتمم خزانہ تھے مسٹر لیبن آگرے کے قلعے میں تھے اور اس میم کے دو بچے بھی باپ کے پاس تھے۔ بہرکیف میم کا علاج ہوتا رہا اور اُس کے کل زخم اچھے ہو گئے یہ ہندوستانی لباس میں رہا کرتی تھی ہاتھوں میں مہندی لگوا دی چوڑیاں پہنا دیں اور ہندوستانی عورتوں کی طرح اُس کی چوٹی بھی گوندھی گئی دونوں مولوی آنکھ بچا کر اُس کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے تھے اگرچہ میم پوری آسایش سے رہتی تھی اور دو بوڑھے مولویوں کے سوا کوئی اُس کے پاس جانے نہیں پاتا تھا بایں ہمہ وہ میم اپنے مستقبل کی طرف سے بہت پریشان رہتی تھی اُس نے دہلی کا غدر دیکھا اور اُس کو بالکل یقین تھا کہ اُس کا شوہر بچوں سمیت آگرے میں ضرور مارا گیا ہوگا اُس نے اپنے باپ کو گولی سے ہلاک ہوتے اپنی آنکھوں

---

[1] مولوی سید نذیر حسین صاحب کی سوانح عمری حیاۃ بعد المماۃ کے نام سے چھپ گئی ہے۔ اس میں مسز لیبن کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے "عین حالتِ غدر میں جب کہ ایک ایک بچہ انگریزوں کا دشمن ہو رہا تھا مسز لیبن ایک زخمی میم کو رات کے وقت میاں صاحب اُٹھوا کر اپنے گھر لے آئے۔ پناہ دی۔ علاج کیا۔ کھانا دیتے رہے۔ اُس وقت اگر ظالم باغیوں کو ذرا سی خبر ہو جاتی تو آپ کے قتل اور خانماں بربادی میں دیر نہ لگتی۔ طرّہ اُس پر یہ تھا کہ پنجابی کٹرے والی مسجد میں باغی دخل کیئے ہوئے تھے۔ مگر ساڑھے تین مہینے تک کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ حویلی کے مکان میں کَے آدمی ہیں۔ ساڑھے تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا تب اِس نیم جان میم کو جو اب بالکل تن درست اور توانا تھی۔ انگریزی کیمپ میں پُہنچا دیا۔ جس کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو روپیہ ملا۔

اِس کے بعد مؤلف حیاۃ بعد المماۃ لکھتے ہیں کہ میاں صاحب (مولوی نذیر حسین صاحب) اِس واقعے کو خود اس طرح فرماتے تھے کہ "اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا ملّا محمد صدیق پشاوری جو اُس وقت مجھ سے اُصولِ فقہ پڑھتا تھا ساتھ تھا۔ مجکو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز معلوم ہوئی۔ مَیں اُس آواز کی جانب بڑھا جب قریب پُہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح رو رہی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ مَیں نے اُس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت کسی قوم کی عورت اور بچوں کی جان مارنا یا تکلیف دینی حرام ہے۔ تم اپنی جان سے پوری طرح اطمینان رکھو اور اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں اور تمھارے زخم کا علاج اور تیمارداری کریں مگر چوں کہ وہ بہت ڈری ہوئی تھی کہنے لگی کہ اول تو ہم اپنے پاؤں سے چل ہی نہیں سکتے۔ مَیں نے کہا کہ اچھا ہم لوگ تم سے کچھ دُور پر ٹھہرے ہیں رات کو اندھیرے میں تم کو اُٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور مُلّا صدیق اُٹھا کر اُس کو ایسے رستے سے لائے کہ کسی فردِ بشر کو اُس کی خبر بھی نہ ہوئی اور گھر میں لا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلومہ ہے اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیئے کہ موجبِ خوشنودی خدا اور رسول ہے۔ اس میم کو مَیں نے باغیوں کے باہر رہنے کی خبر بھی نہ دی۔ کیوں کہ خبر ہو جانے پر اُس کے وہ ساڑھے تین مہینے نہایت ہی تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے۔ فرماتے تھے کہ وہ موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھری میں بند رہتی۔ ہرچند میری اہلیہ اُس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں بیٹھ مگر وہ ڈر سے کوٹھری کے باہر نہ آتی اور اُس گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اُٹھائے دعا کرتی تھی کہ ای اللہ میرا قصور معاف کر"۱۲

سے دیکھا تھا جب وہ اپنی داستانِ غم و الم بیان کرتی تھی خود روتی تھی اور دوسروں کو رُلاتی تھی تلنگوں نے اُس کے دو بچے ایک لڑکا کوئی آٹھ دس سال کا اور ایک دودھ پیتی لڑکی اُس کے سامنے بہت بے رحمی اور سفاکی سے مار ڈالے۔ لڑکا ڈر کر ماں کو لپٹ گیا اُسے گھسیٹ کر اُس کا تو سر اُڑا دیا اور گود کی بچی کو کھینچ کر اُس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیا۔ اللّٰھم احفظنا۔ غرض اِس ہنگامے میں باہر کی خبروں کا آنا جانا بالکل بند تھا۔ ایسی حالت میں مس کو اِس کے سوا اَور کیا خیال آسکتا تھا کہ مولوی لوگ ماما یا لونڈی بنا کر رکھیں گے وہ نہایت مایوسی کی حالت میں تھی مگر اُس کے مزاج میں طنطنہ وہی تھا جو ایک قوم فاتح کی لیڈی میں ہونا چاہیئے۔ اب میم کی رہائی کا وقت قریب آتا جاتا تھا اُس نے از خود مولویوں سے کہا کہ "یہ گولہ باری جو رات دن ہوتی رہتی ہے بے شک انگریز مقابلے میں ہوں گے شمال کی طرف سے مقابل کے گولے آتے ہیں مَیں خیال کرتی ہوں کہ انگریزوں کی چھاؤنی تک انگریز پنجاب سے آپہنچے اور وہی گولے برساتے ہیں تو کسی طرح اتنی بات تحقیق کر دو کہ میرا یہ خیال صحیح ہے یا نہیں"

میم کے پناہ دینے میں ایک بڑی مشکل رازداری کی تھی تو مولویوں نے مولٰنا نذیر احمد صاحب اور شعیب اور منیر کے سوا چوتھے کسی کو خبر نہیں ہونے دی اور یہ سب کچھ بتقاضائے دین داری تھا۔ مسجد میں جہادی بھرے ہوئے تھے اگر کہیں میم کی پناہ دہی ہونے کی ذرا بھی ہوا چھوٹتی تو نہ صرف مولویوں کے گھر بلکہ سارا محلہ باغیوں نے توپوں سے اُڑا دیا ہوتا۔ ایک دفعہ کچھ اُڑتی پڑتی خبر اُڑ گئی تھی کہ مولویوں نے کسی میم کو چھپا رکھا ہے باغی دَرّاتے گھر میں گھس پڑے۔ میم کو رات دن کوٹھری میں چھپائے رکھتے تھے اُس وقت جھٹ پٹ اُپلوں کی کوٹھی میں چھپا دیا اور اُوپر سے اُپلے چُن دیئے باغیوں نے اِدھر اُدھر گھر کی تلاشی لی اور چلتے ہوئے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ میم کے تقاضا کرنے سے شعیب اِس بات کے واسطے منتخب ہوا کہ وہ رستہ کتراتا ہوا چھاؤنی کی خبر لائے چنانچہ شعیب نے کوئی ایک مہینے کے بعد آکر خبر دی کہ انگریز اور سکھ اور کچھ ولایتی چھاؤنی پر قابض ہیں اور شعیب کو اپنے ہم وطنوں کے ذریعے سے انگریزوں کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے کہ اُنھوں نے حکمتِ عملی سے پنجاب میں بغاوت نہیں ہونے دی اور جو پلٹنیں اور رسالے مشتبہ تھے اُن سے ہتھیار رکھوا لیئے اور جن لوگوں کی وفاداری اور خیر خواہی پر پُورا اعتماد تھا اُن کو ساتھ لے کر دہلی کے محاصرے کے لیئے چل کھڑے ہوئے اِدھر باغیوں کو خبر لگی تو اُنھوں نے دہلی کے باہر نکل کر علی پور[1] تک مورچہ بندی کر دی۔ شہر کی فصیل پر توپیں چڑھا دیں شہر سے علی پور تک تین یا چار مورچے تھے۔ سب سے اخیر مورچہ علی پور کا۔ پھر بادلی کی سرائے کا۔ پھر سبزی منڈی کا۔ پھر قدسیہ باغ کا۔

باغیوں کو ایک عجیب طور پر انگریزوں کی آمد کی خبر لگی کہ غدر ہونے کو ہوا تو دہلی کا کوتوال تھا لچھو سنگھ وہ دہلی کا رہنے والا تھا اور اُس کا سارا خاندان دہلی میں تھا وہ غدر ہوتے ہی کسی تدبیر سے بھاگ کر پنجاب میں انگریزوں سے جا ملا اب جو دھاوے اور محاصرے کی ٹھیری تو لچھو سنگھ رسد رسانی کی خدمت پر مامور ہوا تھا یہ بدنصیب یہاں آیا اور پکڑا گیا اِس کے پاس پروانے نکلے اور اب باغیوں کو یقین ہو گیا کہ انگریز چڑھے چلے آرہے ہیں ورنہ شہر میں افواہ تو یہ تھی کہ انگریزوں کا بیج مارا گیا۔ ایک زمیندار نے آکر یہ خبر دی کہ سڑک پر چار گورے دیکھے اُن کے پاؤں زخمی تھے اور وہ بھیک مانگتے آرہے تھے اور گڑگڑا کر کہتے تھے کہ ہمیں کھانے کو دو ہم مسلمان ہوتا ہے اسی طرح میمیں منتیں سماجتیں کرتی تھیں کہ ہم کو مت مارو ہمیں لونڈی بنا کر رکھو ہم مسلمان ہوتے ہیں مگر یہ نالائق کب ماننے والے تھے چُن چُن کر ایک ایک کو سخت بے رحمی سے تہ تیغ کیا ؛

[1] علی پور دہلی سے چھ سات میل کے فاصلے پر واقع ہے ٹرنگ روڈ پر ۱۲

سُنا ہی کہ آدھی رات کے وقت انگریزی فوج میں خلل ہوا وہ لوگ بھی علی پور پر ٹھیرنے کو تھے جب معلوم ہوا کہ علی پور پر باغی قابض ہیں تو انھوں نے تین میل پیچھے ہٹ کر پڑاؤ کیا تو باغیوں کے مقدمۃ الجیش نے آواز سن کر جانا کہ انگریز آگے کو بڑھے - سُنا ہی کہ انگریزوں نے ایک رسالے کے رسالے پر اشتباہ کر کے اُسی رات اُن سے ہتھیار رکھوا لیے اور اُن کی جگہ خیر خواہان بلا اشتباہ کا ایک نیا رسالہ مرتب کیا تھا - اور اُن کے سواروں کو سکھا دیا تھا کہ تم لوگ بیدھڑک دین دین کہتے ہوئے باغیوں کے سنٹر میں گھسے چلے جاؤ - باغی لوگ اِس دھوکے میں آ گئے اور انھوں نے اِس مصنوعی رسالے کو اپنے سنٹر میں آنے دیا جب وہ لوگ سنٹر میں داخل ہو گئے تو اُنھوں نے اپنی ساتھ کی توپوں پر بتّی رکھ دی - یہاں باغیوں میں ارباب نشاط کے جلسے ہو رہے تھے توپوں پر بتّی کا رکھنا تھا کہ اِدھر سے کئی ہزار آدمی جو توپوں کی زد میں تھے ہلاک ہوئے اور پھر بھاگڑ مچی اگر انگریز تعاقب کرتے ہوئے چلے آئیں تو اُسی روز دہلی فتح ہو جاتی بیچ کے مورچے والوں نے علی پور والوں کو بھاگتا دیکھ کر کچھ مقابلہ نہیں کیا - مگر انگریزوں نے از خود بایں خیال کہ شہر میں باغی بھرے ہوئے ہیں چھاؤنی ہیڈ پر سے ڈال دیے ورنہ بلا مزاحمت قلعے پر قبضہ کر سکتے تھے یہاں اُن کا کوئی روکنے والا نہ تھا - اب طرفین سے گولہ باری شروع ہوئی دن کے وقت نہ تو انگریزی گولوں کی آواز اچھی طرح سُنائی دیتی تھی اور نہ گولہ آتا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر رات کو تو انگریزی توپوں کی رنجک تک اچھی خاصی طرح نظر آتی تھی اور گولے بھی لال انگارے کی طرح جلتے ہوئے سوجھ پڑتے تھے -

مولوی پنجابی کٹرے میں رہتے تھے شہر کی شمالی فصیل کے قریب اور اسی اعتبار سے ہمارے مولنا کا محلہ انگریزوں کے گولوں کی زد پر تھا جنوبی حصے میں شہر کے رہنے والے محفوظ تھے غرض کئی مہینے تک دن رات طرفین سے گولے چلتے رہے میم جو مولنا کی سُسرال والوں کی پناہ میں تھی اب وہ بہت گھبرانے لگی اور اُس نے مولویوں سے کہا جس طرح ہو سکے میری چٹھی انگریزوں تک پہنچاؤ مولویوں نے قرآن کی شیرازہ بندی توڑ کر میم کی چٹھی قرآن میں داخل کر دی اور شعیب اُس قرآن کو لے کر انگریزی کیمپ میں پونہچا اور جس طرح میم کی چٹھی لے گیا تھا اُسی طرح اُس کا جواب لایا کیمپ سے میم کو جو پہلی چٹھی آئی تھی اُس کا غالباً یہ مضمون تھا کہ ابھی تک ہم لوگ دشمنوں کے حملوں کو ہٹا رہے ہیں قلعہ شکن توپیں منگوائی گئی ہیں وہ پُہنچ جائیں تب ہمارے دھاوے شروع ہوں اُس وقت تک جہاں ہو چپ چاپ بیٹھی رہو - جب ہماری طرف کے گولے جامع مسجد کے پار جانے لگیں یا قلعے میں گرنے شروع ہوں تو جاننا کہ توپیں پونہچ گئیں تمھارا آدمی سولھویں دن کیمپ میں پونہچا اور اُس کے بیان سے معلوم ہوا کہ اُس کو راہ میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں جن صاحب کے گھر میں تم نے پناہ لی ہی اُن کے تفصیلی حالات اور اُن کے مکان کا پتہ سب تمھارے آدمی سے دریافت کر لیا گیا ہی اُن پر سرکار اور تمامی سرکاری عہدہ داران ملکی و فوجی کی احسان مندی کما حقہ طور پر ظاہر کر دینا اور یقین ہی کہ وہ اُن تمام وعدوں سے جن کا اس وقت کر لینا بہت آسان ہی اس کی بہت زیادہ قدر کریں گے " شاید تین یا چار چٹھیوں کی آمد و رفت ہوئی اور انگریزوں کو شعیب کا اعتبار بھی ہو گیا - آخر انگریزوں نے شعیب کی زبانی کہلا بھیجا کہ میم کو ہمارے کیمپ میں پہنچا دو اور شاید میم کے نام بھی چٹھی آئی ہو بہر حال ایک دن قرار پایا اور یہ ٹھیری کہ میم کو بھیر کے رستے سے لے جانا تو خطرناک ہی اس میں کئی دن لگیں گے اور ممکن ہی کہیں یہ عورت پہچانی جائے شعیب کوہستانی علاقے کا رہنے والا تھا اُس نے یہ رائے دی کہ شہر کے باہر رات کے وقت میں ایک مقام پر چٹ لیٹ جاؤں گا اور میم میری پیٹھ پر چڑھ جائے میں اُس کو ناک کی سیدھ انگریزوں کے سرے کے مورچے پر پونہچا دوں گا - گولے اِدھر اُدھر آتے جاتے رہیں گے ہم نیچے نیچے صحیح سلامت پونہچ جائیں گے - شعیب نے یہ بھی کہا کہ سرے کے مورچے پر مجھے معلوم ہی ولایتی ہی ہیں میں دور سے اُن کے ساتھ پشتو میں باتیں کر لوں گا اور میں اُس انگریز سے

جس کے پاس سے چٹھیاں لاتا جاتا تھا کہ بھی آیا ہوں کہ کیمپ میں ہم کا آنا اس طرح پر ہو گا تو تم مورچے والوں کو خبر کیے رہو جن دنوں کا یہ واقعہ ہے باغیوں نے شہر کے دروازوں پر بڑی سختی کر رکھی تھی لوگوں کو بڑی مشکل سے باہر جانے اور اندر آنے دیتے تھے۔

مولویوں نے تو یہ کیا تھا کہ شاہی رتھ خانے سے ایک رتھ مانگ کر لائے جو اُن کو آسانی سے مِل گئی اور یہاں مغرب سے کچھ پہلے رتھ میں میم کو بٹھایا اور اُس میں مولوی عبدالقادر صاحب کی بیٹی مولٰنا کی سالی اور مولوی نذیر حسین صاحب کی بیٹی کہ وہ بھی مولٰنا کی سالی ہوئیں اور مولوی عبدالقادر صاحب کی خالہ بیوہ اور ۲ یا ۳ بچے سب رتھ میں بھر گئے سب کے بیچ میں میم دبی جھکی بیٹھ گئی رتھ کے ساتھ شعیب تھا جب لاہوری دروازے پر یہ لوگ پونہچے تو پہرے والوں نے پردہ اُٹھا کر تلاشی لینی چاہی اُن سے یہ عذر کیا گیا کہ مولویوں کی بہو بیٹیاں ہیں قدم شریف منّت اُتارنے جاتی ہیں اور ابھی چھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ کر آئیں گی۔ مولویوں کا نام سُن کر باغیوں نے کاوش نہیں کی اور رتھ کو نکل جانے دیا +

جب سے میم مولویوں کی پناہ میں آئی تھی ہمارے مولٰنا کو اُس تک جانے کی اجازت نہ تھی جس دن کیمپ میں جانے کو ہوئی تو مولٰنا سے زنانے مکان میں ملاقات ہوئی۔ میم نے مولٰنا کا بہت شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئی لیکن اور تفصیلی حالات جب سے کہ وہ مولویوں کے زنانے مکان میں آئی تھی مولٰنا کو اپنی اہلیہ سے معلوم ہوتے رہتے تھے +

غرض شعیب کے گئے پیچھے کوئی دو ہفتے تک سنّاٹا رہا۔ آخر وہ دن آیا کہ انگریزوں نے شہر پر دونوں طرف سے حملہ کیا ایک لاہوری دروازے کی طرف سے اور دوسرا کشمیری دروازے کی طرف سے باغی اپنی بے تدبیری سے کشمیری دروازے کا مورچہ خالی چھوڑ کر لاہوری دروازے پر جمع ہو گئے انگریزوں نے کشمیری دروازے پر زور ڈال کر باہر کی طرف سے کچھ آدمی اندر کی طرف کود پڑے کمند لگائی ہو گی یا اور کوئی عمل کیا ہو گا۔ کودنے والوں نے پتھر جو اڑار کھے تھے ہٹا کر دروازہ کھول دیا اور فوج اندر آگئی۔ یہی وہ موقع ہے کہ نکلسن[1] صاحب کمانڈنگ افسر جو اس دستہ فوج کے قائد الجیش تھے کسی باغی کی گولی سے زخمی ہوئے زیر ناف گولی لگی اور آخر کو مُہلک ثابت ہوئی۔ یہ دستہ کشمیری دروازے سے سیدھا قلعے کو چلا جب پن چکیوں[2] کے قریب پونہچا تو منصور علی خاں[3] کی حویلی کے پیچھے کچھ باغی گھات لگائے بیٹھے تھے جوں ہی یہ دستہ موڑ پر آیا باغیوں نے بندوقیں داغ دیں دستہ منتشر ہو گیا۔ شام ہو گئی تھی جہاں جس کے سینگ سمائے خالی مکانات میں پناہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اب شہر میں لڑائی شروع ہو گئی اور باغی قلعہ کی طرف کو پیچھے ہٹنے شروع ہوئے مولٰنا کا سسرالی مکان لبِ سڑک تھا اور ان مولویوں نے بھی چاروں طرف کے کواڑ بند کر کے پتھر اڑار کھے تھے کوئی ڈیڑھ پہر رات گئی ہو گی کہ ایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سڑک پر سُنائی دی اور ایک سوار کو چلّاتے سُنا کہ "مولویوں کا مکان کون سا ہے" مولویوں میں سے کسی نے کواڑ کے پاس جا کر سوار سے پوچھا کہ "تمہارا کیا مطلب ہے" اُس نے کہا کہ "جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر کچھ رات رہے سے

---

[1] جنرل نکلسن۔ اِن ہی کا بت لارڈ کرزن نے بطور یادگار قدسیہ باغ میں جو بیرونِ کشمیری دروازہ ہے استادہ کر دیا ہے جن کے ہاتھ میں ایک شمشیر برہنہ ہے اور اُن کی گردن کشمیری دروازے کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ گویا فتحِ دہلی اور دھاوے کا اشارہ کر رہے ہیں ۱۲

[2] جامع مسجد اور قلعے کے درمیان شمالی حصے میں ایک مقام ہے جہاں نہر کے پانی کے زور سے چکیاں آٹا پیستی ہیں ۱۲

[3] پنچکیوں کے قریب ہی یہ حویلی اُن وقتوں میں تھی اَب نہیں ہے ۱۲

اس محلّے پر دھاوا ہوگا"

غرض بڑی بدحواسی سے مولوی مع بال بچوں اور عورتوں کے کوٹھوں کوٹھوں کابلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں صبح سے پہلے پہلے دَن کی طرف بھاگے ان میں ہمارے مولانا بھی شریک تھے اس وقت کی پریشانی بیان نہیں کی جاسکتی جتنے موہنہ اتنی باتیں بعض کی تو یہ رائے تھی کہ کہیں مت جاؤ یہیں گھروں میں بیٹھے رہو اور بعض کی یہ صلاح تھی کہ جب یہی حکم آیا ہے تو نکل جانا چاہیئے غرض یہی رائے غالب رہی اور عورتوں نے اپنا زیور اپنے ہاتھوں سے نکال نکال کر صحن میں پھینک دیا اور ململ تن زیب کے دوپٹوں کی جگہ فرش کی چاندنیاں پھاڑ پھاڑ کر اوڑھیں صبح ہوتے ہوتے مولوی لوگ باغ میں پہنچے اب انگریزی زد میں اور ان لوگوں میں صرف ایک سڑک حائل تھی چاہتے تو باغ میں ٹھیرتے مگر ڈر کے مارے سوئی[1] والوں کے محلّے میں پہنچے وہاں اِن لوگوں کی کچھ رشتہ داری تھی مکان دیکھا کہ خالی ہے چولھے کے پاس لگن میں آٹا گندھا ہوا رکھا ہے توا چڑھا ہے آگ ٹھنڈی پڑی ہے معلوم ہوتا ہے کہ روٹی پکانے کی نوبت نہیں آئی کوئی خطرِ عاجل پیش آیا کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ خیر مولویوں کا خاندان تو ٹھیرا۔ اور یہ لوگ آگے چل بھی نہیں سکتے تھے۔ عورتیں ساتھ تھیں پردے اور سواری کا کچھ انتظام نہیں عورتوں بے چاریوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ایک ایک پاؤں چھلنی ہوگیا۔ ترکمان دروازہ اس محلّے سے قریب ہے اور اندرون دروازہ ایک مسجد ہے نمازِ عصر کے لیئے یہ لوگ مسجد میں گئے تو دیکھا کہ دروازے میں ایک نوجوان سپاہی کھڑا ٹہل رہا ہے وہ قرآن بھی بلند آواز سے پڑھتا جاتا تھا پس اتنی مناسبت موانست کے لیئے کافی تھی۔ اِس سپاہی نے مولویوں کا حال سُن کر کہا کہ لوگ ناحق ڈر کر بھاگ رہے ہیں ابھی انگریزوں کا تسلط جامع مسجد کی شمالی طرف تک نہیں ہوا جب بھاگنے کا وقت آئے گا میں تم کو خبر کردوں گا تم شہر بدر ہوجانا شاید تیسرے دن علی الصباح اُس نوجوان سپاہی نے آکر کہا کہ رات انگریز جامع مسجد پر آگئے مجھے اس سے معلوم ہوا کہ گولہ اُوپر سے برس رہا ہے تو اب تم لوگ نکل جاؤ۔ یہاں تک انگریزوں کے آنے میں بڑا وقفہ ہے اور اگر باغی مقابلہ کر رہے ہیں تو شاید کئی دن لگیں۔ بہرکیف یہ لوگ عرب سرائے[1] پہنچے۔ وہاں بادشاہ بھی ٹھیرے ہوئے تھے ایک دو دن تو امن سے گزرے پھر سُنا کہ بادشاہ اور اُن کے ملازموں کی دار و گیر شروع ہوئی تو یہ مولویوں کا خاندان سلطان[1] نظام الدین بھاگ گیا۔ شہر کی خلقت وہاں بھی بھری پڑی تھی وہاں سے پاؤں اُکھڑے تو مولویوں نے وزیر آباد[2] کا ارادہ کیا رستے میں گوروں کا ایک گارد آتے ہوئے ملا اُس نے مولویوں کے گروہ میں سے مردوں کو گرفتار کرلیا اور عورتوں کو چھوڑ دیا اُس وقت کی پریشانی اور عورتوں کی واویلا کا کیا پوچھنا ہے صرف ایک کم سن لڑکا حافظ عبدالواجد جو مولوی عبدالقادر صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے عورتوں کے ساتھ تھے باقی کل مرد موہنہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اِس گرفتاری میں مولوی نذیر حسین صاحب۔ مولوی عبدالقادر صاحب اور ہمارے مولانا۔ اور دو ایک اَور آدمی تھے۔ گوروں نے اِن لوگوں کو شہر کی کوتوالی میں لاکر حوالات کردیا اسی طرح بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے اور سب قطار در قطار بٹھائے گئے تھے اور سب کو سلسلہ وار پھانسی دی جاتی تھی۔ وہاں ایک بخشی صاحب[3] ساتھ تھے وہ

---

[1] سوئی والوں کا محلّہ جنلی قبر سے آگے چل کر دائیں ہاتھ کو واقع ہے [2] عرب سرائے بیرون دہلی ہمایوں کے مقبرہ کے متصل واقع ہے [3] دہلی سے پانچ میل ہے ۱۲

[4] وزیر آباد دہلی سے چھ سات میل پر واقع ہے ۱۲ [5] اِس بخشی نے مولویوں کو تو چھڑا دیا۔ لیکن جو شخص ایسا قسی القلب ہو کہ صدہا آدمیوں کو پھانسی دلوادے اور اُس کا دل نہ پسیجے اُس نے یہ بات بے فائدہ تو نہ کہی ہوگی کہ یہ لبباطی ہیں۔ اُس زمانۂ شورش میں صرف مولوی کہہ دینا پھانسی دینے کے واسطے کافی تھا۔ بعد تسلط عملداری انگریزی اِس نے مولوی عبدالقادر صاحب کو آدبایا کہ لایئے مولوی صاحب کچھ دلوایئے۔ میں نے آپ سب صاحبوں کی جان بچائی (بقیہ آئندہ)

نشاں وہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں جب ان مولویوں کی باری آئی نہیں معلوم اُس کے دل میں کیا رحم آیا اُس نے کہا کہ یہ بےچارے بساطی لوگ ہیں۔ اگر کہیں اُس کے مُونہ سے نکل جاتا کہ یہ مولوی ہیں تو پھر یہ سب پھانسی پاتے لیکن زندگی باقی تھی بچ گئے طرفہ یہ کہ لین کی میم نے ایک چٹھی مولویوں کو لکھ دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ جب تم کو کام پڑے یہ دکھا دینا اور وہ چٹھی ہمارے مولانا کی پگڑی میں تھی۔ مگر اُس کے دکھانے میں پس و پیش کیا۔ انگریزی تو ان میں سے کوئی پڑھا نہ تھا۔ گمان ہوا خدا جانے اُس نے کیا لکھ دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ شکایت لکھی ہو تو اُلٹے لینے کے دینے پڑ جائیں اِس ڈر سے پیش نہ کی گئی ورنہ اگر وہ چٹھی دکھلا دی جاتی تو اتنی زحمت نہ ہوتی اور مگار ہائی ہو جاتی۔

اتفاق سے جس دوکان میں یہ لوگ قید تھے اُس کے کوٹھے پر مسٹر لوئس جو میگزین میں کوئی خدمت رکھتے تھے ٹھیرے ہوئے تھے۔ شام کو ہوا خوری کے لیئے اُترے تو زینے کے قریب ہمارے مولٰنا مولوی نذیر احمد صاحب کھڑے تھے مسٹر لوئس نے غدر سے پہلے ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کی سفارش سے مولٰنا سے کچھ اُردو پڑھی تھی۔ غرض تعارف اچھا تھا زینے سے اُترے تو اُنھوں نے مولٰنا کو پہچانا اور حالات معلوم کر کے اِن سب لوگوں کی حالت پر بہت افسوس کیا۔ ہوا خوری کو تو نہ گئے اور ان سب کو کوٹھے پر لے گئے وہاں چائے پلائی اور کمانڈنگ آفیسر کو لکھ کر راہ داری کا پروانہ دلوا دیا۔

اَب یہ لوگ عورتوں کی جستجو میں پریشان پڑے پھرتے تھے بڑے تجسس کے بعد یہ پتا لگا کہ مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب واعظ جو مولوی شریف حسین صاحب کے خسر ہوتے تھے عورتوں کو برسلے میں لے گئے جہاں اُن کے کچھ مرید رہتے تھے غرض رہا شدہ مولوی بھی وہیں پوہنچے اور وہاں مبتلاے تپ لرزہ ہو گئے۔ اِن میں صرف مولوی عبدالقادر صاحب بچے ہوئے تھے۔ آخر اُنھوں نے یہ مشورہ کیا کہ سرکاری فیل خانے میں کسی فیل بان کے پاس ٹھیریں۔ اِس شخص کا پتہ اُن کو برسلے والوں سے ملا ہو گا کہ فلاں فیل بان یہاں کا بڑا زمیندار ہے اور مولویوں کا معتقد بھی ہے۔ اس شخص نے مولوی عبدالقادر صاحب کی مریدانہ بڑی مدارات کی۔ سرکاری ہاتھی ہدم مکانات کے لیئے شہر میں بھیجے جاتے تھے مولوی

(بقیہ صفحہ ۸۵) ورنہ میرا ایک لفظ بھی آپ سب لوگوں کو تحت الثریٰ پوہنچا دیتا۔ مولوی عبدالقادر صاحب بہت ہی کھرّے مزاج کے آدمی تھے۔ فوراً یہ سُن کر برافروختہ ہو گئے۔ مخبر کو ذیادلایا تو کچھ نہیں اور اُلٹا اُسے لتاڑا۔ تازہ شورش تھی باغیوں کی تحقیقات ہو رہی تھی۔ سیکڑوں انگریز اور میمیں اور بچے مارے گئے تھے۔ مخبر نے جھٹ جڑ دیا کہ مولوی عبدالقادر نے فلاں انگریز کو مار ڈالا ہے۔ مولوی صاحب فوراً گرفتار ہو گئے۔ کئی مہینے حوالات میں رہے۔ سُنتے ہیں کہ چونسٹھ گواہ چشم دید واقعۂ قتل کے پیش ہوئے حتیٰ کہ دو میمیں آئیں اُن سے بھی کہلوا دیا کہ ہمارے خاوند کا قاتل یہی مولوی ہے۔ اب کیا باقی تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے یاس ہو گئی۔ اِس کی خبر لین کی میم نے اپنے شوہر کو دی وہ بےچارہ کہیں باہر تھا دوڑا ہوا آیا اور اُس نے کہا یہ کیا غضب ہے۔ اِن ہی مولوی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری میم کی جان بچائی یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ انگریز کے قاتل ہوں۔ غرض یہ انگریز کچہری میں آیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب اس کی صورت نہیں پہچانتے تھے۔ حاکم مجوّز اور وہ بہت دیر تک کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مولوی صاحب نے سمجھا کہ شاید مجسٹریٹ کی بدلی ہوئی ہے کوئی دوسرا صاحب آیا ہے اور وہ چارج لے رہا ہے۔ لیکن بعد کو وہ اُٹھا اور کہا کہ جاؤ مولوی صاحب کے کپڑے لاؤ۔ وہیں دُھلے ہوئے کپڑے آئے۔ مولوی صاحب کے کپڑے بدلوا اُن کو اس آفت سے نجات دلوائی۔ اور بڑی دھوم دھام سے مولوی صاحب چھُٹ کر اپنے گھر گئے۔

یہ ہے کہ کر تو ڈرا ور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ سنا ہے کہ بخشی صاحب نے مولوی صاحب سے پانسو روپئے مانگے تھے اگر مولوی صاحب اُسے کچھ بھی دے دیتے تو اس کش مکش میں نہ پڑتے ۱۲

عبدالقادر صاحب نے عورتوں کے زیورات ایک پٹاری میں بھر کر پنجابی کٹرے کی مسجد کے ایک حجرے میں تہ زمین دفن کر دیئے تھے تاکہ لوٹنے والوں کو سراغ نہ ملے اُس زیور کے نکالنے کے لیئے مولوی عبدالقادر صاحب فیل بانوں میں مل کر شہر میں آئے۔ کھود کر پٹاری نکالی اور فیل بانوں کے ساتھ شہر کے باہر ہو گئے۔ مولوی لوگ اکثر بھولے بھی ہوتے ہیں اَہلُ الجَنّۃِ بُلہٌ، فیل بانوں کی ارادۃ منادی دیکھ کر مولوی عبدالقادر صاحب سب کے سامنے پٹاری کھول بیٹھے اُنھوں نے دیکھا پٹاری میں جھڑا سونا چاندی رات کو زیور نکال پٹاری میں پتھر بھر دیئے مولوی صاحب بنا۔ کی بندلے کر بر والے آئے اُس وقت ہمارے مولٰنا مسجد کے ایک حجرے میں بخار میں پڑے تھے بچّوں کو غل مچاتے سُنا کہ مولوی صاحب زیورات کی پٹاری نکال لائے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سُنا کہ مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبے جا رہے ہیں اِس لیئے کہ اُن کو بر والے پونہچ کر معلوم ہوا کہ پٹاری میں پتّھر بھرے پڑے ہیں۔ غرض خود مولوی صاحب اور جن عورتوں کا زیور تھا سب کے سب رو دھو کر بیٹھ رہے۔ اِس پٹاری میں زیادہ مالیت ہمارے مولٰنا کی تھی۔ مولٰنا کی بی بی کا کل زیور تھا۔ مولٰنا کا چاندی کا حقہ۔ چاندی کا سرپوش۔ چاندی کی چلم۔ چاندی کا قلم دان وغیرہ۔ اِس قسم کی چیزیں تھیں مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبتے تو کیا اور اُن کو ڈوبنے بھی کون دیتا وہ بے چارے بھی رو دھو کر چپ ہو رہے ٭

ہمارے مولٰنا کو معلوم تھا کہ ماسٹر رام چندر نو عیسائی کالج کے ریاضی کے اُستاد انگریزی فوج میں ہیں مولٰنا اُن سے ملنے کے لیئے وزیر آباد آئے۔ معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب شہر میں آباد ہو گئے ہیں۔ مسٹر لوئیس نے مولٰنا کو پروانہ راہ داری دلوا ہی دیا تھا مولٰنا اس پروانے کے ذریعے سے شہر میں آئے اور پھر ماسٹر صاحب کی صلاح اور سفارش سے اسی پروانہ راہ داری کی حمایت پر عورتوں کو بھی مولوی لوگ شہر میں لے آئے۔ یہاں لُوٹ کا بازار گرم تھا۔ سکھ مسلمانوں کو اور ولائیتی ہندوؤں کو لوٹتے تھے

ڈپٹی انسپکٹری مدارس الہ آباد پر مامور ہونا

اتنے میں ہنری اسٹوارٹ ریڈ جو اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات تھے دہلی آ کر اَور انگریزوں کے ساتھ قلعے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اُن کے میر منشی مولوی کریم بخش صاحب سے ماسٹر رام چندر کے کوٹھے پر مولٰنا سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے مولٰنا کو ریڈ صاحب تک پونہچا دیا۔ ریڈ صاحب نے حالات سُن کر مولٰنا کو الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس پر مامور کر دیا۔ مگر کہا کہ تم الہ آباد کیونہچوگے کیوں کہ رستے بھر غدر ہو رہا ہے۔ یوں کرو کہ مَیں راجہ گوالیار کو اُن کے راج پر مسلط کرنے کے لیئے گوالیار فوج لے کر جا رہا ہوں وہاں سے فرخ آباد مَین پوری۔ کان پور کا غدر فرو کرتا ہوا الہ آباد پونہچوں گا۔ تم بھی میری فوج کے ساتھ رہو"

غرض اِس طرح مولٰنا الہ آباد پونہچے۔ صاحب کلکٹر سے ملے اُنھوں نے کہا "ابھی ضلع میں امن نہیں۔ مگر تم دور سے آئے ہو اور بمشکل یہاں پونہچے ہو اتنی رُوپے کے عوض تم کو پچاس رُوپے ملیں گے۔ یہاں ٹھیرو امن ہوئے پیچھے مدارس کی خبر لینا"

ایک اَور آفت کا سامنا

ابھی الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹری کا کام شروع نہیں کیا تھا کہ دہلی میں مولٰنا کے خاندان پر ایک آفت[1]

[1] آفت یہ ٹوٹ پڑی کہ دَورانِ بغاوت میں جنرل بخت خاں نے ان مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مُہریں کرالیں گورنمنٹ برطانیہ کو اُن مُہروں کی خبر ہوئی تو بجائے انعام واکرام وخلعتِ خیر خواہی کے جان بخشی پر اکتفا کیا ورنہ مولویوں سے دہیم لیسن کی خیر خواہی نہ ہوئی ہوتی تو پھانسی میں کیا کسر رہ گئی تھی ۱۲ ص۵ بھولے بھالے جنتی ہوں گے

ٹوٹ پڑی۔ مولویوں پر میم لیسن کے معاملے میں لغو اور بے اصل شبہات کیئے گئے اور وہابیانِ پٹنہ[1] کی سازش کے الزام میں مولوی نذیر حسین صاحب کی خانہ تلاشی ہوئی اور ان کو پکڑ کر لاہور لے گئے اور نیز مولوی عبد القادر صاحب جھوٹی مخبری پر پکڑے گئے اِن کے چھوٹنے کا حال ہم اسی حصّے کے فٹ نوٹ میں لکھ چکے ہیں۔ غرض ہمارے مولٰنا یہ سن کر بھاگے ہوئے دہلی آئے اُس وقت میم لیسن نے بڑا کام کیا کہ وہ گڑھی ہرسرو[2] سے جہاں اُس کا شوہر مسٹر لیسن پرمٹ کا پٹرول تھا اپنے شوہر کو ساتھ لے کر دہلی آئی اور رو کالت کر کے مولوی عبد القادر صاحب کو حوالات سے چھڑایا۔ اُسی نے شاید مولویوں سے کہہ دیا تھا کہ تم نے جو ہماری خیر خواہی کی ہے ہم اس کے صلے میں تم کو سرکار سے انعام دلوائیں گے اِسی انعام موعود کے استحقاق میں باوجود باہمی قرابت کے مولویوں میں اختلاف ہوا۔ اِس اختلاف کی رو میں ہمارے مولٰنا بھی آنے ہی کو تھے مگر اَلْحَقُّ یَعْلُو وَلَا یُعْلٰی۔ نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا۔ مولوی شریف حسین صاحب نے دعوٰی کیا کہ مولوی نذیر احمد صاحب کو جو نوکری مل گئی ہے وہ میرے باپ مولوی نذیر حسین صاحب کا حق ہے یہ دعوٰی فقط جزوی مشارکتِ اسمی کی وجہ سے تھا کہ مولٰنا کا نام نذیر احمد ہے اور شریف حسین صاحب کے والد کا نام نذیر حسین مگر ایسا لغو دعوٰی پیش رفت ہونے والا نہ تھا۔ اور پیش رفت ہوا بھی نہیں اِس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبد القادر صاحب نے مسز لیسن کی جان بچائی لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مولوی نذیر حسین صاحب مسز لیسن کو کہیں سے اُٹھوا کر لائے اور اپنے گھر میں رکھا بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اور منبر اور شعیب مسز لیسن کو اُٹھا کر لائے اور ان تینوں میں بھی ابتدائً سچی ہمدردی اگر کسی نے مسز لیسن سے کی تو وہ ہمارے مولٰنا ہیں مسز لیسن کو جب کہ وہ سڑک پر بے ہوش پڑی تھی کس نے اُس کی جان کی حفاظت کی؟ منبر کی بے رحمی سے کس نے بچایا؟ پیاس کی بے قراری میں شربت کس نے پلایا؟ اور مولویوں کے گھر میں کس نے لا کر رکھا؟ ہے کوئی شخص جو ہمارے مولٰنا کے سوا اور کا نام لینے کی صحیح جرأت کر سکے۔ غرض ان لغو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں میں تا ایں دم صفائی نہیں ہوئی۔

---

[1] وہابیت (بغاوت) کا مقدمہ ۱۸۶۴ء لغایت ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۰ و ۱۲۸۱ھ میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں۔ پٹنہ۔ داناپور۔ میرٹھ۔ انبالہ وغیرہ وغیرہ میں چلایا گیا تو بیشتر ماخوذین کے لیئے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔ جناب مولوی یحیٰی علی و مولوی احمد اللہ خان صاحبان جہدانوی صادق پوری عظیم آبادی (جنھوں نے انڈمان ہی میں وفات پائی) کے مقدمے کی لپیٹ میں میاں صاحب پر بھی مواخذہ ہوا جو صرف مخبروں کی غلط خبر رسانی اور اہلکاروں کی غلطی پر مبنی تھا اور آپ تا تحقیقات کامل کم و بیش ایک برس تک راولپنڈی کے جیل میں نظر بند رہے۔

دہلی میں جب میاں صاحب کے مکان اور مسجد کی تلاشی ہوئی تو دوسروں کے بھیجے ہوئے خطوط بہ تعداد کثیر بے ٹھکانے دری پر چٹائی پر دری کے نیچے چٹائی کے نیچے چارپائی کے نیچے کتابوں میں پڑے ہوئے پائے گئے۔ پوچھا گیا آپ کے ہاں اس قدر بہ کثرت خطوط کیوں آتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ وجہ اس کی تو بھیجنے والوں سے پوچھنی چاہیئے یا اُن خطوط میں دیکھنا چاہیئے۔ میرے خیال میں یہ بات ہے کہ سرکار نے خط کا محصول بہت کم آدھ آنہ رکھا ہے اس لیئے لوگ دو پیسے دے کر خط بھیج دیتے ہیں دیکھیئے اس میں کوئی خط بیرنگ نہیں ہے سب پیڈ ہیں۔ خطوط جو پڑھے گئے تو اُن میں اِس کے سوا دھرا کیا تھا کہ فتوے کا سوال ذیل میں درج ہے حضور اس کا جواب جلد بھیج دیں فلاں مسئلے میں کیا حکم ہے۔ فلاں کتاب کی فلاں عبارت کا صحیح مطلب کیا ہے فلاں موضوع پر متقدمین کی بھی کوئی تصنیف ہے۔ فلاں کتاب بھیج دیجیئے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے مضامین تھے۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ نخبۃ الفکر (فنِ اصولِ حدیث میں ایک کتاب ہے ۱۲ مؤلف حیاۃ النذیر) بھیج دیجیئے۔ مخبر نے کہا یہی ان لوگوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ میاں صاحب کو بھی جلال آ گیا فرمانے لگے نخبۃ الفکر کیا بندوق نخبۃ الفکر کیا گولہ بارود۔ پھر مجسٹریٹ سے آپ نے کہا کہ صاحب آپ نے میرا مقدمہ کس جاہل کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ اپنے کسی یوروپین یا دیسی عالم سے دریافت کیجیئے کہ نخبۃ الفکر کتاب کا نام ہے یا نہیں اور اُس کتاب کا موضوع کیا ہے (از حیاۃ بعد المماة) ۱۲

[2] گڑھی ہرسرو ضلع گوڑگانوے میں ایک مقام ہے ۱۲

اگرچہ مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اِس میم کی جان بچائی لیکن اتنا مَیں ضرور کہوں گا کہ مولویوں کی خیر خواہی کی کچھ داد نہیں ملی۔ جب دہلی کا قضیۂ غدر ختم ہوا تو پھر مولٰنا الٰہ آباد کو پہنچے اور وہاں انسپکٹرِ مدارس مقرر ہوئے۔ اِس موقع پر مولٰنا فرماتے ہیں۔ :-

"مگر سررشتۂ تعلیم کی یہ حالت تھی کہ جہاں غدر کی وجہ سے گورنمنٹ کی مشنیری کے سارے کیل پُرزے ڈھیلے پڑ گئے تھے وہاں سررشتۂ تعلیم گویا نیست و نابود سا ہو گیا تھا۔ غرض اس سررشتے کو سنبھلتے سنبھلتے کئی برس لگے غدر کے دو تین برس بعد سررشتۂ تعلیم تو پنپ گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں کہیں اُس کا ندکور تک نہ تھا۔ وہی "ماپ تول"[1] وہی "بھوگول" یعنی وہی سررشتۂ تعلیم کا ڈپٹی انسپکٹر بن کر دورے میں کہیں لڑکوں کے پہاڑے سنتا پھرتا ہوں اور کہیں دم یاد رہاڑ پوچھتا پھرتا ہوں"۔

انگریزی زبان کا اتفاقیہ سیکھنا

مولوی سعادت علی صاحب مولٰنا نذیر احمد صاحب کے والد ماجد جتنے دین دار تھے اُتنے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر بھی تھے۔ ہمارے مولٰنا کو مولوی صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں تعصبًا انگریزی نہیں پڑھوائی اور مولوی صاحب مرحوم پر کیا منحصر تھا وہ تو ایسے وقت تھے کہ خود سر سید سے بھی پوچھا جاتا تو انگریزی پڑھنے کو کفر نہ بھی بتاتے تو اُس کے گناہِ کبیرہ ہونے کے فتوے پر ضرور مُہر کر دیتے۔ اگر ایسے وقت میں علمارِ دین اور فقہارِ شرعِ مبین انگریزی پڑھنے والے مسلمان کا نام دفترِ اسلام سے خارج کر دیتے تھے تو کیا گناہ کرتے تھے۔

غالبًا مولٰنا نے اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب کے اِس تعصب کو لاہور کے کسی لکچر میں اِس طرح ظاہر فرمایا تھا۔

"مَیں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ مَیں انگریزی پڑھوں۔ والدِ مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور۔ اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں"۔

غرض مولٰنا نے کسی اسکول یا کالج میں باقاعدہ سبقًا سبقًا انگریزی نہیں پڑھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولٰنا الٰہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور وہاں ایک انگریزی داں مسلمان[2] کے ہاں مقیم تھے میزبان کے رغبت دلانے سے مہمان نے انگریزی شروع کی۔ یہاں تک کہ انگریزی الف لیلیٰ کی حکایتیں شروع کر دیں۔ چوں کہ دَورے کی نوکری تھی جو کچھ ہیڈ کوارٹر میں پڑھتے وہ دورے میں یاد کر لیتے۔ رفتہ رفتہ مولٰنا نے اِس پائے کی استعداد حاصل کی کہ آج بی اے کی اُن کے سامنے کچھ حقیقت نہیں ایک مقام پر اپنی انگریزی تعلیم کی حقیقت ہمارے مولٰنا خود اپنے دست و قلم سے نہایت ہی مناسب الفاظ میں یوں رقم فرماتے ہیں۔

"بارے مساعدتِ توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجکو ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لیئے بس کرتا ہے اور اب علم کی طرف سے میری خاطر جمع ہے۔ جیسے ایک پیاسا چشمۂ آبِ حیات پر بیٹھا ہے۔ اور اُس کا دل سیر ہے۔ جب چاہے گا پی لے گا۔ تصریح اِس

---

[1] ماپ تول ڈپٹی رام سرن داس کی بنائی ہوئی تین چار ورق کی کتاب ہے جس میں بیگہ بسوہ کا حساب ہے۔ اور "بھوگول" بابو شیو پرشاد کا بنایا ہوا ناگری کا جغرافیہ۔[12]

[2] عبداللہ خاں صاحب امین عدالت ۱۲

اِس اجمال کی یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں تو سوسائٹی کے تعصبات نے انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امینِ عدالت نے مجھے مکان میں ٹھیرایا بیٹھک میری اُن کی مشترک تھی۔ ساتھ کے اُٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اُردو کی شُد بُد کے علاوہ مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کر کے مَیں تو کسی قدر کھٹکا سگر دیکھا تو اُن کو پکا مُسلمان پایا۔ غلو کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند باوجودے کہ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے۔ مگر وضع ظاہر طرز ماندو بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ عبداللہ خاں کی وہ ادا جس کو مَیں نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے جو آگ ملک میں لگائی تھی وہ ابھی تک بڑی سُلگ رہی تھی یعنی دارو گیر جاری تھی۔ تو جو لوگ ناکردہ گناہ دشمنوں کی مخبری پر یا محض اشتباہ پر ماخوذ تھے اُن کے عزیز قریب اُن کی رہائی کے لیئے یہاں صدر الہ آباد میں آکر پڑے ہوئے تھے اور اُن کو انگریزی استغاثے اور اپیلیں لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی اور وکیلوں اور بیرسٹروں کی یہ کیفیت کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ تو مَیں عبداللہ خاں کو دیکھتا تھا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مسلمانوں کی اپلیں مفت لکھتے اور کوئی کچھ دیتا بھی تو بڑے مضایقے کے ساتھ لیتے اُس وقت مسلمانوں کی امداد اور خیر خواہی کا اِس سے بہتر کوئی پیرایہ نہ تھا سب سے پہلے شخص جنھوں نے انگریزی اور انگریزی دانوں کی طرف سے میرے سوءِ ظنّہ کو دُور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر آزما کر مَیں نے اوّل بار سمجھا کہ انگریزی اور اسلامی عقائد مانعۃ الجمع نہیں۔ عبداللہ خاں مذہبی آدمی تو تھے ہی اکثر مجھ سے قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کے معنی پوچھتے رہتے تھے تو بہ تعلقِ الفاظ ایسی طرح سمجھاتا کہ وہ جلدی سے سمجھ لیتے اور عبارت سے استنباطِ مطلب پر قادر ہو جاتے۔ یوں تو برابر عبداللہ خاں مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لیئے کہتے رہتے تھے اب اُنھوں نے میری اتنی ذری سی امداد کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا۔ اور کہا کہ مَیں تم کو چٹکی بجاتے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض مَیں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میری نوکری تھی دورے کی تو مَیں کیا کرتا کہ اسمال ٹائپ کی عربین نائٹ (الف لیلہ بخطِ خفی) کے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دَورے میں اُن کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجّوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو مَیں انگلش انڈو اُردو ڈکشنری کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا۔ اور یہ صرف چھ مہینے میں۔ اِس طرح پر انگریزی سیکھنے میں مجکو یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کوئی سی بھی زبان باقاعدہ سیکھ لے تو اُس کی مدد سے دوسری زبان کا سیکھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔ مَیں نے انگریزی سبقًا سبقًا ترتیب سے نہیں پڑھی اور انگریزی کی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی۔ مگر چوں کہ عربی ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اُس نے انگریزی کو میرے لیئے ایسا سہل کر دیا کہ جو مدرسے کے لڑکے برسوں میں کرتے تھے مَیں نے مہینوں میں کر لیا۔"

غرض عبداللہ خاں صاحب اور ہمارے مولٰنا کی یک جائی نے ایک دوسرے کے شوق میں تحریک اور تحریک کے ساتھ کافی مدد کی۔ مُبادلۂ اعمال بالاعمال کے طور پر جانبین سے تعلیم شروع ہوئی ہمارے مولٰنا کی ملازمت مقامی تو تھی نہیں دورے کی وجہ سے آج یہاں کل وہاں مگر مولٰنا کے شوق نے باوجود دورے کی نوکری کے کام ناغہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ بمدد ڈکشنری اچھی خاصی ترقی کرتے رہے اور وہ اِس طرح کہ اخبار اور خط وکتابت اور تراجم میں جو مضمون لکھا اُس کے محاورات اور طرزِ ادا کو ذہن نشین کرلیا تاکہ اہلِ زبان کی پوری پوری تقلید ہوجایا کرے۔ مولٰنا جب کوئی سبق پڑھا کرتے تو یاد کرنے میں اتنی کوشش کرتے کہ اُس کے ماسٹر ہوجاتے۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک خط سے دو پیرگراف نقل کیئے جاتے ہیں جو اِس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہر سبق کو کس غور وخوض سے پڑھتے تھے۔ یہ خط مولٰنا نے اپنے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو لکھا تھا جب کہ وہ طالبِ علم تھے۔

"انگریزی میں ایکسینٹ بھی ایک بڑی ضروری چیز ہے جس کی طرف ابھی تم نے مطلق توجہ نہیں کی۔ اِس کے معنی ہیں زور دینا مثلاً لبرٹی ایک لفظ ہے اُس میں آر پر زور ہے اس کو پکار کر اور مخاطب کو سُنا کر اور زور دے کر بولنا ہوتا ہے۔ اِسی طرح کل الفاظِ مرکّب میں کسی نہ کسی حرف پر ایکسینٹ ضرور ہوتا ہے مخارج حروف میں شاید چنداں دشواری نہیں صرف سی۔ ٹی۔ ایس۔ آر۔ چار حرف قابلِ لحاظ ہیں۔ سی جب کاف کی آواز دیتا ہے تو اُس میں ہائے ہوّز کا اشمام کرتے ہیں یعنی اس طرح بولتے ہیں کہ ہ کی بُو پائی جائے۔ کنٹری کو کہتے ہیں۔ کھنٹری لیکن وہ ہ محض خفیف ہوتی ہے اگر صاف ہ لگائی جائے تو غلط۔ یاد رکھو کے اور سی میں فقط اِسی اشمام کا فرق ہے کے میں ہ کا اشمام ناروا ہے۔ ٹی کا حال اشمام ہائے ہوّز میں سی کا سا ہے ٹائم کو ٹھائم بولیں کے مگر وہی ہائے خفیفہ لگا کر۔ ایس یا تو کبھی کھُلی ذ کی طرح بولا جاتا ہے جیسے بوائز اور کبھی ایس کو اس طرح نکالتے ہیں کہ ش کی بو پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایس جو سَ بولا جاتا ہے وہ بھی اس اشمام ش سے خالی نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ میں اس بات کو تحریر میں ادا نہیں کرسکتا۔ لیکن میں نے انگریزوں کو سُنا ہے کہ سَم کو صاف سین سے نہیں بولتے بلکہ ش سے ملا دیتے ہیں۔ تم بطورِ خود اِس پر لحاظ کرلو۔ آر کا عجیب حال ہے وہ شروع میں ڈبلیو کے قریب ہے۔ ایک مرتبہ انگریزی اخبار میں پرنس اوف ویلز کی نسبت لکھا تھا کہ لفظ رائل اُن کی زبان سے وائل نکلتا ہے ٭

جو آر بیچ میں یا آخر میں ہو تو صرف ایک حرکت ظاہر کی جاتی ہے اور بس مثلاً فرسٹ کو انگریز فرسٹ نہیں کہتے۔ بلکہ پوپلے موںہ سے فسٹ۔ ہاں اشمام ہائے ہوّز میں پی اور کیہ کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ پرنس کو انگریز پھرنس کہیں گے اور کوارل کو کھوارل۔ ڈی کو فصیح انگریز سختی کے ساتھ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کو دَ کے قریب قریب رکھتے ہیں اور شاید اِس میں ہائے ہوّز کا اشمام کرتے ہوں اِس وجہ سے دال کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایچ۔ ایک عجیب حرف ہے وہ وَ اور زَ کے بین بین ہے وی میں جو ضغطہ ہے اُس پر لحاظ رکھو۔ اِس کو ہونٹ اور دانت کی مدد سے ادا کرتے ہیں ہندستانی ڈبلو اور وی میں فرق نہیں کرتے یہ فاحش غلطی ہے"

باوجود اس قدر واقفیت اور دالشت کے خود ہمارے مولٰنا کا لہجہ اور تلفظِ انگریزی یوروپینوں کے مقابلے میں اب تک صحیح نہیں

اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مولٰنا کو کسی یوروپین سے مستقل طور پر انگریزی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ایسا ہوتا تو تلفظ کیا ایسی پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ اِس کے سوا یہ بات بھی مانی ہوئی ہے کہ ہندوستانیوں[1] کا تلفظِ انگریزی مثل یوروپینوں کے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا خواہ کیمبرج اور اکسفورڈ ہی میں انھوں نے کیوں نہ تعلیم پائی ہو۔ غرض مولٰنا مثل انگریزوں کے صحیح تلفظ انگریزی الفاظ کا ادا نہیں کر سکتے اور نہ صرف یوروپین کے تلفظ کے سمجھنے میں وہ قاصر ہیں بلکہ یورا ایرانی کے بعض تلفظ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا مذکور ہے کہ مولٰنا نظام ریلوے کے دوسرے درجے کی گاڑی میں تھے ایک ایرانی اور اُس کی بی بی دونوں کسی اسٹیشن پر سوار ہوئے اور چوں کہ گاڑی کے چلنے میں کوئی دو منٹ باقی رہے ہوں گے کہ دونوں میاں بی بی لپک کر مولٰنا کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ایک مولٰنا کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف یہ دونوں انگریزی فیشن کے ایرانی تھے۔ گاڑی چلی تو مولٰنا نے ایرانی صاحب سے کہا کہ آپ میری جگہ آ بیٹھیے اور بے تکلف آپس میں باتیں کیجیے لیکن اُنھوں نے نہ مانا دونوں فارسی زبان میں پکار پکار کر باتیں کرتے رہے مگر مولٰنا اُن کا ایک لفظ نہ سمجھے +

بات یہ ہے کہ ہر زبان کی گفت گو دو قسم کی ہوتی ہے ایک پڑھے لکھوں کی۔ ایک عوام کی۔ انگریزی فارسی عربی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ جو لوگ ذی علم ہیں اُن کی سب زبانیں سمجھ میں آتی ہیں۔ جو لوگ بازاری زبان بولتے ہیں وہ اہلِ زبان کے سوا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی جیسے انگریزی میں "سلینگ" (بازاری بول چال یا محاورہ جس کو سوقی زبان کہتے ہیں) ہمارے مولٰنا کتابی انگریزی بولتے ہیں اور وہی ہندوستانیوں کا تلفظ کرتے ہیں۔ اور فارسی اور عربی میں روانی سے گفت و گو کرتے ہیں لیکن نہ بدوی عربی تلفظ کرتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا نہ سولجروں کی انگریزی اور اُن کا تلفظ۔ نہ ایرانیوں کی بازاری فارسی اور اُن کا تلفظ۔ اُن دونوں ایرانی میاں بی بی کی زبان بھی پڑھے لکھے ایرانیوں کی سی زبان نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مولٰنا اُن کی زبان کا تلفظ نہ سمجھ سکے +

مولٰنا کی بعض تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے مسٹر لو سے بھی اپنی انگریزی میں مدد لی تھی ان سے کوئی کتاب تو نہیں پڑھی تھی ہاں خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کیا تھا۔ مولٰنا کے ساتھ ان کو ایک خاص خصوصیت تھی۔ مسٹر لو سر ولیم میور کے داماد تھے اور جس زمانے میں سر ولیم میور بورڈ کے ممبر اول تھے تو صاحب اُن کے سکرٹری تھے۔ بعد کو بلند شہر کے کلکٹر ہو گئے انھوں نے مولٰنا کے ساتھ سر ولیم میور کی مدارات دیکھی تھی۔ سارا خاندان سر ولیم میور کے بیٹے اور بیٹیاں اور میم صاحب سب خصوصیت کے ساتھ مولٰنا سے ملتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مسٹر لو کی ہدایت کے بموجب مولٰنا اپنے خطوط میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جملے اور ایسے لفظ جو کثیر الاستعمال ہوں لکھا کرتے تھے۔

اعظم گڑھ میں ریورنڈ اسکلٹن صاحب سے مولٰنا نے انگریزی زبان میں توراۃ بھی پڑھی تھی ہفتے میں صرف دو دن پڑھا کرتے تھے اور وہ بھی صرف ایک ایک گھنٹا۔ توراۃ پڑھنے سے مولٰنا کبھی کبھی متاثر بھی ہوتے تھے۔ اِس سے

---

[1] ہندوستانیوں میں اگر کسی صوبے کے لوگ تلفظِ انگریزی کا خیال کرتے ہیں تو صوبۂ مدراس والے آن کے بعد صوبۂ بنگالہ کے لوگ اِن کے بعد تیسرا نمبر ممالک متحدہ آگرہ کا ہے اور چوتھے نمبر میں تلفظ کی مٹی اگر خراب کی جاتی ہے تو وہ صوبۂ پنجاب ہے۔ ہم نے بیسیوں بیرسٹروں کی اسپیچیں سُنیں مگر تلفظ کے لحاظ سے وہ بہت خراب تھیں۔ ہاں ایرانیوں کا تلفظ بھی صحیح نہیں ہوتا مگر پیارا اس قدر ہوتا ہے کہ اصل انگریزی تلفظ اُس کے آگے مات ہے۔ ہم نے ہزہائی نس سر آغا خاں کی اسپیچیں سُنی ہیں بس یہ جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

پادری صاحب کو خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ عیسائی ہو جائیں گے۔ کچھ عرصے کے بعد پادری صاحب کی بدلی مرزاپور کو ہوگئی۔ مولٰنا ان کو رخصت کرنے گئے تو پادری صاحب نے فرمایا کہ "میں یہ افسوس اپنے ساتھ لیئے جاتا ہوں کہ تم نے ابھی تک اصطباغ نہیں لیا" مولٰنا نے عرض کیا کہ "آپ میرے اُستاد ہیں، افسوس کے ساتھ آپ کے خیال سے اِس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ بائیبل پڑھنے سے میرے عقائدِ اسلامی اور زیادہ مستحکم ہو گئے ہیں"۔

اِن پادری صاحب نے اِسلام کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور کہیں کہیں سے مولٰنا کو سنایا بھی تھا۔ جن دنوں انھوں نے رسالہ لکھنا شروع کیا تو مولٰنا نے کہا تھا کہ "آپ کی اسلامی معلومات ناقص و ناتمام ہے۔ آپ کیا ردِ اسلام لکھ سکتے ہیں" تو فرمایا کہ "وَل ہم نے ایک کتاب سنیوں کی لیا اور ایک شیعوں کا۔ دونوں نے جو اسلام کی تصویر کھینچی ہے اُس میں اسلام کے دونوں رُخ کالے ہیں اور ہمارے لیئے بس کرتے ہیں"۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار ۞

غرض مولٰنا کو جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملا اپنے انگریزی کے شوق کو انھوں نے جاری رکھا۔ اللہ ہی شوق نے اُن میں آج یہ لیاقت پیدا کر دی ہے کہ بقول اُن کے "میں نے اپنی انگریزی کو ہضماً للنفس (بطور تواضع و کسرِ نفسی) لعنت ہیچ کہا۔ ورنہ اسی لعنت ہیچ پر میں بی اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں۔ مگر بی اے بھی مسلمان بی اے۔ کیوں کہ معلوم ہے انھوں نے بھی متھی میٹکس نہ لی ہو گی۔ اور بندہ بھی ہارا ہے تو یہیں ہارا ہے" ۞

ہم مولٰنا کی انگریزی دانی کی نسبت زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے صرف ایک بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر لیاقت سے مراد تعلیم کا وہ اسٹینڈرڈ ہے جس کا امتحان پاس کرنے سے ڈپلوما ملتا یا ڈگری حاصل ہوتی ہے تو بے شک اِس خصوص میں وہ کسی یونیورسٹی کے مڈل ہیں نہ انٹرنس۔ ایف اے ہیں۔ نہ بی اے۔ اور اگر تعلیم کا اسٹینڈرڈ یہ نہیں ہے بلکہ اصلی اور حقیقی اور مضبوط و مستحکم لیاقت کا اسٹینڈرڈ ہے اور فی الواقع یہی ہونا چاہیئے تو ہر شخص اِس کو جانتا ہے کہ زبانِ انگریزی میں جو جامعیت اور قابلیت اور واقفیت مولٰنا کو حاصل ہے وہ شاذ و نادر ہی کسی میں ہوگی۔ اگر ہمارے گریجویٹ برا نہ مانیں تو واقعہ نفس الامری تو یہ ہے کہ بڑے بڑے بی اے۔ اور ایم اے مولٰنا کی لیاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

یہ ظاہر ہے کہ اپنی زبان میں کسی اَور زبان کا ترجمہ کرنا اور اصل مفہوم کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اور لوہے کے چنے چبانا برابر ہے۔ اس قسم کی لیاقت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی قابلیت درکار ہے۔ یہ نعمت خاص خاص ہی لوگوں کو خدا دیتا ہے اور خاص خاص ہی دماغوں میں اِس کی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ بالکل مسلّم ہے کہ مولٰنا نے خواہ انگریزی زبان سے خواہ عربی زبان سے جتنے بھی ترجمے اپنی اُردو زبان میں کیئے ہیں وہ قطعی طور پر ترجمے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ مستقل اُردو زبان کی ایک تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک زبان دانی کا معیار اس سے بڑھ کر اَور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ان میں بہت روشن طور پر موجود ہے۔ اِس لیئے نتیجہ صحیح یہ نکلا کہ جس اعلیٰ پیمانے کے وہ زبانِ اُردو کے اہلِ زبان ہیں اُسی اعلیٰ پیمانے کے وہ عربی اور انگریزی کے بھی زباں دان ہیں ورنہ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کا زباں داں جیسا کہ زباں دانی کا حق ہے ہو ہی نہیں سکتا۔

غالبًا ناظرین نے صاحبِ قاموس کی حکایت سُنی ہوگی۔

صاحبِ قاموس ذات کا عجمی تھا۔ اِس کو بچپن سے زبانِ عربی کی تکمیل کا شوق ہوا۔ جہاں تک عجم میں ممکن تھا سیکھ پڑھ لیا

نجد اور تہامہ اور یمن اور شام اور حضارہ اور بداوہ میں برسوں زبان کے پیچھے خاک چھانتا پھرا۔ آخر کار ساری عمر کی تفتیش اور تلاش کے بعد قاموس بنائی تو کیسی بنائی کہ ساری دنیا اُس کی سند پکڑتی ہے۔ زبان دانی کا پردہ خدا کو فاش کرنا تھا۔ عرب کی ایک بی بی سے نکاح کیا رات کے وقت گھر کی لونڈی سے کہتے تھے کہ چراغ گل کر دے رطوطے کی ٹیں ٹیں کہاں جائے اَطْفِئِ السِّراجَ کی جگہ فارسی محاورے کے مطابق بے ساختہ اقتلی السراج بول اُٹھے۔ بی بی تاڑ گئی۔ صبح اُٹھ دار القضا میں جا نالش کی۔ خدا جانے بی بی رہی یا گئی مگر میاں کی عربیت کی تو خوب کرکری ہوئی[3]۔

بہرحال ہم آگے چل کر ان شاء اللہ مولنا کے ترجموں کے نمونے دکھائیں گے تاکہ ناظرین کو ہماری رائے کا اندازہ ہو اور یہ جو کبھی کبھی مولنا نے اس قسم کے فقرے اپنے لکچروں میں لکھے ہیں کہ "میں انگریزی کا عطائی[1] ہوں نہ کلاونت[2] اس سے میں کچھ انکساری کا جزو بھی ملا ہوا ہے ورنہ عام رائے تو یہ ہے کہ استنباطِ مطلب میں جیسی طبیعت مولنا کی لڑتی ہے ویسی بڑے بڑے انگریزی دانوں کی نہیں لڑتی ÷

ہمارے خیال میں مولنا اُن انگریزی دانوں میں ہیں جن کی انگریزی کی فصاحت و بلاغت کا لوہا اہل یورپ بھی مانتے ہیں۔ چناں چہ ریڈ صاحب تو مولنا کی انگریزی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اُنھوں نے پنل کوڈ کے ترجمے میں مولنا کی شرکت کو بے حد مفید سمجھا اور لاٹ صاحب کو سفارش لکھی۔ مولنا کی یہ اعلیٰ درجے کی انگریزی دانی ہی کا طفیل تھا کہ جب ٹرنیلیٹنگ اسٹاف (جماعتِ مترجمین) کو ڈپٹی کلکٹریاں دینی شروع کیں تو ریڈ صاحب نے نومینیشن رول کے فارم میں مولنا کی انگریزی دانی کی بڑی مدح سرائی کی تھی۔ ورنہ انگریزی اخباروں میں جن کے اڈیٹر انگریز ہیں بابوانہ انگریزی کی ہمیشہ ہنسی اُڑائی جاتی ہے اور یہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ انگریزی کلبوں میں اکثر ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کے قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

بہرحال اُس وقت بھی مولنا کی انگریزی اسی قابل تھی کہ ریڈ صاحب اُس کی مدح سرائی کریں اور اب تو اور بھی چوتھے آسمان پر پہنچ گئی ہے۔ اُن کی اتنی لمبی چوڑی شہرت جو چار دانگ ہندوستان بلکہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے وہ اسی انگریزی دانی اور عربی دانی اور فارسی دانی اور اُردو کے اہلِ زبان ہونے کا طفیل تھا۔ ورنہ اُن جیسے عربی اور فارسی داں اور انگریزی داں بہتیرے ہیں اور کوئی بے چاروں کو نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو؟

تلنگی زبان کا سیکھنا | مولنا جب ریاستِ نظام میں ملازم تھے تو اُن کی عمر درجۂ توسط سے متجاوز ہو چکی تھی یعنی جوانی کی انتہا اور بڑھاپے کا آغاز تھا لیکن اُس زمانے میں بھی شوقِ تعلیم اور اکتسابِ علم کا سلسلہ جاری تھا۔ چوں کہ وہاں کے صوبۂ شمال کی ملکی زبان تلنگی تھی مولنا نے کئی کتابیں تلنگی کی اس عمر میں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ تلنگی بہت سخت زبان ہے انگریزی سے کچھ کم مشکل نہیں تاہم چند ہی روز میں سمجھنے تو اچھی طرح لگے تھے گو بول نہ سکتے ہوں۔ اب بھی بہ ایں پیرانہ سالی دہلی میں ایک پنڈت سے سنسکرت پڑھا کرتے تھے۔ اللہ رے ہمت اور استقلال۔ ہم لوگوں کو اس علم دوستی سے سبق لینا چاہیئے۔

ترجمۂ انکم ٹکس | اُدھر مولنا نذیر احمد صاحب کے آسمانِ محنت پر انگریزی زبان کی شفق پھول رہی تھی۔ اُدھر میسر

[1] عطائی اُس کو کہتے ہیں جس کا پیشہ گانا نہ ہو اور گانا سیکھے ۱۲

[2] کلاونت پکا راگ گانے والے کو کہتے ہیں ۱۲ [3] یہ روایۃ سعدی کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے بہرحال کسی پر یہ واقعہ گزرا مگر ہم نے تنبیہ کے خیال سے لکھ دی ۱۲

ناصر علی خاں صاحب ذوالقدر مرحوم نے اُس میں اَور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ یہ صاحب اُن دنوں الہ آباد میں اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولٰنا کے حال پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ مولٰنا کو انگریزی کے ذوق میں جو فریفتہ پایا تو محبت کے دل میں شوق سے جگہ دی اور سمجھے کہ یہ ایک غیر معمولی ذہن کا شخص ہے خود بھی چوں کہ بڑے صاحبِ لیاقت اور قدر شناس تھے اس لیے مولٰنا کو بہت عزیز رکھنے لگے ؁

اِسی اثنا میں اول بار انکم ٹکس ایکٹ جاری ہوا۔ سر ولیم میور جو اُن دنوں رونیو بورڈ کے سینیر ممبر تھے اور بعدہٗ ترقی کی پینگ بڑھا کر صوبۂ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے انھوں نے میر ناصر علی خاں صاحب سے اُس کے اُردو ترجمے کی فرمایش کی۔ وہ یہ معقول عذر پیش کر کے الگ ہو گئے کہ "مجکو تو انگریزی آتی نہیں۔ ہاں ایک شخص میری نظر میں ہے اُس کو حاضر کروں گا حضور اُس کا امتحان لے لیں۔ میرے نزدیک اِس ایکٹ کا وہ ترجمہ کر سکے گا اور اچھا کر سکے گا"

وہاں تو میر ناصر علی خاں صاحب نے سر ولیم میور سے یہ کہا اور یہاں مولٰنا کو بُلا کر فرمایا کہ "مَیں آپ کا نام لے آیا ہوں اور کل آپ کو میور صاحب کے پاس لے چلوں گا۔" مولٰنا یہ سن کر بہت پریشان ہوئے اور اُن کے ہوش و حواس جاتے رہے اُنھوں نے گھبرا کر میر صاحب سے کہا "آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ مَیں آج ہی رات کو دورے پر چلا جاتا ہوں" میر صاحب نے فرمایا "کہیں جاؤ وہ جو تمھارے انسپکٹر ہیں بابو شیو پرشاد اُن کے نام حکم جائیگا اور وہ تم کو پکڑ کر بھیجدیں گے" مولٰنا اِس ڈر سے کہ کہیں خفت نہ ہو میر صاحب سے بہت دیر تک حجت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میر صاحب اُن پر خفا ہو کر ناخوش ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مولٰنا سناٹے کے عالم میں آ گئے اور دل میں کہا کہ واقع میں ناصر علی خاں صاحب نے نادانی کی کہ میرا نام لے دیا۔ آخرِ کار چپ چاپ مولٰنا وہاں سے چلے آئے لیکن اِس خیال نے خواب و خور حرام کر دیا۔ چنانچہ مولٰنا اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں ادا فرماتے ہیں

"مجکو ساری رات نیند نہیں آئی مَیں اس خیال میں مستغرق رہا کہ کل "وُلے برندش" ہو گا۔ اور چھوٹتے ہی میور صاحب انگریزی بولیں گے تو مَیں کیا سمجھوں گا اور کیا جواب دوں گا۔ ضرور اُس احمق بہرے بھنڈ کا سا حال ہونا ہے کہ وہ ایک بیمار کی عیادت کو گیا اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ میں تو تھا ہی اور اس پر بے بصیرت۔ آپ ہی آپ ع دماغ بیہدہ پخت و خیالِ باطِل بست۔ کہ مَیں صاحب سلامت کے بعد مزاج پوچھوں گا تو وہ جیسا دستور ہے کہیں گے کہ ہاں اَب تو کسی قدر تخفیف ہے۔ اس پر میں کہوں گا اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ پھر میں پوچھوں گا کہ کون صاحب معالج ہیں وہ کسی کا نام لیں گے۔ تو مَیں کہوں گا شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہٗ پھر بیمار کا دل خوش کر کے غسلِ صحت کے لیے پوچھوں گا۔ وہ کوئی دن بتائیں گے۔ میں کہوں گا بَارَکَ اللّٰہُ اور چوں کہ آدابِ عیادت میں یہ بھی ہے کہ بیمار کے پاس حتی الوسع جلسہ خطیبی سے زیادہ نہ بیٹھے بس اتنی ہی باتیں کر کے رخصت ہو لوں گا۔ لیکن سوچا کچھ اور ہوا کچھ اُس نے مزاج پوچھا تو بیمار نے مَری ہوئی آواز سے کہا۔ کیا پوچھتے ہو ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُس نے اُسی اللھم زد فزد کا اعادہ کیا۔ اُس نے طبیب کو پوچھا تو بیمار نے جل کر کہا عزرائیل اُس نے جواب میں شکر اللہ سعیہ سے دعا دی۔ آخر میں اُس نے غسلِ صحت کو دریافت کیا۔ بیمار نے مایوسانہ یہ شعر پڑھا

[1] سُننے سے بے نصیب ۱۲ [2] خدا زیادہ کرے ۱۲ [3] خدا کرے اُس کی سعی کامیاب ہو ۱۲ [4] مبارک ہو ۱۲

سے موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو ✦ غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو ✦ یہ احمق عیادت کنندہ تو بارک اللہ کہہ کر رخصت ہوا اور بیمار اور بیمار داروں نے بہت ہی برا مانا ایسے خیالات نے مجھے رات بھر بے چین کر رکھا۔ اگلے دن نو نہیں بجے تھے کہ آدمی دوڑا ہوا آیا کہ ڈپٹی صاحب بگھی لیئے کھڑے ہیں۔ جانا پڑا۔ مگر رستے بھر مارے غصّے کے میں نے ڈپٹی صاحب سے آنکھ تک نہیں ملائی۔ ڈپٹی صاحب مجھے باہر بٹھا آپ اندر چلدیئے بس کوئی چار منٹ گزرے ہوں گے کہ میری طلبی آئی قریب جاکر سلام کیا۔ دیکھا کہ سخت عدیم الفرصت ہیں۔ انگریزی کاغذات کے بہت بنڈل سامنے دھرے ہیں۔ سر جھکائے دیکھ دیکھ کر اُن پر پنسل سے کچھ لکھا اور الگ رکھ دیا۔ مجھے سلام کرتے کو تو کیا دیکھا ہوگا مگر میری آہٹ پاکر اُسی طرح جھکے جھکے اردو میں پوچھا کہ "علم کہاں حاصل کیا" عرض کیا دہلی کالج میں۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ[1] کے جواب میں هِيَ عَصَايَ کے ساتھ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ[2] زیادہ کردیا تھا۔ اتنا میری زبان سے اور نکلا کہ جب حضور نے غدر سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا۔ تو میں عربی کی اول جماعت میں تھا بلکہ حضور نے مجھ سے تاریخ یمینی کا ایک قصیدہ بھی پڑھوا کر سنا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سر ولیم میور نے میری اس بات کو توجہ سے سنا یا نہ سنا مگر سامنے گزٹ کی نقل پڑی تھی اُٹھا کر مجھے دی اور فرمایا کہیں سے اس کے ایک چیپٹر کا ترجمہ کرکے آج ہی کے دن اسی وقت مجھے دکھا جانا۔ اِس کے بعد ڈپٹی صاحب اور میں دونوں رخصت ہوئے۔ غرض مکان پر پہنچنے کے ساتھ میں تو ستو باندھ کر ترجمے کے پیچھے پڑا چھوٹا سا چیپٹر منتخب کیا۔ الفاظ کو ڈکشنری میں دیکھا اور مطالعہ کے زور سے مطلب سمجھا پھر ترجمہ تو مونھ کا نوالہ تھا۔ میعاد سے تین دن پہلے میں نے اصل اور ترجمہ ڈپٹی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ کہ یہ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ایسے جلد باز کہ اُسی وقت میور صاحب پاس لے دوڑے۔ اُنھوں نے پسند کیا اور فرمایا کہ نذیر احمد ترجمہ کرے اور وقتاً فوقتاً لو صاحب سکرٹری کو دکھاتا رہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ وہ سر رشتۂ تعلیم کا ملازم ہے اور اکثر دورے میں رہتا ہے۔ اس پر میور صاحب نے بابو شیو پرشاد صاحب کے نام ایک چٹ لکھدی کہ نذیر احمد کو انکم ٹکس ایکٹ کے ترجمے کے لیئے اُس کے کام سے سبکدوش کرو[3]

غرض مولانا کی سُبکدوشی کے متعلق جب میور صاحب کی چٹ بابو شیو پرشاد صاحب کے نام پونہچی تو وہ ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔ اور جناب سر ولیم میور کے دربار تک مولانا کی رسائی سے بوجہ تعصّب دلی رنج کیا۔ اور اگر اُن کے بس کی بات ہوتی تو مولانا کو وہ کبھی وہاں درخور نہ ہونے دیتے مگر اُن کے لیئے حکم حاکم مرگِ مفاجات تھا۔ مجبوراً تعمیلِ ارشادِ سر ولیم میو کرنی پڑی۔ جب مولانا کو اسکول انسپکٹری سے سُبکدوشی کی اطلاع ہوئی تو اُن کی جان میں جان آئی اور باطمینانِ خاطر ترجمے کے کام میں مشغول ہو گئے۔

اَب ایک دوسرا واقعہ سُنیئے کہ بابو شیو پرشاد صاحب نے خفیہ طور پر ترجمے میں شریک ہونے کی کوشش شروع کی۔

---

[1] موسیٰ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے ۱۲ [2] میری لاٹھی ہے کہ میں اُس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اُسی سے اپنی بکریوں کے لیئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ اس سے میرے اور کام بھی نکلتے ہیں ۱۲ [3] گریفتھ صاحب انسپکٹر مدارس تھے اور بنارس کالج کے پرنسپل بھی وہ دورہ کر نہیں سکتے تھے۔ اس سبب سے بابو شیو پرشاد صاحب اُن کے جنٹ مقرر کر دیئے گئے تھے ۵۰۰ پانسو روپیہ تنخواہ تھی ۱۲

چوں کہ صاحبِ لیاقت تھے کامیاب ہو گئے۔ مولٰنا ترجمے کی سنگ لاخ راہ کو نصف سے زیادہ طے کر چکے تھے کہ جناب بابو صاحب دَھم سے کُود پڑے اور کودے بھی تو اِس حیثیت سے کودے کہ مولٰنا کو اپنی پیش دستی میں رکھ کر بقیہ نصف کا ترجمہ کرنے لگے یہ بابو صاحب ہندوؤں میں بڑے متعصّب تھے۔ سر سیّد کے مقابلے میں کونسل کے آنرایبل ممبر بھی ہو گئے تھے۔ راجہ اور سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب بھی تھا۔ سر سیّد اور راجہ صاحب میں منافست بھی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہتے تھے۔ بابو شیو پرشاد صاحب انگریزی میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے سر ولیم میور کو یہ دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ مذہبِ عیسائی کو بدل پسند کرتے ہیں۔ اور میور صاحب بھی بڑے متعصّب عیسائی تھے اِسی وجہ سے میور صاحب بابو صاحب کی حمایت کرتے تھے۔ میور صاحب نے لائف آف محمدؐ۔ لکھی تھی اور سر سیّد نے اُس کا جواب خطباتِ احمدیہ میں دیا تھا۔ اِس وجہ سے سر سیّد اور میور صاحب میں ایک طرح کا انقباض تھا۔ بابو صاحب کے حامی سر میور۔ اور سر سیّد کے سر جان اسٹریچی۔ غرض دونوں کی برابر کی چوٹ تھی۔ دونوں لائق۔ دونوں کے کھونٹے زبردست بابو شیو پرشاد صاحب کو راجہ بنارس سے مالی مدد بھی بہت ملا کرتی تھی۔ لیکن بابو صاحب میں مذہبی تعصّب بہت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کل مسلمانوں کی ایک گردن ہو اور میں اُس کو ایک جھٹکے میں اُڑا دوں۔ وہ باتوں باتوں میں اکثر مذہبی تعصّب کو ظاہر کر دیا کرتے تھے اور مولٰنا بے جواب دیے نہیں رہتے تھے یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ مولٰنا ممدوح نے بابو صاحب کی ماتحتی میں اکیسو بیس روپے ماہوار کی انسپکٹری سے تنگ آ کر اسّی روپے کی انسپکٹری منظور کر لی تھی۔

غرض بابو صاحب مولٰنا سے کھٹکتے تھے اور مولٰنا اُن سے۔ الغرض بابو صاحب نے انکم ٹکس کا ترجمہ مولٰنا سے چھین لیا اور اُن سے محرری کا کام لینے لگے۔ شروع میں مولٰنا سے کہہ دیا تھا کہ جو میں بولتا جاؤں لکھتے جاؤ تم ترجمے میں دخل مت دو۔ مولٰنا نے اپنے غصّے کا اظہار اِس طرح پر کیا کہ ترجمہ لکھواتے لکھواتے اُنھوں نے پُوچھا لکھ چکے۔ مولٰنا نے یہ الفاظ بھی ترجمے میں لکھ دیئے۔ پڑھوا کر سُنا تو بہت بگڑے اور کہا کہ یہ داخلِ گستاخی ہے مولٰنا نے یہ الفاظ بھی لکھ دیئے غرض مولٰنا نے بھی بابو صاحب کو ناک چنے چبوا کر چھوڑا۔

اِس واقعے کے مناسب ایک حکایت یہ بھی ہے کہ ایک بیوی بڑی تیز مزاج اور غصیلی تھیں وہ اپنی چھوکری پر بار بار خفا ہوتیں۔ چھوکری باورچی خانے میں ہوتی تو بیوی دالان میں بیٹھی ہوئی دور سے اُس کو بُرا بھلا کہتیں ایک دن چھوکری نے پیستے میں کچھ زعفران گرا دی۔ بیوی نے دیکھ پایا تو دالان ہی میں سے غرّائیں کہ مُردار مارے جوتیوں کے تیرا سر گنجا کر دوں گی تو چھوکری چپکے سے کہتی کیا ہے کہ مُردار ہو گی تو تیری ماں بھینا۔ اور مارے گی تو مار کھائے گی بھی۔ غرض جو جو باتیں بیوی کہتیں وہ سب چھوکری دُہرا دیتی مگر بیوی پُکار کر اور چھوکری چُپکے سے۔ اسی قسم کی حکایتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عند الشارع غلامی کے مبغوض ہونے کی اصل وجہ یہ ہے غرض ترجمہ انکم ٹکس میں بابو شیو پرشاد بیوی کی جگہ تھے اور ہمارے مولٰنا چھوکری کی جگہ خلاصہ یہ کہ بابو صاحب کا اُنگلی میں خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا ہمارے مولٰنا کو ناگوار ہوا۔ اور وہ بد دل سے ہو گئے۔ میر ناصر علی خاں صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے مولٰنا کو سمجھایا بُجھایا۔ اور فرمایا کہ تمھاری محنت و مشقت کو سر ولیم میور اور لو صاحب جان چکے ہیں۔ اور یہ دونوں تم کو بخوبی پہچان چکے ہیں اِن صاحبوں کا اتنا ہی جاننا

تمھارے لیئے بس کرتا ہے اِس کے بعد میر صاحب نے مولٰنا سے پوچھا "تمھارے ترجمہ کیئے ہوئے میں بابو صاحب نے تو کچھ تصرف نہیں کیا"؟

مولٰنا:- ایک نقطے کا بھی نہیں۔

میر صاحب:- بس تو مال ہیں آنے کی تیاری کرو۔

اِس موقع پر مولٰنا فرماتے ہیں کہ "یہ کہہ کر میر صاحب نے مجکو شفقت سے زیادہ پاس بُلایا اور خوش ہو ہو کر اَور اَور باتیں کرتے رہے۔ جیسے اُن کو میری آیندہ ترقی کا اذعان تھا۔ یہ ہے موّدۃ اہلِ صفا چہ در رو چہ در قفا" بہر حال انکم ٹکس کا ترجمہ اِس طرح ختم ہوا کہ آدھے سے زیادہ مولٰنا نذیر احمد صاحب نے کہا اور آدھے میں مولٰنا اور بابو صاحب دونوں شریک ہوگئے

میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کے ایک اَور احسان کی مثال

ہمارے مولٰنا سے اور میر ناصر علی خاں صاحب مرحوم سے اختلاط تو حد درجے کا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مولٰنا کے خانگی حالات سے بھی بخوبی واقف تھے اور اُن کو معلوم تھا کہ مولٰنا تنخواہ اور بھتا سب خرچ کر ڈالتے ہیں اور کچھ پس انداز نہیں کرتے۔ اِس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ الہ آباد صدر مقام تھا سب چیزیں گراں مگر میر صاحب با این ہمہ دل میں ناخوش تھے اور ہمیشہ مولٰنا پر تاکید کرتے رہتے کہ کچھ نہ کچھ تو بچاتے رہو مگر حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے بچانا ممکن نہ تھا۔ آخر ڈپٹی صاحب ایک چال چلے وہ یہ کہ مولٰنا کے سارے دفتر کی تنخواہ مولٰنا کے نام آتی تھی۔ بشمولِ تنخواہِ مدرسین وغیرہ اور ڈپٹی صاحب کو اُس کا وقت معلوم تھا۔ اتفاق سے خزانے کا کام چند روز کے لیئے ڈپٹی صاحب سے متعلق ہوگیا سررشتۂ تعلیم کا بِل جو اُن کے ہاں گیا تو رسید دے کر روپیہ آپ لے لیا۔ کئی دن گزرے تو مولٰنا نے پوچھا کہ حضرت وہ روپیہ کہاں ہے ڈپٹی صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ روپئے کی مجکو ضرورت تھی مَیں نے لے لیا ہے۔ گاؤں سے آمدنی آئے گی تو دے دوں گا۔ اِدھر ملازمانِ سررشتۂ تعلیم نے مولٰنا پر تقاضا شروع کیا۔ مدرسین کی عرضیاں آنے لگیں اس پر بھی ڈپٹی صاحب نے کچھ پروانہ کی۔ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں مولٰنا کو کس قدر پریشانی ہوئی ہوگی۔ اِدھر ملازمانِ سررشتۂ تعلیم مولٰنا کی جان کھائے جاتے ہیں۔ اُدھر ڈپٹی صاحب ہیں کہ دینے کا نام نہیں لیتے۔ مولٰنا کے پاس کوڑی نہیں آخر مہینہ ڈیڑھ مہینہ ٹال کر مولٰنا نے یہ تدبیر نکالی کہ کتابوں کی بکری کا روپیہ خرچ کر ڈالا۔ کیوں کہ اُس وقت مولٰنا کی عُسرت اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ گھوڑے کی متالی سے پانی گرم کیا جاتا تھا۔ علیٰ ھذا دوسرے اخراجات میں ناگزیر کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی تھی خلاصہ یہ کہ مولٰنا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل میں تھے۔ اِس واقعے کا اثر مولٰنا کے دل پر اس قدر پڑا تھا کہ اُن کو ڈپٹی صاحب کی طرف سے بدگمانی سی پیدا ہو چلی تھی۔ ڈپٹی صاحب مولٰنا کو بلا بلا بھیجتے تھے مگر وہ ڈپٹی صاحب کے پاس جانے میں مضایقہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مولٰنا پرگنہ ساڑھ سلیم پور ضلع کان پور میں تحصیلدار مقرر ہوگئے۔ اِس وقت مولٰنا کو یقین تھا کہ ڈپٹی صاحب اب یہ رقم ضرور واپس دیں گے لیکن ڈپٹی صاحب خبرے نباشد۔ یہاں تک کہ ہمارے مولٰنا نے ڈپٹی انسپکٹری کا جائزہ بھی دے دیا۔ اور روانگی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی اور بظاہر ڈپٹی صاحب کو مولٰنا کی تکلیف کا مطلق احساس نہیں جس دن مولٰنا چلنے کو ہوئے ڈپٹی صاحب نے کہلا بھیجا کہ اسٹیشن تک مَیں تم کو اپنی بگھی میں پہنچا دوں گا

خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آیا تو ڈپٹی صاحب بگھی لے کوئی آدھ گھنٹے پہلے مولٰنا کے مکان پر آموجود ہوئے اور اپنے ساتھ بٹھا اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پر پہونچ کر مولٰنا تو گاڑی میں بیٹھ گئے اور ڈپٹی صاحب پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے۔ اب گاڑی کوئی تین چار منٹ میں روانہ ہونے والی ہی۔ اس موقع پر ڈپٹی صاحب نے پانسو روپے کا ایک پرامیسری نوٹ سودی صدری جیب سے نکال کر مولٰنا کے حوالے کیا۔ یہ پرامیسری نوٹ مولٰنا کے نام کا تھا۔ نوٹ دیتے ہوئے ڈپٹی صاحب نے کہا کہ دیکھو یوں پس انداز کیا کرتے ہیں۔ اُس وقت غالباً جوشِ شکر گزاری کی وجہ سے مولٰنا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ غرض اس طور پر اُنھوں نے مولٰنا کو نوٹوں کی چاٹ پر لگا دیا۔ پس میر ناصر علی خاں مرحوم نے مولٰنا پر یہ چار احسان کیے (۱) بابو شیو پرشاد کے پنجۂ غضب سے نجات دلوائی۔ (۲) سر ولیم میور ممبر بورڈ سے رُوشناس کرایا (۳) تحصیلداری دلوائی (۴) کفایت شعاری کا سبق سکھایا۔

باوجودیکہ ان واقعات کو عرصہ دراز گزر گیا۔ لیکن مولٰنا اب بھی جب میر ناصر علی خاں مرحوم کا تذکرہ کرتے ہیں تو گھنٹوں اُن کے احسانوں کی حکایتیں بیان کیا کرتے ہیں بعض اوقات میر صاحب مرحوم کی یاد سے اُن کا دل بھر آتا ہی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ اُن کی شفقتوں اور بزرگیوں کو یاد کر کر کے روتے ہیں۔

ترجمۂ پنل کوڈ

یہ امر تسلیم ہی کہ مولٰنا نذیر احمد در حقیقت بڑے ذہین اور بڑے ذکی تھے۔ مگر اُس وقت اُن کی انگریزی کا پہیا اتنا چلتا ہوا نہ تھا کہ پنل کوڈ کی ریل میں لگا دیا جاتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ ضرورت بھی بعض اوقات آدمی کو ایسے امور میں بڑی مدد دیتی ہی وہ ضرورت مولٰنا کو تعزیرات ہند کے ترجمے کی شکل میں پیش آئی۔ عربی استعداد بہت ہی اعلیٰ درجے کی تھی۔ دقیق سے دقیق مطالب پر اُن کی نظر بہت جلد پونہچتی تھی۔ حجاب فقط الفاظ کا تھا وہ جب ڈکشنری کے آئینے میں دیکھ کر اُٹھا دیتے تھے تو بے زیادہ فصاحت کے ساتھ جلوۂ مطلب مولٰنا کو نظر آتا تھا۔ یہی بھید تھا جس نے مولٰنا کو باایں قلتِ استعدادِ انگریزی ترجمۂ پنل کوڈ میں آگے چل کر اس قدر مفید ثابت کیا۔ اصل میں یہ عربی دانی کا طفیل تھا کہ مولٰنا کسی وادی میں نہیں رُکتے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یا تو انکم ٹکس ایکٹ کے ترجمے کا نام سُن کر مولٰنا کے حواس باختہ ہوگئے تھے یا اس کے بعد ایسا ہیاؤ کھلا کہ اُنھوں نے مسٹر کو سے مانگ کر بورڈ کے کئی سرکلر ترجمہ کیے۔

یہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ مولٰنا نے کسی اسکول یا کالج میں سبقاً سبقاً جیسا کہ دستور ہی انگریزی نہیں پڑھی بلکہ غدر کے بعد جب الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے تو اُنھوں نے کچھ عبداللہ خاں صاحب امین عدالت کی ترغیب اور کچھ اپنے ذاتی شوق سے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ دَورے کی نوکری میں پڑھنا وار دہی کا پڑھنا تھا وہی اُنھوں نے کیا۔ جب ہیڈ کوارٹر میں تشریف لاتے تو امین صاحب سے اتنا پڑھ لیتے کہ واپسی تک دورے میں اُس کو یاد کر لیں چنانچہ چند روز میں اس طریقے سے اتنی استعداد ہوگئی کہ رومن کی اسکول ڈکشنری کی مدد سے عبارت کا مطلب سمجھ لیتے تھے مگر بدقت بہرحال مولٰنا کی استعداد رومن اسکول ڈکشنری تک تھی کہ لفٹننٹ گورنر نے پنل کوڈ کے ترجمے کا قصد کیا اور ایک ٹرنسلیٹنگ اسٹاف نے اُس کا ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ کہ اتنے میں بقول مولٰنا کے اب خدا کو منظور ہوا کہ یہ ذرۂ بے مقدار رُوشناس آفتاب ہو

یعنی لفٹنٹ گورنر نذیر احمد کا نوٹس لیں۔ اور وہ اس طرح کہ سر جارج ایڈمنسٹن لفٹنٹ گورنر سابق ممالک مغربی وشمالی (ممالکِ متحدہ) نے نیل کوڈ کے ترجمے کو امر مہتم بالشان سمجھ کر اپنے اہتمامِ خاص میں رکھا اور چوں کہ صاحب ممدوح کو مدّتوں طہران میں بتقریبِ سفارت رہنے کا اتفاق ہوا تھا اِن کو زبان فارسی کی اچھی استعداد تھی کہ فارسی میں بلا تکلّف بلا تکان اضافت گفتگو کرتے تھے اور غالباً یہی وجہ واقع ہوئی کہ اُنھوں نے اس ترجمے کو اپنی ذاتِ خاص سے متعلق رکھا کیوں کہ اس وقت کوئی یورپین اُن سے بہتر فارسی داں نہ تھا۔ سر جارج ایڈمنسٹن نے ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ڈائرکٹر تعلیم کو اس کارِ سترگ میں اپنے ساتھ لیا اور ریڈ صاحب نے منشی عظمت اللہ[۱] صاحب کو جو اُن دنوں بریلی کالج میں انگریزی کے مدرس تھے تو قاعدہ تھا کہ منشی عظمت اللہ صاحب ترجمہ کرتے اور ریڈ صاحب کے میر منشی مولوی کریم بخش[۲] صاحب اُس کو بنظرِ اصلاح دیکھتے۔ کیونکہ انگریزی منشی عظمت اللہ صاحب کی اچھی تھی اور عربی و فارسی مولوی کریم بخش صاحب کی۔ اس کے بعد خود ریڈ صاحب ترجمے کو بہت احتیاط کے ساتھ سُنتے اور اُس میں تصرفات بھی کرتے اور آخر میں ترجمہ لاٹ صاحب کو سُنایا جاتا۔

غرض وہاں نیل کوڈ کے جسم پر اردو کا لباس اِس طرح پہنایا جا رہا تھا کہ اتنے میں غالباً مولوی کریم بخش صاحب کی تحریک سے ریڈ صاحب کی چٹھی مولانا کے نام آئی جس کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ لاٹ صاحب صرف دو دن الٰہ آباد ٹھیر کر بنارس چلے جائیں گے منشی عظمت اللہ صاحب اور مولوی کریم بخش صاحب اُن کے ساتھ مجھ سے آگے بڑھ جائیں گے میں چند روز تھارنہل صاحب کمشنر کے ہاں الٰہ آباد ٹھیروں گا۔ تم کچہری کے وقت منشی عظمت اللہ صاحب کا ترجمہ مجھے سنا دیا کرو۔ یہ چٹھی پاتے ہی مولانا ریڈ صاحب کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہوئے۔ گویا شروع شروع میں اس طرح مولانا نے نیل کوڈ کے ترجمے کی اُنگلی پکڑی اور پھر اپنے زورِ لیاقت سے ترجمے کا پونہچا پکڑ لیا۔ وہ اِس طور پر کہ اول اول اُن کی صرف اتنی ڈیوٹی تھی کہ ترجمہ سنا دیا کریں لیکن اب وہ ایک ترکیب سے مترجمین میں شامل ہوتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ دو ہی تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں۔ جب اِس کی اٹکل مل گئی تو میں نے بیچ میں سے چار پانچ دن کے سنانے کی قدر چھوڑ اٹھارویں چیپٹر سے متوکلاً علی اللہ آپ ترجمہ شروع کر دیا۔ دستور یہ تھا کہ برخاست کرتے وقت ریڈ صاحب سکشنوں کو گن لیا کرتے تھے تو فی یوم اکثر سات سکشنوں کا اوسط پڑتا تھا۔ اٹھارویں باب پر پہونچ کر تو میں نے ہمت کر کے اپنا ترجمہ پڑھا۔ خدا کا کرنا پہلے ہی دن ۱۳ سکشن پاس ہوئے۔

---

[۱] منشی عظمت اللہ صاحب آخر میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ بڑے لائق ڈپٹی کلکٹروں میں تھے۔ اُن کے صاحب زادے مولوی حشمت اللہ صاحب ایم اے ہیں جو محمڈن کالج کے ٹرسٹی اور ممالکِ متحدہ میں ڈسٹرکٹ جج ہیں ایک وہ زمانہ تھا کہ گورکھپور میں مولانا اور منشی عظمت اللہ صاحب دونوں ڈپٹی کلکٹر تھے اور آپس میں بڑی محبت تھی مولانا اکثر اوقات ڈپٹی صاحب مرحوم کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں ۱۲ [۲] مولوی کریم بخش صاحب بڑے صاحبِ لیاقت بزرگ تھے۔ عربی و فارسی کی بڑی مضبوط استعداد تھی۔ یہ صاحب بھی کشش عہدی ڈپٹی کلکٹر مرزا پور میں تھے مرحوم کا گو الیار میں انتقال ہو گیا۔ اِن کے صاحب زادے مسٹر احمد الدین المعروف محمد احمد صاحب لکھنؤ میں فسپر فائق ہیں۔ ایم اے، ایل ایل۔ ایم۔ اے اور بیرسٹر ہیں ملازمت کے بعد مختلف سرکاری عہدوں پر ممتاز رہے ہیں اور ہر جگہ اپنے زورِ لیاقت سے ناموری کے ساتھ کام کیا ہے۔ قانونی لیاقت کے سوا لٹریری ذوق بہت ہے۔ سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سنجیدگی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۱۲

سنانے کی قدر چھوڑا اٹھارویں چیپٹر سے متوکلاً علی اللہ آپ نے ترجمہ شروع کر دیا۔ دستور یہ تھا کہ برخاست کرتے وقت ریڈ صاحب سکشنوں کو گن لیا کرتے تھے تو فی یوم اکثر سات سکشنوں کا اوسط پڑتا تھا۔ اٹھارویں باب پر پونہچ کر تو میں نے ہمت کر کے اپنا ترجمہ بڑھایا۔ خدا کا کرنا پہلے ہی دن ۱۳ سکشن پاس ہوئے۔ اُٹھتے وقت گنا تو شبہہ پیدا ہوا کہ شاید کچھ سکشن چھوٹ گئے بار بار اُلٹ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نہیں چھوٹا نہیں تو ریڈ صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ تب میں نے دبی زبان سے کہا۔ یہ ترجمہ میں نے کر لیا تھا کہ دیکھوں کر بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ اِس پر ریڈ صاحب کو اور بھی تعجب ہوا ترجمہ تو مجھ سے لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام ایک چٹھی میرے حوالے کی۔ اور زبانی ہدایت کی کہ آج ہی کی ڈاک میں بنارس پونہچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو وہ تم کو ترجمے میں شریک کرلیں گے اور میں بھی آج کے چوتھے دن لاٹ صاحب کے کیمپ میں ہوں گا۔" غرض مولانا لاٹ صاحب کی چٹھی لے کر فوراً بنارس پونہچ گئے اور لاٹ صاحب کے کیمپ میں داخل ہوئے لاٹ صاحب کو ریڈ صاحب کا خط دیا تو بقول مولانا کے منشی عظمت اللہ صاحب اور مولوی کریم بخش صاحب کے ساتھ اُن کو ثالث الاثانی[1] بنا لیا۔ مولانا ترجمۂ تعزیرات ہند میں باضابطہ طور پر اگرچہ اٹھارویں چیپٹر سے نہ صرف شریک ہوئے بلکہ شریک غالب ہوئے۔ تاہم پہلے چیپٹر سے اٹھارویں چیپٹر تک جو ترجمہ ہو چکا تھا اُس کو بھی کریٹی سائز کر کے صاف کیا اور بھدی اصطلاحوں کی جگہ بہتر سے بہتر اصطلاحیں وضع کر کے ترجمے میں داخل کیں۔ قانونِ فوجداری کے تیرہ و تار آسمان میں مولانا کی اصطلاحیں تاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ عربی و فارسی و انگریزی اور اُردو پر وہ حاوی تھے۔ ذرا سے غور میں اُنھوں نے عربی و فارسی الفاظ کو ترکیب دے کر انگریزی اصطلاحات کے مفہوم کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور مترجمین کے الفاظ اور اصطلاحوں میں یہ بات نہ تھی قانونی اصطلاحوں کا ترجمہ اگر صحیح مفہوم کے ساتھ نہ ہو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ مولی کے چور کو سولی دیدی جائے ذرا سے گھٹاؤ بڑھاؤ میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے مولانا کی اصطلاحوں کو اگر دیکھنا ہو تو تعزیراتِ ہند کے مضامین کو دیکھئے۔ ترجمۂ تعزیرات کے پہلے اُردو زبان میں یہ اصطلاحیں کہاں تھیں۔ اُن کو روشناس کرنے والا پہلا شخص فاضل مترجم مولوی نذیر احمد ہی منجملہ صدہا الفاظ و اصطلاحات کے بطورِ نمونہ چند اصطلاحیں ملاحظہ ہوں۔ آتش گیر اشیا۔ اثباتِ جرم سابق۔ اجرِ جائز۔ ازالۂ حیثیتِ عرفی۔ استحصال بالجبر۔ استحصال بے جا۔ آسودگیِ عامۂ خلائق۔ آئین جنگی۔ بھک سے اُڑ جانے والا مادہ۔ بے ٹھپا کئے ہوئے ٹکڑے تانبے کے۔ بے نام مکاتبہ۔ تبادل۔ تحقیرِ اختیارِ جائز۔ تخویفِ مجرمانہ۔ تری کی عام راہ۔ تصرفِ بیجائے مجرمانہ۔ ثبوتِ جرم سابق۔ جبر مجرمانہ۔ جبری محنت۔ جرائم خلاف ورزی باسرکار۔ جرائم خلاف وضع فطری چٹھی ڈالنا۔ چوروں کا آوارہ گردہ۔ حبس دوام بعبور دریائے شور۔ حفاظتِ خود اختیاری۔ خطرناک حربے۔ خلافِ قانون ترکِ افعال۔ خلاف قانون مابہ الاحتفاظ۔ خیانتِ مجرمانہ۔ دردِ جسمانی۔ سپاہیانہ لباس۔ سڈیشن یعنی فساد انگیزی۔ سرقہ بالجبر کرنے والا۔ طبقاتِ رعایا۔ طبقۂ خلائق۔ عافیتِ ذاتی عقوبت کرنا۔ غلط فہمی۔ فحش افعال۔ فریب آمیز وثائق۔ قانون مختص الامر۔ قانونِ مختص المقام۔ قتل انسان مستلزم سزا۔ کاغذ سررشتہ۔ کفالت المالی گرم کیا ہوا مادہ۔ مادۂ اکال۔ مجرائے آب۔ مجمع خلاف قانون۔ مرض سارلی۔ مرکب تری۔ مزاحمت بے جا۔ مستثنیاتِ عامّہ۔ مشترک افعال۔ معاہدہ کا نقض مجرمانہ۔ نشانِ حرفہ۔ وجہِ ثبوت وغیرہ وغیرہ یہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جزو لاینفک ہوگئی ہیں۔ انھیں اصطلاحوں میں ایک اصطلاح بھک سے اُڑ جانے والا مادہ ہے یہ ترجمہ ہے کمبسٹیل میٹر کا۔ اِس کے ترجمے میں

[1] چولھے کے تین بازووں میں کا ایک بازو ۱۲

جتنے بھی مترجمین تھے سب کے سب عاجز تھے اور سب کے سب بغلیں جھانکتے تھے - ہر چند کوشش کرتے تھے لیکن ترجمہ کے لیئے کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تھا - ہمارے مولٰنا کے سامنے جب یہ لفظ پیش کیا گیا تو ذرا تامل کر کے مولٰنا نے فرمایا "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" یہ سن کر مترجمین دنگ ہو کر رہ گئے اِس لفظ کا یہی ترجمہ تعزیراتِ ہند میں رکھا گیا اور اُس کو ایسی عام مقبولیت نصیب ہوئی کہ اب تمام اخباروں اور کتابوں میں یہ ترجمہ لکھا جاتا ہی اور جب کبھی کمبسٹیبل مٹر خیال میں آتا ہی تو فوراً "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" یاد آجاتا ہی -

طبع ترجمہ کی خدمات بھی مولٰنا سے ظہور میں آئی تھیں اور یہ بھی بہ حکم گورنمنٹ آپ سے متعلق تھیں - لکھنؤ میں منشی نول کشور صاحب کے ہاں رہ کر ترجمہ چھپوایا - انڈکس بنایا اور دفعات کے خلاصے بھی لکھے - ترجمہ اور طبع ترجمہ میں جو عمدہ خدمات مولٰنا سے ظہور میں آئیں اُن کے صلے میں جو منشی عظمت اللہ صاحب اور مولوی کریم بخش صاحب کو دیا گیا - وہی ہمارے مولٰنا کو بھی مرحمت ہوا - یعنی پانچ چھ سو کی میکیب کی قیمتی گھڑی جس کے ڈھکنے کے اندر مولٰنا کا نام اور عطیۂ گورنمنٹ ولایت سے کندہ ہو کر آیا تھا الفاظِ مناسب کے ساتھ ملی اور ڈپٹی کلکٹری کے لیئے نامزد کر دیئے گئے - گو ڈپٹی کلکٹری فوراً نہ ملی - مگر تحصیلداری تو کہیں نہیں گئی تھی -

تحصیلداری اور اُس کا امتحان جب لکھنؤ میں طبع ترجمہ سے فارغ ہو کر مولٰنا الہ آباد واپس آئے اور مسٹر لُو کے سلام کو گئے تو صاحب بولے "تم نے بڑی دیر لگائی - کان پور میں ایک تحصیلداری خالی ہونے والی ہی - میں نے تمہارے انتظار میں اُس کو روک رکھا ہی - ڈپٹی کلکٹری تو آپ لوگوں کو ملے ہی گی مگر میرے نزدیک پایہ بہ پایہ چڑھنا چاہیئے اور میں بھی عنقریب کلکٹری پر جانے والا ہوں" مولٰنا یہ سُن کر دل میں بہت خوش ہوئے اور کہا کہ نقد را بنسیہ گذاشتن کارِ خردمنداں نیست غرض لُو صاحب سے کان پور کی تحصیلداری کا حکم لیا اور اُلٹے پاؤں کان پور پہونچے یہ مذکور ۱۸۶۱ء کا ہی کان پور پہونچ کر مولٰنا کو معلوم ہوا کہ امتحانِ تحصیلداری میں صرف تین چار مہینے باقی ہیں چاہیئے تھا کہ مولٰنا کو ہراس ہوتا - مگر محنت و استقلال کے سامنے اُن کو ذرا خوف نہیں ہوا - اگرچہ مولٰنا تحصیلداری کے کوچے سے نابلد تھے اور یہاں اُن کو عملوں پر وقار قائم رکھ کر کام سے آگاہی پیدا کرنے اور قانون اور ہدایت نامے اور سرکلر اور دستور العمل اور مثلوں کے دیکھنے میں محنت اور سرگرمی سے کام کرنے پڑے مگر واہ رے لیاقت اور واہ رے ذہن اور واہ رے حافظے کہ نہ امتحان میں برس روز کا انتظار کرنا پسند فرمایا نہ مسٹر الیٹ[1] انچارج کلکٹر کی رعایت سے استفادہ کیا اور نہ تحصیلداری کے کام کو پس ماندہ ہونے دیا - امتحان اور کام دونوں پر برابر محنت کی اور کامیابی کے ساتھ وہ میدان اِس طرح جیتا کہ امتحان دینے والوں میں سب سے اول رہے -

ترجمۂ ضابطۂ فوجداری ترجمے کی چاٹ تو مولٰنا کو پہلے ہی پڑ چکی تھی - اور اب وہ اِس قسم کے کام کو کچھ ایسا وقیع اور وزنی سمجھتے بھی نہ تھے - بھلا جو شخص انکم ٹکس اور پنل کوڈ کے ترجمے کی ڈگریاں پاس کر چکا ہو اُس کی نگاہ میں اور قانون کیا جنچ سکتے ہیں انھیں دنوں ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۸۶۱ء کا اردو ترجمہ گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا - حقیقت میں یہ ضابطۂ تعزیرات ہند کا ضمیمہ تھا مگر کسی وجہ سے تعزیراتِ ہند کے ساتھ ترجمہ نہ ہو سکا - گورنمنٹ گزٹ کے مترجم اِن دنوں مسٹر اُلسٹن تھے - اِن ہی صاحب نے

[1] اُن دنوں مسٹر الیٹ انچارج کلکٹر تھے اُنھوں نے از خود مولٰنا کو لکھا کہ اگر تم کہو تو میں تمہارا امتحان اگلے سال تک ملتوی کر دوں مگر مولٰنا نے اُن کی اِس عنایت سے استفادہ نہیں کیا ۱۲

اپنے طور پر بلالحاظِ تعزیراتِ ہند ضابطے کا ترجمہ گزٹ میں چھپوا دیا تھا[1]- لیکن تعزیرات ہند اور ضابطے میں اختلاف ہوا - اِس نقص پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی اور پڑی تو ہمارے مولٰنا کی - چناں چہ مولٰنا نے اپنے پُرانے محسن میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کی معرفت گورنمنٹ کے کانوں تک یہ بات پونہچائی - حق پسند گورنمنٹ نے اِس فروگزاشت کو تسلیم کیا - اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولٰنا کو ضابطے کا ترجمہ درست کرنا پڑا جو ترجمہ کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا-

ضابطۂ فوج داری کے ترجمے کے متعلق یہ واقعہ بھی قابلِ بیان ہی کہ جب مولٰنا کا کان پور سے گورکھ پور کو تبادلہ ہوا تو وہاں اوزلی صاحب کلکٹر تھے مولٰنا نے اپنی خدمات کے اظہار میں اوزلی صاحب سے یہ بھی کہا تھا کہ "میں نے ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کیا ہی" یہ بات اُن کے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ اتنے میں کسی انگریزی اخبار میں اوزلی صاحب نے دیکھا کہ میر ناصر علی خاں صاحب کو ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کے صلے میں سونے کی گھڑی انعام میں ملی - آوزلی صاحب نے مولٰنا سے بُلا کر کہا کہ "آپ تو اپنے آپ کو ضابطۂ فوجداری کا مترجم بیان کرتے تھے - انعامی گھڑی ناصر علی کیوں کرلے گیا" مولٰنا نے اپنے دعوے کے ثبوت میں چٹھیاں وغیرہ دکھائی ہوں گی - مسٹر اوزلی نے یہ حال سن کر سکرٹری گورنمنٹ سمسن صاحب کو لکھ مارا - وہاں میر ناصر علی خاں صاحب سے شاید باز پرس ہوئی - میر ناصر علی خاں کو یہ خیال ہوا کہ شاید مولٰنا نے تحریک کی ہی آخر وہ مولٰنا سے ناخوش ہو کر کشیدہ رہنے لگے -

غرض پنل کوڈ نے گھڑی اور تحصیلداری دلائی - تو ضابطۂ فوجداری سے ڈپٹی کلکٹری ملی - دو برس یعنی ۱۸۶۲ء تک ہمارے مولٰنا تحصیلدار رہے ؛

ڈپٹی کلکٹری اور اُس کا امتحان اور ایک پیشین گوئی

تحصیلداری کے بعد ہمارے مولٰنا ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کی کرسی پر بٹھا دیئے گئے - اور وہیں کان پور میں ڈپٹی کلکٹری کے متعلق مولوی نصر اللہ خاں صاحب نے اُس وقت جب کہ مولٰنا اُن سے استفادۂ علم کرتے تھے یہ فرمایا تھا کہ "یہ لڑکا کسی زمانے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گا" ڈپٹی صاحب نے تو ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی - مگر خود ہمارے مولٰنا کو اُس زمانے میں ان باتوں کا خیال بھی نہ گزرتا ہو گا اور نہ کبھی وہ اپنی آیندہ زندگی کو انجام بینی کی عینک سے دیکھتے ہوں گے - جس زمانے میں مولٰنا اور اُن کے بھائی مولوی علی احمد صاحب مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے پڑھتے تھے تو جیسا کہ بچّوں کی عادت ہوتی ہی مولٰنا اپنے طرح طرح کے دستخط بنایا کرتے تھے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی لکھا کرتے تھے "یعنی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر"، لوگ کہیں گے کہ یہ مذاق تھا یا لڑکپن کی باتیں تھیں اور ہم کہتے ہیں اگر اس کو الہام کہیئے تو کیا بے جا ہی کیوں کہ خدا نے یہ پیشین گوئی پوری کی ورنہ خیال کیجیئے کہ کہاں گنجاہ کی مدرسی اور وہاں سے کان پور کی ڈپٹی انسپکٹری پھر وہاں سے استعفا پھر الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری - پھر وہاں انگریزی کا سیکھنا اور اس طرح انکم ٹکس ایکٹ کا ترجمہ کرنا پھر پنل کوڈ کا ترجمہ کرنا اور پھر کان پور کی تحصیلداری اور پھر ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کی وجہ سے ڈپٹی کلکٹری جس کے متعلق مولٰنا لکھتے ہیں "دو محنت جو میری قسمت میں لکھی تھی کان پور سے گورکھ پور لے گئی - دیکھا کہ ضلع بجائے خود

[1] مسٹر اسٹن گورنمنٹ کے مترجم تھے اور تعزیرات ہند کا ترجمہ ان کا کار منصبی تھا - مگر سر جارج ایڈمنسٹن نے جو ترجمۂ تعزیراتِ ہند سے ان کو الگ رکھا یہ ان کو ناگوار ہوا - اور اس لیئے انھوں نے اپنے اختیار سے بے اجازتِ گورنمنٹ ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ گزٹ میں چھاپ دیا ۱۲

ڈویژن ہے جس کا ایک ایک پرگنہ آبادی اور مال گزاری اور وسعتِ رقبہ میں بڑے بڑے اضلاع کی ہمسری کرتا ہے۔ اور شملہ بمقدار علم جیسا ضلع بڑا ہے ویسا ہی مال اور فوج داری کا معمولی کام بہت ہے۔ - اور بندوبست اِس کے علاوہ۔ کثرتِ کار دیکھ کر بیں گھبرایا تو سہی مگر ہمت نہیں ہاری۔ رات دن محنت کر کے کام کو امروز بفردا انگزار پر لاڈالا مرتے کو مارے شاہ مدار۔ کثرتِ کار کے علاوہ ایک نخ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کی اور بھی۔ لیکن محنت میں خدا نے بڑی برکت دی۔ دن بھر کام کی اُدھیڑ بُن میں رہا۔ رات کو امتحان کی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ بارے تمام پراوِنس میں مال و فوج داری دونوں صیغوں میں اوّل رہا[1] اور لبقیۃ السمر امتحانوں سے چھٹی ملی۔

امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد مولانا کچھ عرصے تک گورکھپور میں رہے۔ لیکن بندوبست کے کام سے چوں کہ ازبس متنفر تھے اِس لیئے اکثر یہ چاہا کرتے تھے کہ کسی غیر ضلع میں بدلی ہوجائے۔ بدلی تو ہوئی مگر کام وہی بندوبست کا سپرد ہوا۔ ضلع جالون میں بدلی | گورکھپور سے مولانا کی بدلی جالون کو ہوئی مگر یہاں بھی وہی بندوبست کے چھپّر اُٹھانے پڑے جس کی تکلیف سے مولانا بہر کجا کہ رسیدیم آسماں پیداست پڑھا کرتے تھے۔ محکمۂ بندوبست نے مولانا کا ایسا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ایک مرتبہ جل کر اِس موقع پر جب کہ سرولیم میور بہ مقام آگرہ **ڈیوک آف اڈنبرا** کی موجودگی میں مولانا کو مرأۃ العروس کی تصنیف کے صلے میں ایک ہزار روپئے نقد اور اپنی جیب خاص سے ایک کیمبرج کلاک جس پر الفاظ مناسب کندہ تھے انعام دیا تو مولانا نے اُن کی شان میں عربی کا مدحیہ قصیدہ لکھا۔ اُس میں یہ تین شعر بھی تھے جو بندوبست کے کام سے نفرت کلی ظاہر کرتے ہیں ÷

ولی عمل فی البند وبست ومحنة - اکابدها بالصبر منذ ثمان[2]
فهذا ادوائی وامتقعت تلونا - وهذا مشیبی شبت قبل اوان[3]
وفیك رجائی والرجاء معولی - علی ثقة بالنجح والتکلان[4]

اس میں کچھ شک نہیں کہ بندوبست کا کام بڑے جھگڑے کا کام ہے گورنمنٹ کے جتنے بھی محکمے ہیں غالباً اُن سے کسی محکمے میں اتنی محنت اور دقت کا کام نہیں ہے جتنا محکمۂ بندوبست میں ہے لیکن ہمارے مولانا چوں کہ شروع سے محنتی طبیعت اپنے ساتھ لائے تھے اور اُنھیں فطرۃً محنت سے دل چسپی ہے اس لیئے وہ بہت کم ایسے کاموں سے گھبرایا کرتے تھے اُن کی تو یہ حالت تھی۔ کہ بعض اوقات جوشِ وحشت میں سرکاری کاموں کے نفلوں کو بھی فرضوں کی طرح اپنے اوپر لازم و واجب کر لیا کرتے تھے۔
جہاں یہ حالت ہو وہاں فرصت کہاں دم مار سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِدھر تحصیلداری ملی اور اُدھر ساتھ ساتھ امتحان دینا پڑا اِدھر ڈپٹی کلکٹری ملی اور اُدھر ساتھ ساتھ ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینا پڑا مگر اس کو مولانا کی خوش قسمتی اور زورِ لیاقت کہنا چاہیئے کہ باوجود اس عدیم الفرصتی اور کثرتِ کار کے جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو خدا کے فضل سے پاس ہونے والوں میں اوّل نمبر رہے

---

[1] اِس امتحان میں کئی انگریز بھی شامل تھے ۱۲ [2] اور میں آٹھ برس سے بندوبست میں ہوں اور مجکو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور میں صبر کے ساتھ مشقت اُٹھاتا ہوں ۱۲
[3] یہ میری صورت ہے کہ میری رنگت متغیر ہوگئی ہے اور میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہوں ۱۲
[4] اور مجکو آپ سے بڑی اُمید ہے اور اللہ پر مجکو بھروسہ ہے اور کام بابی کا یقین ۱۲

گورکھ پور میں دوبارہ بدلی

ضلع جالون کا بندوبست جب ختم ہوا تو پھر مولانا کو ترقی کے ساتھ گورکھ پور بدل دیا گیا۔ گورکھ پور کا نام سُن کر اول تو مولانا بہت ڈرے۔ مگر اس مرتبے کام تھوڑا تھا اور تھا بھی تھوڑے دنوں کا۔ مدتوں سے سالانہ رپورٹوں میں شکایت لکھی جا رہی تھی کہ ضلع بندی کے وقت ضلع گورکھ پور میں جنگل بہت تھا اس کے بعد سے گرانٹ[1] سسٹم پر جنگل کٹ کٹ کر کاشت ہو گئے۔ نیپال کی ترائی کے لوگوں نے کتنے گاؤں بسا لیئے۔ حکام اور عمال کو کثرتِ کار سے رعایا کو صدر کی آمد و شد سے بہت تکلیف ہے اور اتنے لوگوں کی روک تھام بھی مشکل ہے۔ آخر کار ضلع گورکھ پور سے کچھ علاقہ کٹ کر ضلع بستی میں قرار پایا۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی تعیناتی اس بار اسی غرض سے ہوئی تھی کہ ضلع بستی کے کاغذاتِ بندوبست علٰحدہ کر دیں۔ غرض جب تفریق کاغذات کا کام پورا ہو گیا تو مولانا کی بدلی دوسری جگہ ہو گئی۔

قانونِ شہادت کے ایک عالمانہ متن کا ترجمہ

گورکھ پور میں جیسا سرکاری کام تھوڑا تھا ویسا ہی ایک چھوٹا سا کام مولانا کو تصنیف و تالیف کا بھی مل گیا تھا۔ مولانا کی پہلی آمد میں ایک مہتمم بندوبست مسٹر لیوروں صاحب بھی تھے۔ مولانا اُن کے ماتحت تو نہ تھے مگر وہ تھے علم دوست۔ دو چار ملاقاتوں میں مولانا پر بڑی مہربانی فرمانے لگے۔ مسٹر لیوروں صاحب ہمارے مولانا سے عقیدتمندانہ ملتے تھے اور اس عقیدت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ مولانا مسٹر لیوروں صاحب سے ملنے تشریف لے گئے۔ اس وقت مسٹر لیوروں صاحب ایک مختصر سے خیمے میں مفتی اسد اللہ خاں صاحب سے جو صدر الصدور بھی تھے دُرِّ مختار پڑھ رہے تھے جیسے انگریز پڑھا کرتے ہیں ہمارے مولانا کو مسٹر لیوروں صاحب نے کہلا بھیجا کہ آپ ذرا کی ذرا تشریف رکھیں میں سبق سے فارغ ہو کر آپ کو بلاتا ہوں۔ مولانا خیمے کے باہر سے بیٹھے ہوئے اُن کا پڑھنا سنتے تھے۔ دُرِّ مختار والے کا عام اصول ہے کہ وہ ہر باب کے متعلق کچھ لُغز لکھتا ہے۔ اور لغز میں ہوتی ہے تعقید۔ مفتی اسد اللہ خاں صاحب کو اور مولویوں کی طرح ادب عربی سے بے مناسبتی سی تھی وہ جس ڈھنگ سے مسٹر لیوروں صاحب کو سمجھا رہے تھے لغز اُن کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ الغرض مسٹر لیوروں صاحب سبق پڑھ کر فارغ ہوئے تو ہمارے مولانا کو خیمے میں بلایا۔ مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ میں آپ کا دُرِّ مختار پڑھنا خیمے کے باہر سے سُن رہا تھا اور معلوم ہے کہ آپ دُرِّ مختار کے لغز کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ مسٹر لیوروں صاحب نے دُرِّ مختار کا وہ مقام ہمارے مولانا کو دکھایا اور آپ نے اُس کی تعقید وغیرہ کو دُور کر کے نہایت آسانی کے ساتھ مسٹر لیوروں صاحب کو سمجھا دیا۔ مسٹر موصوف نے قانونِ شہادت پر انگریزی میں ایک عالمانہ متن لکھا اور مولانا سے اُس کے ترجمے کی فرمائش کی۔ رسالہ تھا تو چھوٹا سا مگر تھا بڑا ہی ادق۔ لیوروں صاحب نے ترجمہ پسند کیا اور منشی نول کشور صاحب کے مطبع میں اُس کو چھپوایا لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ لیوروں صاحب نے اس ترجمے کے صلے میں مولانا کو کیا مرحمت فرمایا۔

اعظم گڑھ کی بدلی

گورکھ پور سے بدل کر مولانا اعظم گڑھ میں تشریف لائے یہاں کی بدلی تصنیف و تالیف و تراجم کے لحاظ سے جتنی عمدہ تھی اُتنی ہی ملازمت کے لحاظ سے اچھی نہ تھی۔ ہم اس موقع پر مولانا کی دوسری تصنیف و تالیف کا

---

[1] گورکھ پور جنگلی ملک تھا اور اب بھی ہے تو سرکار نے گرانٹ کا قاعدہ جاری کیا تھا کہ قطعاتِ جنگل کی حد بندی کر کے ہلکے لگان پہ لوگوں کو دے دیئے جاتے تھے کہ ان کو آباد کریں۔ اس طریقے کو گرانٹ سسٹم کہتے ہیں ۱۲

ذکر نہیں کریں گے البتہ ایک ترجمے کا ذکر ہوگا جس کے باعث سے مولٰنا کے آسمانِ ملازمت میں خوش اقبالی کا آفتاب چمکا اور سرکاری ملازمت کی ڈپٹی کلکٹری سے نکل کر ایک ریاستِ اعظم میں گویا گورنری کی۔ وہ یہ ہی کہ وہیں اعظم گڑھ میں سب سے اخیر اور سب سے زیادہ نتیجہ خیز کتاب کو ملٹز[۵۱] ہونز کا ترجمہ کیا۔ یعنی لیپوروں[۵۲] صاحب نے گزٹ میں ایک ہزار روپے کے انعام کا اشتہار دیا کہ جو کوئی عمدہ ترجمہ کرے گا وہ یہ انعام پائے گا۔ اشتہار کے ساتھ مولٰنا نذیر احمد صاحب کو ایک پرائیویٹ خط لکھا کہ میں نے اشتہار دیا ہی مگر شروع سے میری نگاہیں تم پر پڑ رہی ہیں۔ یہ خط پاکر مولانا نے عذر کیا اور لکھا میں نے تعلیم نسوان کا سلسلہ لے رکھا ہی اور اس میں مجکو ابھی بہت کچھ کرنا ہی اور بند و بست میں اس سے زیادہ فرصت نہیں پا سکتا۔ بند و بست کے کام کا عذر مولانا نے صرف اس لیے کیا تھا کہ بند و بست سے علیحدہ کرکے ضلع میں بدل دیئے جائیں۔ مگر لیپوروں صاحب نے اس نکتے کو نہیں سمجھا اور بجائے اس کے کہ وہ کوئی ضلع دلواتے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر سے دباؤ ڈلوایا اور اس طرح مجبور اُن کو ترجمہ کرنا پڑا۔ مولانا فرماتے ہیں وہ سب ملاکر گیارہ ترجمے ہوئے اُن میں محاکمہ کرنے کو لیپوروں صاحب نے نقادانِ فن کی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے میرے ترجمے کو سب سے بہتر تو مانا مگر ساتھ ہی یہ پخچر لگادی کہ اَپ ٹو مارک نہیں۔ ہزار میں سے چار سو کے قابل ہی۔ میرا جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ ممبرانِ کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے اسقام دریافت کرتا ہوں تو اسقام ظاہر نہیں کرتے وہ دن اور آج کا دن میں نے فرمایشی شاعری سے کان اُمیٹھا۔ غرض مولٰنا کو جب کمیٹی کی رائے معلوم ہوئی کہ ہزار روپے کی جگہ چار سو انعام تجویز ہوا ہی تو ان کو سخت ناگوار ہوا اور انھوں نے بہت رنج و ملال کیا اس لیے نہیں کہ انعام میں گھٹنت پڑ گئی اور ہزار کی جگہ چار سو تجویز ہوا۔ بلکہ اس وجہ سے اَور بھی زیادہ اُن کو رنج ہوا کہ لوگوں نے ترجمے میں نکتہ چینیاں تو کیں مگر وہ نکتہ چینیاں مترجم کو بتائی نہیں گئیں۔ نکتہ چینیاں نہ بتانے کا سبب اس وقت تک معلوم نہیں ہوا۔ مگر تحقیقات سے اتنا پتا چلا ہی کہ سر سید اور خان بہادر شمس العلماء محمد ذکاء اللہ صاحب بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بہر حال اسی ترجمے نے آگے چل کر مولانا کو میٹھے پھل دیئے اور وہ اس طرح کہ حیدرآباد کے امیر کبیر[۵۳] علم ہیأۃ کے بڑے عالم تھے

---

[۵۱] انگریزی میں علم ہیئت کی ایک لاجواب کتاب ہی۔ سمٰوات کے نام سے مولانا نے اس کا ترجمہ کیا ہی یہ ترجمہ اس وجہ سے ابھی تک طبع نہیں ہوا کہ اُس کے نقشے وغیرہ بغیر ولایت کے اس ملک میں نہیں چھپ سکتے ۱۲

[۵۲] ایچ۔ لی پوروں صاحب اپنی وفات سے پہلے کشمیر کے رزیڈنٹ ہو گئے تھے اُنھوں نے مولانا کو لکھا کہ کسی ذی علم عربی داں کو میرے پاس بھیجو۔ چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ دوں گا۔ مولانا نے اپنے بڑے داماد مولوی سید احمد حسن صاحب سے کہا کہ تم جاؤ مگر وہ وہاں جانے پر راضی نہیں ہوئے ۱۲ [۵۳] مکمل ۱۲

[۵۴] نواب رفیع الدین خاں بہادر مرحوم نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء امیر کبیر علم ہندسہ اور علم ہیئت کے بڑے عالم تھے۔ محمدن کالج علی گڑھ میں بغرض تدریس علم ہندسہ ہیئت انھیں کی یادگار میں ان کے بھتیجوں نے دس ہزار کے صرف سے پرنسپل میں امداد دی ہی۔ جناب موصوف نے ایک رسالہ اسی علم میں شمسیہ بھی لکھا ہی اور سُنا ہی کہ السنۂ یورپ میں اُس کے تراجم بھی ہوئے ہیں ۱۲

لیورون صاحب نے مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا "کہ ایک ہزار کا انعام مشتہر کرکے گولمنز ہونز کا اُردو ترجمہ کرایا ہے اور مَیں اُس کو آپ کو مبارک کرانا چاہتا ہوں اگر آپ امیر کبیر صاحب کو اس کی درستی کی طرف متوجہ فرما سکیں تو مَیں آپ کا اور امیر کبیر کا بہت ہی ممنون ہوں گا"۔ اِس طریقے سے مولٰنا کا ترجمہ ریزیڈنٹ حیدرآباد دکن اور امیر کبیر کی خدمت میں پہنچا۔ امیر کبیر نے بواسطہ سر سالار جنگ بہادر مولوی سیّد حسین صاحب بلگرامی۔ عماد الملک بہادر (مستعفی ممبر انڈیا کونسل) کو دیا کہ وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں (ابھی تک اِن معاملات کی اطلاع ہمارے مولٰنا کو مطلق نہیں ورنہ ان صاحبوں سے کسی قسم کا تعارف) غرض عرصے کے بعد مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا خط مولٰنا کے نام آیا جس میں لکھا تھا

"آپ کا ترجمہ مجکو سپرد ہوا ہے۔ مجکو اُس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں۔ جس نے ترجمے کو اچھا نہیں بتایا ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے اور اس میں کچھ کسر ہے تو اسی قدر کہ آپ ہی اُس کی نظرِ ثانی کریں اور جہاں ضرورت دیکھیں اصلاح کریں۔ اور میں یہی رائے لکھ کر وِن صاحب کے پاس بھیج رہا ہوں"۔

اِس خط کو آئے ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ وِن صاحب کے مفاجات انتقال کی خبر انگریزی اخباروں میں مشتہر ہوئی۔ یہ خبر پڑھ کر مولٰنا پر سناٹا سا گزر گیا اور سمجھے کہ وِن صاحب کے ساتھ ترجمہ بھی مر گیا۔ اَب کس کو لکھیں۔ کس سے پوچھیں۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ اِس عرصے میں وِن صاحب کی بیوہ شوہر کو روپیٹ کر ولایت چلی گئیں۔ کوئی چھ مہینے بعد اُنھوں نے مولٰنا کو لکھا کہ ۔

"گولمنز ہونز کے ترجمے کا حال وِن صاحب کے بیان سے زبانی اور اُن کے روزنامچے کے پڑھنے سے مجھے بخوبی معلوم ہے اور وہ ترجمہ میرے پاس ہے اور چھ سو ترجمے کی نیت کا بھی امانت ہے جو تم کہو سو کروں"۔

اِس کے جواب میں مولٰنا نے انگریزوں کے اخلاق اور اُن کی تہذیب۔ اُن کی مروّت۔ اُن کی وفاداری اور اُن کے پاسِ عہد کی تعریف کرکے وِن صاحب کی بیوہ کو تعزیت نامے کے بعد لکھا کہ "روپیہ تو مجھے چاہیے نہیں ہاں ترجمہ واپس کر دیجیے تو مَیں وِن صاحب کی نشانی اپنے پاس رکھوں گا"۔ جب ترجمہ ولایت سے آگیا۔ تو مولٰنا نے اِس مراسلت کو مع ترجمہ گورنمنٹ میں پیش کر دیا۔ گورنمنٹ نے مہربانی سے ہزار روپیہ جو کمیٹی نے رکوا دیا تھا اپنی جیب سے مرحمت فرمایا۔

اگرچہ ہم نے انکم ٹکس ایکٹ۔ پنل کوڈ۔ یا اُس کے ضمیمے کے ترجموں کا نمونہ ناظرین کو نہیں دکھایا۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ سب قانونی کتابیں ہیں اور اس قدر دائر سائر ہیں کہ تقریباً ہر اُردو خواں کی نظر سے کبھی نہ کبھی گزری ہوں گی لیکن "سمٰوات" ایک بیش بہا علمی ترجمہ ہے۔ اور چوں کہ وہ ابھی تک طبع کے سانچے میں نہیں ڈھلا ضرورت ہے کہ اُس میں سے نمونے کے طور پر کچھ ہدیۂ ناظرین کیا جائے۔ گولمنز ہونز کا ترجمہ دیکھ کر ہمارا خیال بالکل بدل گیا اور اَب ہم سمجھے کہ اُردو میں علمی کتابیں ترجمہ ہونے کی خاص قابلیت ہے۔ بشرطے کہ مترجم ہمارے مولٰنا جیسی لیاقت کے ہوں۔

فاضل مترجم کو گولمنز ہیونز کے ترجمہ کرنے پر صرف انعام کی طمع اور نام و نمود کی ہوس ہی نے آمادہ نہیں کیا بلکہ انعام کا خیال ایک محرّک اور نام و نمود کا تصوّر محض ایک مؤیّد تھا۔ فاضل مترجم نے اِس ضیقِ وقت اور عدیم الفرصتی پر کہ جو اُن کی ملازمت کو لازم اور اُن کی خدمت کے لیے ضروری تھی دو سبب سے اس امرِ اہم کا بیڑا اُٹھایا۔ اول یہ کہ مسٹر

ہنری لیپورون صاحب جن کے حکم سے یہ گنج شائگانِ حکمت وقف تہی دستانِ ہند کیا جائے کو تھا فاضل مترجم صاحب ممدوح کی لیاقت کے معتقد تھے۔ اُن کے فرمان کی تعمیل اور اُن کے ارشاد کی بجا آوری مولٰنا پر واجب تھی۔ دوسرے فاضل مترجم نے جب پہلے پہل اِس کتاب کو دیکھنے کے لیئے اُٹھایا تو اندر سے دل ہچکچاتا تھا۔ فاضل مترجم نے کتاب کو اُٹھانے تو اُٹھالیا لیکن دل میں سوچتے تھے کہ "میرے ناخنِ ذہن میں اپنے کچی عقدوں کے حل کرنے کا اب بوتا کہاں کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملوں اور بڈھا طوطا ہو کر حق اللہ پاک ذات اللہ کرنے بیٹھوں۔ رتب غوامضِ ہیاۃ کے سمجھنے کا قصد کروں اور بے سمجھے اگر میں نے ترجمہ کر بھی دیا تو وہ عبارت مطلب خیز کیا خاک ہوگی اور اس صورتِ بے معنی کو سمجھے گا کون۔ مگر ابتدا کا ولولہ اور شروع کا جوش یہ سمجھاتا تھا کہ آخر اس کام کو مکتب کے لڑکے تو کرنے سے رہے۔ تجھی جیسے بندگانِ خدا اِس میں صرفِ ہمت کریں گے نحنُ رجالٌ وہم رجالٌ۔ تو اتنا بے دل کیوں ہوتا ہے"۔

غرض اِسی پس و پیش اور بیم و رجا میں کتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں کتاب نظر سے گزرتی گئی فاضل مترجم کا ہیاؤ کھلتا گیا۔ ایک مہینے سے بھی کم میں بالاستیعاب کتاب کو دیکھ ڈالا۔ اوّل نظر میں تو چنداں لطف حاصل نہیں ہوا مگر دوسری دفعہ فاضل مترجم نے اِس کتاب کو ایسے شوق سے پڑھا کہ کبھی بوستانِ خیال کو بھی ایسی دلچسپی سے نہیں دیکھا تھا۔ علمی کتاب میں (اور علمی کتاب میں بھی کیسی علمِ ریاضی کی اور وہ بھی ہیاۃ کی) قصّے کا مزا پایا اور افسانے کا حظ اُٹھایا۔ اور ترجمہ کرنے میں بھی یہی بات پیشِ نہاد خاطر رہی کہ حتی الوسع اصل کتاب کی سلاست نا ہاتھ سے نجانے پائے۔ اِسی واسطے فاضل مترجم نے اِس کو دہلی کے روزمرّہ میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ دیکھنے سے یہ خیال بالکل باطل ہو گیا کہ اُردو زبان میں علمی تصنیفات یا تراجم کی قابلیت نہیں ہے۔ بہرحال ذیل میں ابتدائی حصہ بطور نمونے کے درج کیا جاتا ہے ✣

نمونۂ "سموات"

بھلا اگر تم سے کوئی یہ سوالات پوچھ بیٹھے ✣

(۱) آسمان کیا چیز ہے؟

(۲) اور یہ جو ظاہر میں ایک سمندر سا اُمنڈا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کے کنارے کا نام و نشان اِس کی تھاہ کا پتا ٹھکانا (ع) بتاؤ کدھر ہے۔ دکھاؤ کہاں ہے؟

(۳) یہ نقاطِ روشن یعنی بے شمار ستارے جو عالمِ تاریکی کے ایسے قدرتی چراغ ہیں کہ کبھی گُل ہی نہیں ہوتے کیا ہیں؟

(۴) کیا اِن نور کے دانوں کو یوں ہی اٹکل پچو بے ٹھور بے ٹھکانے بکھیر دیا ہے۔ اور ان میں ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں۔ اور ہے تو صرف اسی قدر کہ ہم اِن کو اتفاق سے ایک طرزِ خاص پر یکجا اور مجتمع دیکھتے ہیں؟

(۵) ہم تو مدت سے یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ ستاروں کو جنبش نہیں اور گنبد بلّوریں فلک میں سنہری کیلوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں مگر اب لوگ کہتے ہیں ستارے چلتے ہیں۔ تو بتاؤ کہاں چلتے پھرتے ہیں؟

(۶) عالمِ شہود کے اس نظامِ با احتشام میں کُراتِ معلقہ کا ایک بڑا ہی ازدحام معلوم ہوتا ہے۔ مگر آفتاب اس میں کس

(۱) یہ ترجمہ فاضل مترجم نے ہماری درخواست پر ہمیں ہبہ فرما دیا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ حیاۃ النذیر کی آمدنی سے جو پہلا کام ہوگا وہ یہی ہوگا کہ "سموات" چھپے ۱۲

مقام پر ہے؟ زمین کہاں ہے؟ اور دوسرے ستارے جو ہماری زمین کی طرح سُلطانِ خاور کی اردلی میں دوڑتے ہیں کس جگہ ہیں؟ تو تم کیا جواب دوگے؟

وہ تو کچھ عقلِ انسانی کے لئے ایک شرف مقدر تھا کہ سب علوم میں پہلے علم ہیأۃ ایجاد ہوگیا ورنہ یہ وہ چوٹی کے مسئلے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں ایجاد کا مادہ کتنا ہی کیوں نہ ہو بے مدد ہیأۃ ان کو حل کرنے کا ارادہ یاوہ سری ہے۔ انسان کو بھی خدا نے عجب قدرت دی ہے باوجودے کہ درماندگی اس درجے کی ہے کہ زمین سے اُڑ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ مگر یہ ذرۂ ناچیز عقل کے زور سے اِس ذرا سے تودۂ خاک پر جس کی فراخنائے عالم کے مقابلے میں کچھ بھی ہستی نہیں بیٹھا بیٹھا ایسے آلات ایجاد کرتا ہے۔ جن کے ذریعے سے اِس کی قوتِ نظری ہزار چند زیادہ ہو جاتی ہے۔ فراخیِ عالم کی وسعت کو دریافت کرتا ہے اور جہانِ مرئی کا پیٹا ناپتا ہے اور کروروں ستاروں کو جو اُس میں معمور ہیں شمار کرتا ہے۔ پھر اُن ستاروں کی پیچ دار حرکتوں میں غور کرکے جو ستارے زمین سے بہت پاس ہیں اُن کے ابعادِ ثلثہ اور اُن کے فاصلے زمین سے ٹھیک ٹھیک ناپ لیتا ہے۔ اور پھر اُن کی مقدار مادہ تول لیتا ہے۔ زاں بعد منتشر ستاروں کے گچھوں میں واقعی تعلق دریافت کرکے ظاہری بدنظمی سے ایک قاعدۂ نظم اور انتظام پیدا کرتا ہے اور پھر اسی قدر نہیں بلکہ اپنے خیال کی بلند پروازی سے سوچ کر ایسے اصول استنباط کرتا ہے جن کے مطابق تمام اجرام فلکی ایک انتظام کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور اُس عام قوت کی ماہیت دریافت کرتا ہے جو تمام عالم کو سنبھالے ہوئے ہے

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور فرش سے لے عرش تک کر رہا ہے اپنا زور
سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ رہا بَل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

مگر یہ باتیں کچھ سرسری نہیں ہیں اُس مسلسل محنت کے ثمرے ہیں جو ہیأۃ داں لوگ بہت پشتوں سے کرتے چلے آتے ہیں اور اُن لوگوں کے ذہن و استقلال کے نتیجے ہیں جنھوں نے دو ہزار برس تک آیاتِ آسمانی میں غور کیا ہے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہیأۃ داں کیلڈیا کے گڈریے تھے۔ اِس کا یقین ہم کو بالکل اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ بڑے وسیع میدانوں میں رہتے تھے اور اُس ملک میں موسم بھی ایسا معتدل رہا کرتا ہے کہ خاصی طرح کھلے میدانوں میں لوگ راتیں بسر کر سکتے ہیں۔ پس ہمیشہ آسمانِ صاف میں اجرام فلکی کی شاندار صورتیں اُن کے پیشِ نظر رہا کرتی تھیں اور ایسی حالت میں اُن کو ہیأۃ داں ہونا ہی چاہیئے تھا۔ اور وہ تھے بھی۔ اگر آب و ہوا کی صعوبت اور ہوائے محیط زمین کی مختلف حالتیں جو ہم کو اکثر آسمان کی دید کی مانع ہوا کرتی ہیں نہ ہوں اور شائستہ و مہذب معاشرت و تمدن کے جھمیلے بھی فرصت دیں تو ہم سب بھی کیلڈیا کے گڈریوں کی طرح ہیأۃ داں ہو سکتے ہیں۔ آسمان کو دیکھنے سے بادی النظر میں ستارے خاصے الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ مگر دیکھو تو وہ سفید سفید دُھندلے بخارات کی طرح جھلکتی ہوئی کیا چیز ہے جو پٹکے کی مانند آسمان کے گرداگرد لپٹی ہوئی ہے۔ اسی کو کہکشاں[1] کہتے ہیں۔ یہ کہکشاں ستاروں کا ایک بادل ہے اور جس قدر نظر اس کے قریب آتی جاتی ہے ستارے اور بھی گھچ پچ معلوم ہوتے جاتے ہیں اور اُن میں اکثر

---

[1] عربی میں کہکشاں کو مجرّہ کہتے ہیں اس کا ماخذ لفظ جر ہے جس کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ پس عربی اور فارسی دونوں میں وجہ تسمیہ واحد معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح گھاس کا گٹھا یا لکڑی کے جھانکڑ گھسیٹنے سے زمین پر نشان پڑ جاتے ہیں کہکشاں کی ظاہری صورت اُن سے اشبہ ہے۔ مگر انگریزی اور یونانی میں کہکشاں کا ایک لطیف و شیریں نام رکھا گیا ہے جس کا ترجمہ لفظی راہِ شیر ہے۔ لیکن میں جوئے شیر تجویز کرتا ہوں ۱۲ (مترجم)

ایسے چھوٹے ہیں کہ آنکھ سے اُن کا امتیاز بدقّت ہوتا ہے۔ کہکشاں کی راہ میں ستاروں کا ہجوم یوں آنکھ سے متمیّز نہیں ہوتا۔ مگر بڑے پلّے کی دوربین کے ذریعے سے دیکھا جائے تو خوب صاف نظر آتا ہے۔ کہکشاں کو کچھ اَور مت سمجھو بہت سے بے شمار ستاروں یعنی آفتابوں کا لمبا پتلا کہکشاں ہے اور بس۔ ہم نے ستاروں کو عمومًا آفتاب کہا۔ اِس واسطے کہ آگے چل کر ثابت کردیں گے کہ روشن سے روشن ستارے سے لے کر مدّھم سے مدّھم ستارے تک ہر ستارہ ایک آفتاب ہے۔ الغرض یہ کہکشاں جہانوں کا بڑا بھاری انبوہ اور ازدحام عظیم ہے۔ اور اگر یہ مقولہ صحیح ہے کہ جو ستارے کہکشاں کے باہر واقع ہیں وہ بھی اکثر اسی کے ٹکڑے ہیں تو گویا کہکشاں تمام عالم کا لفافہ ہے۔ اور واقع میں یہ لاکھوں آفتابوں کا جتھا متعدد اور جداگانہ گروہوں میں منقسم ہے اور پھر وہ گروہ بھی اَور ایسی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہر ٹولی کے حصّے میں دو یا تین آفتاب ہیں۔ اِن میں ہر ایک ٹولی کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہے اور سب ٹولیاں کتنی دُور ہیں اِس کا ٹھیک جواب بڑے سے بڑا محاسب بھی نہیں دے سکتا یہاں شمار بے کار ہے۔ اور عدد قاصر۔

اِس مقام پر ہم ایک بات اَور بھی کہے دیتے ہیں جس کو سن کر بہت سے لوگ تعجب کریں گے وہ یہ کہ ہمارا آفتاب بھی اسی کہکشاں کا ایک ستارہ ہے۔ گو یہ امر بخوبی ثابت ہوچکا ہے۔ مگر یہ مقام اِس کے بیان کا نہیں۔ اِن شاء اللہ آیندہ موقع مناسب پر مذکور ہوگا۔

اَب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا صرف ایک ابتدائی خاکا عالمِ شہود کی ساخت کا تھا۔ اگر امعانِ نظر کے ساتھ اس گنبدِ فلکی کے ہر طرف دیکھا جائے تو تیز بین آدمی کو جا بجا سفید سفید جا بجا چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح نظر آئیں گے اور گو یہ ٹکڑے اکثر کہکشاں سے بڑے فاصلوں پر واقع ہیں اور اُس سے صاف جُدا اور ممتاز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایسا ہی خیال ہوتا ہے کہ گویا کہکشاں ہی کے ٹکڑے ہیں کہ اُس سے ٹوٹ کر دُور جا پڑے ہیں۔ دوربین سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ایسے بادل کے ٹکڑے ہزاروں ہیں جن کو اصطلاحِ علمِ ہیئت میں غشاوہ کہتے ہیں۔ اب ذرا خیال تو کرو کہ یہ ٹکڑے جن میں کا ہر ایک بجائے خود جہانوں کا ایک مجمع ہے ہم سے کس قدر دور ہیں۔ خلائیں ہیں جن کی تھاہ کا کچھ پتا ٹھکانا نہیں۔ یوں ہی اُن کی مسافتیں بیان سے باہر ہیں۔ بڑی تیز دوربین میں دیکھا جائے تو اَور بھی بے نہایت معلوم ہوتی ہیں کچھ حدّ و پایاں نظر نہیں آتا۔ نہ انجام ہے نہ غایت۔ نہ آخر ہے نہ نہایت۔ مگر ہاں لاکھوں آفتابوں کی مشعلیں روشن ہیں۔ قدرتی رصدگاہ یعنی یہی زمین اور یہی آنکھوں کی دوربین جو ہم کو بدو فطرت سے دی گئی ہے اُس میں تو اِس عالم کی یہ صورت دکھائی دیتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی۔ لیکن اگر منظور ہے کہ اس کی ترکیب کی نسبت کوئی ٹھکانے کی بات سمجھیے اُس کے اجزا کے حالات میں جو بے انتہا اختلافات ہیں اِن کو کامل طور پر جان لیجیے تو مجموعِ عالم سے قطع نظر کرلینا چاہیے کیونکہ کیا چشمِ ظاہر اور کیا چشمِ باطن مجموعِ عالم کے نظارے میں دونوں خیرگی کرتی ہیں۔ اور ایک بہت چھوٹا سا مجموعہ اختیار کرنا چاہیے جو ہم سے بہت قریب ہو۔ اور قربت کی وجہ سے انسان کا دست رس بھی اُس تک متعذر نہ ہو۔ وہ مجموعہ وہ ہے جس کا ایک جزو ہماری زمین بھی ہے۔ اِس مجموعہ کا مرکز آفتاب ہے اور وہی منبع نور و حرارت ہے اِس کے گرد مختلف فاصلوں پر سو سے زیادہ دوسرے درجے کے اجرام گردش کرتے ہیں جن کو سیارات کہتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اَور چھوٹے چھوٹے ستاروں کو بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے گھومتے ہیں جو اقمار کہلاتے ہیں۔ ۔ یہ ستارے اور اقمار

بذاتِ خود روشن نہیں ہیں۔ بلکہ نورِ آفتاب اُن پر چمک کر زمین کی طرف منعکس ہوتا ہے۔ اِس سے مثل اور ستاروں کے گنبدِ فلکی میں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اُن کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ بعینہ یہی حال خود زمین کا بھی ہے۔ اگر اس کو بھی خلا میں بڑی دُور جا کر دیکھا جائے تو یہ بھی چمکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مجموعہ جو ہم نے منتخب کیا ہے اور جس کو نظامِ شمسی کہتے ہیں ایسے اجرام پر مشتمل ہے کہ وہ سب ایک صفتِ خاص میں دوسرے ستاروں سے جن کو ایک مجموعہ قرار دے کر نظامِ فلکی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ممتاز ہیں۔ کیوں کہ اس مجموعے کے باہر جتنے ستارے یا آفتاب ہیں ظاہراً زمین سے لاانتہا دوریوں پر واقع ہیں مگر اس مجموعے کے ستارے چنداں دُور نہیں بلکہ ایک اعتبار سے فی الواقع زمین کے قرب و جوار میں ہیں بیان مذکورۂ بالا سے بداہتہً دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ستارے گنبدِ فلک میں نقلِ مکان کرتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ستارے ہم سے اتنے دور دراز فاصلوں پر ہیں کہ فی الواقع قعرِ خلا میں اپنی جگہ پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں اِسی واسطے ابتداءً ان کو ثوابت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ مگر اب یہ نام متروک ہو گیا ہے۔ کیونکہ بڑی باریک بینی اور مشقت کے ساتھ ان کے مواقعِ اضافی کو دیکھتے دیکھتے اب یہ بات قرار پائی ہے کہ ان ستاروں کو بھی حقیقۃً ایک حرکت ہے۔ لیکن دوری کی وجہ سے ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ ان کو خاص خاص صورتوں میں منتظم کر کے ہیئت دانوں نے جو مجموعے قرار دیئے ہیں سیکڑوں برس سے اُن میں کچھ بھی تغیر ظاہر نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ جو اجرام ہمارے اِس آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اُن کا اور حال ہے۔ زمین سے قریب تر ہونے کے سبب اُن کی نقل و حرکت وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہتی ہے اور جو ستارہ جس قدر ہم سے قریب تر اُسی قدر ہماری نظروں میں اُس کی رفتار تیز تر۔ اسی واسطے شروع سے اِن کو سیارہ کہا گیا۔ یعنی چلنے والے ستارے اور اب تک اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اور ستاروں پر کیا منحصر ہے ہماری نظر کا یہی خاصہ ہے کہ اگر بڑے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو دُور کی چیزیں جو اُفق کے قریب ہیں ساکن معلوم ہوں گی۔ اور پاس والی چیزوں میں ذرا بھی کوئی اِدھر اُدھر ہو گئی تو فوراً نظر پر چڑھ جائے گی۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر ہم خود متحرک ہوں تو واقعی حرکت اُن ظاہری حرکتوں کے ساتھ نہایت اشتباہ ہو جاتی ہیں جو صرف ہمارے واہمے نے پیدا کر لی ہیں۔ اور اگر منظور ہو کہ جو مسافت ہم نے طے کی ہے اُس کی سمتِ واقعی کا تصورِ صحیح ہم کو حاصل ہو تو حرکات نفس الامری کا امتیاز رکھنا ضرور ہے۔ زمین کی حرکت کو ستاروں کا ظاہر میں متحرک نظر آنا لازم ہے اور یہ ایک بڑا عمدہ ثبوت زمین کی حرکتِ واقعی کا تھا۔ مگر قدیم ہیأت دانوں نے اِسی سے بڑا مغالطہ کھایا۔ اب چند روز ہوئے کہ واقعی حرکتوں کا امتیازِ صحیح کیا گیا ہے۔ نظامِ شمسی کے ہر ایک ستارے کا بیانِ مفصل عن قریب آنے والا ہے اور وہاں معلوم ہو جائے گا کہ کیسے کیسے عجیب اختلافات ستاروں کی حالتوں میں ہیں۔ حرکتِ دولابی اور وہ حرکتِ دوری جو مرکزِ مشترک کے گرد ہوتی ہے زمانۂ حرکت۔ فاصلہ صورت ابعادِ ثلثہ۔ روشنی اور گرمی کی مقدار سب ہی باتوں میں تو اختلاف ہے۔ ہاں تعجب کی بات یہ ہے کہ با ایں ہمہ کُل ستاروں میں اصولِ واحد کا عمل در آمد معلوم ہوتا ہے۔ اگر اختلافِ مظاہر حیرت انگیز ہے تو وحدتِ انتظام بھی اُس سے کم تعجب خیز نہیں۔ نظامِ شمسی کے کُل اجرام میں زیادہ تر تعجب کی بات یہ پائی جاتی ہے کہ یہ بڑے بڑے اجسام اور بڑے بڑے کُرے جن میں سے اکثر ہماری زمین سے کہیں بھاری ہیں اور خود زمین۔ عرصۂ ہستی میں اُدھر لٹکے ہوئے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ نہایت سرعت کے ساتھ خلا میں چل رہے ہیں۔ فرض کرو کہ ہم زمین سے

الگ خلا میں کسی مقام پر چپ چاپ کھڑے ہوئے اِن اجرام کی سیر دیکھ رہے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ دور سے ایک جسم نورانی
نمایاں ہوا۔ جوں جوں پاس آتا گیا اُس کا قد و قامت نظروں میں بڑھتا گیا۔ اُس کی سطح بیرونی جو لاکھوں کوس کے
گرد میں ہے اس تیزی سے اپنے اُوپر گھوم رہی ہے کہ جس نشان کو تاکو ایک سکنڈ میں نو میل طے کر جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کرہ
سامنے سے ہو کر گزرا تو کس سرعت کے ساتھ کہ توپ کے گولے کی رفتار سے بھی چوبیس گنے تیز۔ مشتری کو اُس کے مدار
میں حرکت کرتا ہوا دیکھو تو یہی کیفیت پاؤ گے۔ وہ تو آفتاب کی کشش اُس پر غالب آتی اور اُس کو روکتی ہے۔ کیونکہ کرہ مشتری
سے کرۂ آفتاب ہزار گونہ ہے۔ ورنہ خدا کی پناہ اِس سناٹے کی رفتار نہیں معلوم مشتری کو عالم شہود میں کہاں کالے کوسوں
لے اُڑتی۔ کہ پھر اُس کا پتہ بھی نہ لگتا۔ علم ہیاۃ سے صرف یہی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پونہچی کہ ستاروں کی یہ عجیب
حرکتیں واقعی ہیں یا یہ کہ زیادہ نہیں تو لاکھوں برس سے ستارے اسی طرح چل رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہی سرعت
رفتار تمام اجرام فلکی کے استحکام اور اُن کے ثبات و قیام کا باعث ہے اگر تم کو سیاروں کی حرکتیں سن کر حیرت ہوتی ہے تو نہیں
معلوم یہ سُن کر تم کیا کہو گے کہ صرف سیّارے ہی گردش میں نہیں بلکہ آفتاب بھی اپنے خدم و حشم سمیت ایسے مدار میں گردش کر رہا ہے
جس کا حال ابھی تک دریافت نہیں ہوا اور بے شک اس کو بھی کوئی قوی الجذب آفتاب یا آفتابوں کا مجموعہ کھینچ رہا ہے۔ اور تمام
ستارے جو بے انتہا فاصلوں کی وجہ سے غیر متحرک نظر آتے ہیں واقع میں وہ بھی مختلف سمتوں میں حرکت کر رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی
یہ بات بھی کھل رہے گی کہ ستارے جو ہم کو نہایت سُست نظر آتے ہیں واقع میں سُست نہیں ہیں۔ ہاں ابھی تک ہم کو صرف یہی
تحقیق ہوا ہے کہ نظامِ شمسی کے سیارے سب سے زیادہ سریع السیر ہیں۔ البتہ اب سے لاکھوں برس میں یہ ستارے جن کو ہم ثوابت
سمجھے ہوئے ہیں اپنا اپنا دورہ ختم کریں گے۔ اُن کی گردشوں کے زمانے ہمارے برسوں کے شمار کے مقابلے میں وہی نسبت
رکھتے ہیں جو ستاروں کے فاصلے زمین کے ابعادِ ثلثہ کے ساتھ اور جیسا کہ ہمبولٹ صاحب نے سمجھا اُن زمانوں پر نظر کرنے سے
عالم ابدی معلوم ہوتا ہے اور اجرام فلکی میں غور کرنے سے جیسا کہ بُعد کے غیر متناہی ہونے کا اذعان ہوتا ہے اُس سے زیادہ زمانے کے
ابدی ہونے کا ہوتا ہے۔ الغرض علمِ ہیاۃ کے ذریعے سے جو باتیں تحقیق ہوئی ہیں اُن کا نتیجہ مختصر یہ ہے جو بیان ہوا۔ اور علوم
جتنے ہیں کیا طبعی کیا مادّی سب کی یہی غرض و غایت ہے کہ انسان اسرارِ قدرت میں غور کرنے کی استعداد بہم پہنچائے۔ اِن علوم
سے اجسام کی ترکیبِ عنصری کا حال منکشف ہوتا ہے۔ عناصر کے امتزاجات اور انتقالات میں قدرت کے کھیل نظر آتے ہیں۔ اور
اجسام کی ہزاروں مفید اور عجیب خاصیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن علموں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادہ کیونکر حضیضِ جمادیت
سے ترقی کر کے اوجِ نباتی و حیوانی پر پونہچتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار انسان بن جاتا ہے جس کے عمدہ ترین خصائص میں کمالِ
وہبی ادراک ہے۔ اور جس نے نورِ علم کے ذریعے سے وہ شرف حاصل کیا ہے کہ تمام اجسام نامیہ میں سب سے زیادہ اکمل و افضل ہے
فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ مگر یہ بات صرف علمِ ہیاۃ ہی میں ہے کہ عالم کو اُس کی عظیم الشان ہیاۃ مجموعی میں جلوہ گر کرتا ہے
تمام عالم کی ساخت کا تصور ہم نے ہیاۃ ہی سے حاصل کیا ہے کیوں کہ علمِ ہیاۃ کرتا کیا ہے کہ عالم کے ہزاروں مختلف عناصر کا ایک
بڑا ڈھانچا بنا کر سامنے کھڑا کر دیتا ہے تا کہ آدمی اس کو دیکھ کر ایسے ازلی اور ابدی اُصول استنباط کرے جن کی منادی
آسمانوں میں پھر رہی ہے ❊

اعظم گڑھ میں ریڈ صاحب سے مخالفت اور صفائی۔

ہمارے مولنا ابھی اعظم گڑھ ہی میں تھے کہ ریڈ صاحب[1] کو لوگوں نے مولنا سے کچھ بدگمان کر دیا۔ کچھ جھوٹی شکایتیں ہوں گی۔ کچھ چغلی کھائی ہوگی۔ مولنا اِس واقعے کے متعلق اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ "میرا حال یہ ہو کہ ایک لمحہ میرا دل نہیں لگتا۔ لیکن ریڈ صاحب کو میری غیبت میں لوگوں نے بدگمان کر دیا ہی۔ کئی مہینے سے میرے کام کی جانچ پڑتال مخالفانہ ہو رہی ہی اور خود ریڈ صاحب بد مزاج ہو رہے ہیں۔ اِس وجہ سے کہ اُن کو مطابق اُن کی خواہش کے جانا نہیں بلا۔ ان وجوہ سے میں درخواستِ رخصت پر مبادرت نہیں کرتا کہ مبادا میرے پیچھے کوئی رخنہ پیدا ہو۔ لیکن جس وقت مجکو معلوم ہو گا کہ اب میرا کام دیکھا جا چکا فوراً رخصت لوں گا۔" دوسری مرتبہ ایک خط میں لکھا۔

"ریڈ صاحب بہادر نے مخالفت شروع کی تھی۔ جب اُدھر سے جوابِ تُرکی بترکی ملا تو شورش فرو ہو گئی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ میرا رخصت لینا ملتوی کیا موقوف رہا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی برس ڈیڑھ برس بدلی بھی نہیں ہو سکتی۔" تیسری مرتبہ یہ لکھا "ریڈ صاحب کی آتشِ مزاجی بر سرِ ترقی ہی۔ پرسوں مجھ سے اُلجھے تھے۔ میں عجیب لااُبالی آدمی ہوں کچھ خبر بھی نہیں ہوتا۔"

پھر ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "اِس وقت ریڈ صاحب کی چٹھی آئی ہی اُنھوں نے رپورٹ کر دی ہی کہ یکم مارچ سے نذیر احمد دوسرے ضلعے میں بھیجا جائے۔ یہاں اِس کی ضرورت باقی نہیں۔ سکندر پور کا کام واٹسن صاحب کے سپرد ہو اور اُن کی تنخواہ کے علاوہ بھتہ قائم مقامی دیا جائے۔ اس واسطے کہ وہی ایک عہدہ دار بندوبست ضلع میں رہے گا اور اختیاراتِ مہتمم بندوبست عمل میں لائے گا۔ اس رپورٹ میں واٹسن صاحب کی بڑی تعریف لکھی ہی اور میری نسبت لکھا ہی کہ اس میں عقل بہت ہی اور کام کرنے کی طاقت بڑی غالباً جس افسر کے ماتحت رہے گا۔ اُس کو

---

[1] جے۔ آر۔ ریڈ صاحب اعظم گڑھ میں مہتمم بندوبست تھے۔ پھر گورنمنٹ کے سکرٹری ہو گئے۔ پھر کمشنر گڈھوال کمشنری سے پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ ابھی تک زندہ ہیں۔ مولنا کے نواسے جو ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پاتے ہیں ان سے ملتے رہتے ہیں مولوی بشیر الدین احمد صاحب اور مولوی عبدالحامد صاحب دونوں سے مراسلت بھی رکھتے ہیں۔ ریڈ صاحب آخر کار ممالکِ مغربی وشمالی کے سینیر ممبر آف دی بورڈ آف رونیو ہو گئے۔ ان کا نمبر لفٹنٹ گورنری کا تھا۔ لیکن سرجان ڈڈبرن ہو گئے۔ ریڈ صاحب کو یہ بہت ناگوار ہوا۔ اور وہ قبل از وقت پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ ریڈ صاحب کی شکر رنجی مولنا سے کسی سرکاری کام کی وجہ سے شاید ہو گی۔ مگر وہ ہمیشہ مولنا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ورنہ یوروپین کلکٹروں کے سامنے نیٹو ڈپٹی کلکٹروں کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ اعظم گڑھ کے قیام میں مولنا کے لڑکے پر ریڈ صاحب کی خاص مہربانی تھی۔ وہ ہمیشہ ان کو اپنے بنگلے پر بلا بھیجا کرتے تھے کبھی کبھی ان کا سبق بھی سنا کرتے تھے۔ اور اکثر ترجمے کی اصلاح دیا کرتے تھے۔ ریڈ صاحب کو جانوروں کا بہت شوق تھا۔ کبوتر۔ قمریاں۔ اور خرگوش مولنا کے لڑکے کو اکثر دیا کرتے تھے۔ اسی محبت سے وہ ہمیشہ ان سے ابھی تک مراسلت رکھتے ہیں جس زمانے میں ریڈ صاحب بریلی کے کلکٹر تھے اور مولنا کے صاحبزادے دہلی کالج میں پڑھتے تھے اُنھوں نے براہِ شفقت خاص طور پر اُن کو بریلی بُلایا اور وعدہ کیا کہ تم کو میں تحصیلداری دوں گا مگر وقت پر یہ نہ گئے اور اب ہ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ وہ ولایت میں ہیں اور یہ ریاستِ نظام میں دوم تعلقہ دار۔ تاہم ریڈ صاحب نے مولوی عبدالحامد صاحب سے جو مولنا کے برادرِ نسبتی ہیں بہت سلوک کیا۔ ان کو خان بہادر کا خطاب لوا دیا بلکہ درجہ اعلیٰ کی ڈپٹی کلکٹری تک پہنچایا۔ انھوں نے مولنا کے نواسوں مشرف الحق صاحب اور ڈاکٹر اشرف الحق ایم۔ بی۔ سی۔ ایچ دونوں پر جو بنِ قیام ایڈنبرا جہاں ریڈ صاحب خود رہتے ہیں نگرانی اور تعلیم اور شفقت اور وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی کی ہی۔ اس سے مولنا بہت ممنون ہیں۔ ان کا پورا نام جے۔ آر۔ ریڈ ہی اور اسی نام کے ایک ہنری اسٹوارٹ ریڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تھے جو مولنا کی علمی لیاقت کے بہت قدردان تھے ۱۲

رضامند کرے گا۔

اِدھر ریڈ صاحب تو مولٰنا کی بدلی کے فکر میں تھے اور اُنھوں نے رپورٹ بھی کر دی تھی لیکن مولٰنا کی تقدیر اُن کے لیئے ایک اَور تدبیر کر رہی تھی۔ گو لمنر ہیوئینز کا ترجمہ "سمٰوات" جس کا ذکر ہو چکا ہی اُس نے مولٰنا کی لیاقت کے جھنڈے شہرت کے ساتھ حیدرآباد دکن میں گاڑ دیئے تھے۔ قسمت کی بات ہی کہ جس کتاب کے ترجمے کے صلے نے مترجم کو مایوس قطعی کر دیا ہو وہی حیدرآباد میں عجیب حسنِ اتفاق سے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دلوائے اور خوش قسمتی کا آفتاب چمکائے۔

خلاصہ یہ کہ مولٰنا سے اور ریڈ صاحب سے اعظم گڑھ میں نہیں بنی۔ مگر جب مولٰنا سرکاری ملازمت ترک کر کے حیدرآباد گئے تو ریڈ صاحب سے صفائی ہو گئی۔ ریڈ صاحب کو مولٰنا کی اُس وقت قدر ہوئی جب کہ وہ وہاں سے چلے گئے۔ قدرِ نعمت بعدِ زوال۔ گو ریڈ صاحب کا طرزِ عمل زمانِ قیامِ اعظم گڑھ میں کیسا ہی رہا ہو۔ لیکن وہ مولٰنا کی لیاقت اور تجربہ کاری اور دیانت داری کے ہمیشہ مداح رہے۔ ریڈ صاحب نو عمر آدمی تھے اور کنوارے یعنی مجرّد۔ اِس وجہ سے اُن کے مزاج میں ایک قسم کی جلدی تھی اور اُدھر ہمارے مولٰنا بھی مزاج کے دھیمے نہ تھے اِن وجوہ سے کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ مگر بعد کے مراسم سے معلوم ہوتا ہی کہ باہمی بہت کچھ خلوص بڑھ گیا۔

ریڈ صاحب کو اُردو سے بہت شوق تھا۔ چنانچہ ہمارے مولٰنا نے حیدرآباد سے اُن کے نام ایک خط لکھا تھا وہ اُردو ہی زبان میں تھا۔ اُس خط کی نقل ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

مولٰنا کا ایک خط ریڈ صاحب کے نام

جناب عالی۔ مَیں اپنے دوسرے خطوط میں ان شاء اللہ آپ پر ثابت کر دوں گا کہ مَیں نے اپنی انگریزی کو جیسی ٹوٹی پھوٹی اعظم گڑھ میں تھی اب تک بھلایا نہیں مگر چوں کہ ابتدائے مفارقت سے جس کو چوتھا برس ہی میرا پہلا عریضہ ہی۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خیالات کو اپنی زبان میں ادا کروں۔ بسٹیر نے آپ کی چھٹی کی نقل دلّی سے میرے پاس دو کرے میں بھیجی اور اُس کے پڑھنے سے وہ پانچ برس آنکھوں میں پھرنے لگے جو آپ کے سایہ عاطفت میں نہایت خوشی اور اطمینان کے ساتھ اعظم گڑھ میں گزرے۔ اگرچہ مفارقت کو بہت دن ہوئے مگر آپ کی مہربانیاں بھولی ہیں نہ بھولیں گی۔ میرا حال اس ملک میں اُس شخص کا سا ہی جو کبھی ناؤ پر نہ بیٹھا ہو اور دفعۃً اُس کو طوفان خیز سمندر میں بادبانی جہاز پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑے۔ بسٹیر کا یہ کہنا کہ مَیں نے اِس ملک کا رہنا ٹھان لیا ہی صرف اس قدر صحیح ہی کہ اُنھوں نے مجکو کبھی کہتے سُنا ہو گا مگر یہاں کے حالات کو خود ثبات و قیام نہیں اور اس حالت میں کوئی رائے جم نہیں سکتی۔ تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ میری طبیعت مطلقًا نوکری سے گریز سا کرتی ہی۔ مجکو یہاں صدر تعلقہ داری کی خدمت سپرد ہی اور یہ انگریزی عملداری کی کمشنری سے بہت ملتی ہوئی ہی۔ تنخواہ وہاں بہت اور اختیارات یہاں۔ مجکو تنخواہ کے بارہ سو ملتے ہیں اور یہ تعلّق بندوبست دوامی بھتہ مالگذاری یہاں کا روپیہ تین آنے کے قریب انگریزی روپے سے چھوٹا ہی اور چیزوں کا نرخ بھی اکثر گراں۔ اِس ملک میں کبھی پارسی متقدر رہے ہیں کبھی مدراسی اور اِن دنوں ہندیوں کا دَور دورہ ہی۔ مگر اس ملک کے لوگ صرف حسد کی وجہ سے ہم لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں انتظام کی مختصر کیفیت یہ ہی کہ ذاتِ نظام کو اس ملک میں حضور یا بندگانِ عالی سے تعبیر کرتے ہیں اور لفظ حضور جو وہاں تعظیمًا بولا جاتا ہی اس کا مرادف یہاں لفظ تقصیر ہی۔ حضور کا سنّ شریف پندرہ برس کا ہی اور اُس وقت تک کہ حضور زمام سلطنت

اپنے دستِ مبارک ہیں لیں نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ایجنٹ ہیں۔ ان دونوں میں جو باہمی اختلاف ہے وہ آپ اخبار میں پڑھتے ہوں گے۔ انتظام سلطنت نواب مختار الملک کرتے ہیں۔ باستثنا امورِ عظیمہ جس میں مشاورت امیر کبیر ضرور ہے۔ ملک بہت وسیع ہے مگر اُس کا ایک بڑا حصّہ جاگیر۔ خود حضور نے جس قدر ملک اپنے واسطے الگ کر لیا ہے وہ صرفِ خاص کہلاتا ہے۔ جاگیر داروں میں سب سے بڑے جاگیر دار امیر کبیر ہیں جن کے خاندان میں حضور کی صاحبزادیاں بیاہی جاتی ہیں۔ اِن کی جاگیر کو لوگ ساٹھ لاکھ روپے سال کا بیان کرتے ہیں اُن سے اُتر کر اکثر مسلمان اور بعض ہندو اور جاگیر دار ہیں۔ صرفِ خاص اور جاگیر از نکل کر جو ملک بچا وہ دیوانی کہلاتا ہے یعنی متعلق بہ دیوان (وزیر)۔
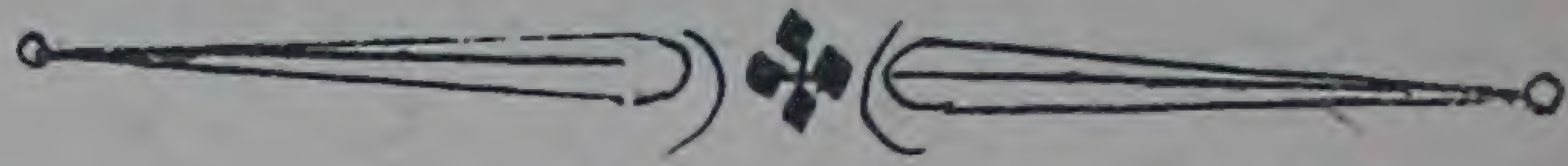
حصّۂ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیدر آباد دکن کی ملازمت اور وہاں کے واقعات

جناب مولٰنا نذیر احمد صاحب نے جس وقت اعظم گڑھ کے قیام میں گولمنز ہیونز (سمٰوات) کا ترجمہ کیا اور اُس کے انعام ہزار روپیے میں جھگڑا پڑا اور ترجمۂ کتاب اصلاح دوستی کے لیئے بذریعۂ ریزیڈنٹ حیدر آباد امیر کبیر کے پاس بھیجا گیا تو اُس وقت کسی کو کیا خبر تھی کہ ترجمے کی وقعت چپکے چپکے حیدر آباد کے علم دوست اور قدرشناس اُمرا کے دل پر پورا قبضہ کر رہی ہے اور مترجم کی عزت افزائی کا سکہ بٹھا رہی ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ فاضل مترجم کو لیوروں صاحب کے عرگ مفاجات نے ایک ہزار روپے کے انعام سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ مگر بعد کو برٹش گورنمنٹ نے وہ رقم دے کر فاضل مترجم کے آنسو پونچھ دیئے۔ غرض ادھر انگریزی گورنمنٹ نے قدردانی کی اُدھر نظام گورنمنٹ کے وزیر سر سالار جنگ مرحوم نے یہ قدر افزائی کی کہ مولٰنا کو ریاست حیدر آباد کے ایک اہم کام کے لیئے منتخب فرمایا۔

کس شخص کی تحریک سے مولٰنا حیدر آباد گئے

لوگ مشہور کرتے ہیں کہ نواب محسن الملک مرحوم کی تحریک نے مولٰنا کو حیدر آباد پہنچایا۔ لیکن ہمارے نزدیک مولٰنا کے انتخاب میں اصلی تحریک سمٰوات (ترجمۂ گولمنز ہیونز) سے ہوئی۔ اور ضمناً نواب محسن الملک مرحوم کی تحریک بھی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ سر سید کے متعلق بھی مشہور ہے کہ مولٰنا کی نسبت انھوں نے تحریک کی تھی اور یہ خبر بمقابلۂ نواب محسن الملک مرحوم کے زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ ہندوستانیوں کی پہلی کھیپ انھیں کی تحریک سے حیدر آباد پہنچی تھی۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ سمٰوات دیکھ کر خود سر سالار جنگ کے دل میں فاضل مترجم کے طلب کرنے کا تقاضا پیدا ہوا۔ جناب موصوف نے عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سے اِس کتاب کے تعلق سے مولٰنا کا تذکرہ سُنا آدمی تھے بیدار مغز کسی اخبار یا گزٹ میں تصنیف و تالیف پر مولٰنا کے انعامات پانے کا حال معلوم کیا ہوگا۔

غرض اول اول مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے فاضل مترجم کو لکھا کہ "وہ سر سالار جنگ آپ کو بُلانا چاہتے ہیں" اسی کے قریب قریب نواب محسن الملک مرحوم کا ایک خط آیا اور بعد ازاں سر سید مرحوم کی معرفت من جانب سرکار نظام اس مضمون کا خط پہنچا کہ "بالفعل ساڑھے آٹھ سو اور بعد کو ایک ہزار بیس روپے ماہوار گورنمنٹ برطانیہ کے سکّے سے ملے گا" سر سید کو جب یہ خط ملا تو مولٰنا اعظم گڑھ میں چار صدی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سر سید نے مولٰنا کو اس کی اطلاع دی مولٰنا اور سر سید

میں ملازمت حیدرآباد کے متعلق جو خط وکتابت ہوئی اُس کا حال معلوم نہیں۔ ہاں مولٰنا نے اپنے فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو جو کچھ لکھا تھا وہ یہ ہے: "اتنی تنخواہ مجکو سرکارِ انگریزی میں تمام عمر پانے کی توقع نہیں۔ دربارِ حیدرآباد ان دنوں بہت ممدوح ہے۔ اختیارات وسیع۔ عہدہ معزز۔ پس تم لوگ مجتمع ہوکر مشورہ کرو اور اگر اجازت دو تو بالفعل ایک سال کے لئے رخصت لے کر جاؤں۔ ذرا بمبئی۔ مدراس۔ حیدرآباد وغیرہ کی سیر کروں۔ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ۔ انگریزوں کی ہمّت پر نظر کرو۔ کس قدر دور کے سفر دریا اختیار کرکے یہاں آتے ہیں اور حیدرآباد تو اپنا دیس ہے۔ سنو بھائی میرا تو جی للچاتا ہے۔ لیکن اب ولولۂ دل میں باقی نہیں کہ تم سب کو ناخوش کرکے چلا جاؤں ✤

حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق اہل وعیال سے مشورہ

غرض کچھ عرصے تک میاں بی بی اور باپ بیٹے میں ملازمتِ حیدرآباد کے متعلق خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اِدھر حیدرآباد سے بھی بہت زور کے ساتھ طلبی ہوئی۔ اُدھر بیٹے نے بھی مجبور کیا تو مولٰنا لکھتے ہیں کہ "تم حیدرآباد جانے کے متقاضی ہو۔ جب میں تمھاری عمروں میں تھا تو مجکو عرش کی سوجھتی تھی ؎ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے اپنا اور اب ✤ لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے ✤ اب صرف اتنی گدگدی دل میں ہے کہ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر ابتدا[1] اً بارہ سو دیں گے اور اَرْذَلِ عمر کے لئے سامان کر دینے کا وعدہ فرمائیں گے تو ان شاء اللہ جاؤں گا۔ لیکن مجکو ایسا احمق مت سمجھو کہ بہت دنیا جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں۔ بشیر اُونیا کو خوب دیکھا۔ غریب محتاج تھا۔ خدا نے مال وا غنی کیا۔ اولاد ہوئی۔ حکومت کے مزے اُڑائے۔ نام وری اور شہرت سے بھی بےنصیب نہیں رہا۔ لیکن انجام اِن سب بکھیڑوں کا کیا ہے؟ آخر فنا۔ آخر فنا۔ اب خداوند تعالیٰ ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لئے بھی کروں ؎ کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے ✤ واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے ✤

حیدرآباد کی روانگی

بہرحال اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولٰنا یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڑھ سے فرلو[2] لے کر دہلی روانہ ہوئے اور وہاں سے اُدھر اُدھر مقامات پر ہوتے ہوئے ۲۷ اپریل کو حیدرآباد فرخندہ بنیاد پہنچکر نواب محسن الملک بہادر کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔

دہلی سے روانہ ہونے کے وقت مولٰنا نے مولوی حاجی احمد حسن[3] صاحب جو مولٰنا کے بڑے داماد تھے۔ اور منشی

---

[1] اخیر عمر ۱۲ [2] وہ رخصت جس میں تنخواہ نہیں ملتی ۱۲ [3] مولوی حاجی حافظ سیّد احمد حسن صاحب دہلوی مولٰنا کے بڑے خویش ہیں۔ یہ صاحب بڑے محدث اور بڑے فقیہ ہیں مولوی سیّد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے ممتاز اور سربرآوردہ شاگردوں میں ہیں۔ چوں کہ مولوی سیّد نذیر حسین صاحب ہمارے مولٰنا کے پھوپیا خُسر تھے اِن ہی صاحب نے مولٰنا کی بڑی صاحب زادی کو مولوی احمد حسن صاحب سے منسوب کرایا۔ مسٹر لی پوار ون رزیڈنٹ میسور نے ہمارے مولٰنا سے خواہش کی تھی کہ کوئی ذی علم مولوی اُن کے پاس بھجوا دیا جائے جسے چار سو روپے ماہوار دیا جائے گا۔ مولٰنا نے مولوی احمد حسن صاحب کا انتخاب کیا مگر مولوی احمد حسن صاحب نے معلوم نہیں انگریزی نوکری کو کیوں پسند نہیں کیا۔ جب مولٰنا حیدرآباد جانے لگے تو ان کو ساتھ لے گئے۔ سر سالار جنگ مرحوم نے مولٰنا کی مددگاری میں مشاہرہ چار سو ماہوار ان کو بھی مقرر کر دیا۔ چوں کہ آدمی ذی استعداد تھے اِن کی علمی لیاقت کا ڈنکا بج گیا۔ آگے چل کر وہ ہشت صدی اول تعلقہ دار ہو گئے۔ اور اب چند سال سے بحصولِ پنشن چار صدی خانہ نشین ہیں۔ یہ صاحب ادیب بھی ہیں کئی کتابیں عربی میں لکھی ہیں۔ سب سے مفید احسن الفوائد اُردو کا ایک حاشیہ ہے جو انھوں نے ایک مترجم قرآن شریف پر چڑھایا ہے یہ چھپ بھی گیا ہے۔ اور اب ایک مبسوط تفسیر کلام مجید کی اُردو میں لکھ رہے ہیں۔ اِس تفسیر کا نام احسن التفاسیر ہے۔ اس کے کچھ حصے شائع بھی ہو چکے ہیں ۱۲

رفیع الدین صاحب کو بھی لے لیا تھا بلکہ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل از روانگی حیدر آباد ان دونوں صاحبوں کو حیدر آباد چلنے کے لیئے آمادہ کر رکھا تھا۔

تنخواہ کا مقرر ہونا اور دورے کو نکلنا

غرض سر سالار جنگ مرحوم نے مولٰنا کی روز روانگی اعظم گڑھ سے ایک ہزار دو سو چالیس روپے کے حساب سے تنخواہ مقرر کی جس میں ہزار روپیہ تنخواہ کا اور دو سو چالیس بھتہ دوامی اور مزید براں دہلی سے حیدر آباد تک کا اول درجے کا کرایۂ ریل اور دونوں ساتھیوں کا دوسرے درجے کا کرایہ اور دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا خاص مولٰنا ممدوح کی ماتحتی میں نوکر کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ملکِ تلنگانہ کے دو ضلعے ناگر کرنول اور نلگنڈہ جا کر ملاحظہ کیجیئے۔ فیل خانۂ خاص سے ایک ہاتھی ساتھ کر دیا اور اُس کا خرچ اپنے ذمّے رکھا پانچ روپے روز اُس کا خرچ تھا۔ لیکن مولٰنا کبھی فیل نشین نہیں ہوئے مولوی احمد حسن صاحب اور منشی رفیع الدین صاحب[1] اور اور لوگ ہاتھی پر سوار ہو کر مولٰنا کے ساتھ دورے میں رہا کرتے تھے اور مولٰنا خود اپنی اُسی پُرانی سواری پالکی میں سوار ہوتے تھے اول اول مولٰنا حیدر آباد میں تقریبًا ایک ہفتہ مقیم رہے اور اس ایک ہفتے میں دو مرتبہ سر سالار جنگ مرحوم سے مُلاقات ہوئی بعد ازاں دورے میں روانہ ہو گئے۔

مولٰنا جب حیدر آباد پہنچے تو اُن کے لیئے وہ ایک نئی دنیا تھی۔ وہاں کے ساز و سامان تزک و احتشام دیکھ کر اُن کو خدا یاد آتا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کی حالت کا جب مقابلہ کرتے تھے تو ان دونوں کو اُس کا عشر عشیر بھی نہیں پاتے تھے۔ شہر میں جا کر جب دیکھتے تھے کہ مارے ہجوم کے تل رکھنے کی جگہ نہیں ملتی اور ہجوم بھی قلی مزدوروں اور بھیک منگوں کا ہجوم نہیں بلکہ نوابوں اور سرکاروں کا جن کی اردلی میں پلٹنیں رسالے اور ہاتھی دوڑتے ہیں تو مولٰنا حیرت کے عالم میں رہ جاتے تھے۔ سرکاری محلوں میں جب مولٰنا جاتے تو ہکا بکا ہو کر رہ جاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ جب مولٰنا کی نظر بد نظمیِ سلطنت پر پڑتی تھی تو وہ بہت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ عمل داری میں اچھا انتظام نہیں اگر خدا نوکروں کو توفیق خیر خواہی دے تو یہ ملک بجائے خود او دھ کا چوگنا ہے۔ اور زمین بعض اطراف میں بلا مبالغہ تین سو روپے بیگہ تک ہے۔ نوکروں کی شوخ چشمی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں۔ جرمانہ کرنے کا قاعدہ نہیں ؛؛

مولٰنا دورے میں کیا کرتے تھے

خلاصہ یہ کہ مولٰنا حیدر آباد میں جلسۂ خطیبی کر کے دورے کو نکل کھڑے ہوئے گویا سفرِ دہلی و اعظم گڑھ ابھی منقطع نہیں ہوا۔ سر سالار جنگ کا تو حکم یہ تھا کہ ناگر کرنول اور نلگنڈہ دو ضلعے ملکِ تلنگانہ کے جا کر ملاحظ

[1] منشی رفیع الدین صاحب مولٰنا کے بہنوئی ہیں جس زمانے میں مولٰنا ڈپٹی کلکٹر بندوبست تھے تو انھوں نے اپنا سر رشتہ دار مقرر کرا دیا تھا حیدر آباد پہنچ کر وہ تحصیلدار ہو گئے اور سالہا سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اِن کے حاکم بالا نے قریب اختتام ملازمت یہ رپورٹ کر دی کہ ضعف بصارت ہو گیا ہے اور اب یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے اور نہ اِن کو سوجھ پڑتا ہے اس رپورٹ پر وہ علٰحدہ کر دیئے گئے۔ یہ صاحب مزاج کے بڑے اکھڑ تھے فورًا وطن چل دیئے۔ اپنی ملازمت کے متعلق کسی قسم کی پیروی نہ کی آخر کار وطن سے طلب کیئے گئے۔ بہت سرسری طور پر آئے اور محکمۂ مال میں حاضر ہوئے۔ ڈنلاپ صاحب بہادر نے جو رونیو سکرٹری تھے اِن سے پوچھا کیا تم اندھے ہو گئے ہو؟ دل جلے تو تھے ہی تڑسے جواب دیا کہ خیر میں تو اندھا ہوں مگر آپ تو خدا کے فضل سے اندھے نہیں۔ یہ عیب ایسا نہیں کہ چھپا رہ سکے ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گو میرا امتحان لے لیا جائے ڈنلاپ صاحب نے اِن سے کچھ پڑھوایا دیکھا تو فراٹے سے پڑھتے ہیں۔ ڈنلاپ صاحب متحیر ہوئے کہ کس طرح ایسی غلط رپورٹ کی گئی اور کہا کہ اچھا تم اپنی خدمت پر واپس جاؤ ہم نے تم کو بحال کر دیا۔ منشی صاحب نے کہا کہ میں ایسی اندھیر نگری میں نوکری نہیں کر سکتا۔ اور اسی طیش میں بجنور چلے گئے اور وہیں خانہ نشین ہیں پنشن کے وہ مستحق تھے اگر چاہتے اور پیروی کرتے تو پنشن مل جاتی مگر وہ کچھ ایسے مستغنی المزاج اور طبیعت کے اکھڑ ہیں کہ آج تک اُلٹ کر خبر نہ لی ۱۲

فرمائیں۔ لیکن مولٰنا جب کرنول کے صدر مقام محبوب نگر میں پونچے تو ایک انگریزی ضلع کرنول وہاں سے قریب تھا۔ بے اختیار جی چاہا کہ وہاں کا طرزِ نظم دیکھیں چنانچہ مولٰنا تنہا وہاں تشریف لے گئے اور ایک ہفتہ قیام کرکے پلٹ آئے۔ اور پھر مولوی سید احمد حسن صاحب اور منشی رفیع الدین صاحب کو ساتھ لے کر دورہ کرنا شروع کیا دورے میں مولٰنا کو یہ بھی حکم ملا تھا کہ کل کچہریوں کے دفتر اور اضلاع کے محبس بھی دیکھیں۔ عہدہ داروں کے نام احکام جاری ہوئے تھے کہ مولٰنا کے سامنے دقیق اور اہم مسائل تصفیہ طلب پیش کرو۔ پس اس اعتبار سے مولٰنا کا دورہ ایک عزت کے ساتھ تھا اور سب حکام ضلع از کہ تا مہ مولٰنا کو اپنا افسر سمجھتے تھے +

مولٰنا کی فارسی رپورٹیں

مولٰنا جو کچھ دیکھتے فوراً اُس کی اطلاع سرکار میں بھیجتے۔ خدا کی قدرت ان رپورٹوں نے سر سالار جنگ کے دل پر بڑا عمدہ اثر کیا اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ مولٰنا بڑے کام کے آدمی ہیں۔ ایک جگہ مولٰنا فرماتے ہیں

"یہ صرف خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم وراہِ ملک سے بے خبر زبان سے ناآشنا۔ دستور و رواج سے ناواقف ہو آتے کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اِس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور میں نے ساری عمر کبھی فارسی نہیں لکھی۔ مجکو تو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی بن پڑی کہ تمام حیدر آباد میں غل مچ گیا اور لوگ لوہا مان گئے +

اگر ہم کو بعض رپورٹیں دست یاب نہ ہوتیں تو ناظرین کو مولٰنا کی اعلیٰ درجے کی فارسی کی لیاقت کا کیونکر یقین دلا سکتے تھے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی مہربانی سے مولٰنا کے دورے کے زمانے کی چند رپورٹیں اور روبکار ہم نے حرفاً حرفاً پڑھے ہیں ہمارے نزدیک اگر کل رپورٹیں اور روبکاریں مولوی بشیر الدین احمد صاحب مہیا کرکے چھپوا دیں تو ان سے بہتر انشا کی کتاب نہیں ہوسکتی۔ آج کل ہندوستان میں جتنی فارسی انشائیں مروج ہیں سب کی سب مولٰنا کی ان رپورٹوں کے سامنے ہیچ اور گرد ہیں جو فصاحت و بلاغت اور روانی اور آمدان کی رپورٹوں اور روبکاروں میں ہے وہ ہماری اچھی سے اچھی موجودہ انشاؤں میں نہیں ہے۔ مثلاً چند فقرے ملاحظہ ہوں +

فارسی رپورٹوں اور روبکاروں کے چند نمونے

(۱) "دوم تعلقہ داروہ کہ می کنند بطور سیاحت۔ روزنامچہ کہ می نویسند بطورِ حکایت۔ دستخطے کہ می کنند ہم چو زلفِ محبوباں اُفتاں وخیزاں"

(۲) تعلقہ داراندور بدیرمی گویند مگر خوب می گویند"

(۳) "تجاویزایں صدر تعلقہ دار مبتدیانِ کم سواد یا منشیانِ بے استعداد مبیضہ می کنند و بوجہ نالیاقتی شان تحریف و تصحیف اصل تجویز میشود۔ آیندہ اگر ایں چنیں امرے و معائنہ شود از سزا درگذر نخواہم کرد"

(۴) رکردی[۱] خراب کردی"

(۵) سالے برانبار پاؤ تیہاد ستخط کردن وامید انتظام داشتن دماغ بیہودہ پختن است۔

[۱] اس کو انگریزی میں ایجر کہتے ہیں یہ بے قاعدہ لکھی گئی تھی اور جا بجا خراب تھی۔ اس پر یہ پرلطف ریمارک کیا ۱۲ [۲] ملک دکن میں رعایا کے پاس صدہا رقم مال گزاری کی بقایا رہتی ہیں اُسے پاؤتی کہتے ہیں صدر تعلقہ داری کے زمانے میں جب وہ کثرت سے پیش ہوئیں تو یہ ریمارک کیا تھا ۱۲

(۶) "تا وقتے کہ کارِ جمعبندی پاک و صاف نہ سازند رفتن نہ قرینِ مصلحت است"

(۷) "خاصیت ماکیاں دارد خود می خورد و بچگانِ خود را می خوراند"

اب ہم ذیل میں دو چار مکمل روبکاریں درج کرتے ہیں۔ یہ وہی روبکاریں ہیں کہ جن کو سر سالار جنگ مرحوم بقول مرحوم شہباز "حیدرآباد دکن میں جہاں فارسی دفتر تھا جناب مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریرات کا وہ زور شور رہا کہ اُن کے روزنامچے اور روبکار۔ اور کیفیتیں اور رپورٹیں اور فیصلے اور تجویزیں مجامع میں اس طرح پڑھی جاتی تھیں جیسے مشاعروں میں غزل۔ سارے دکن میں ایک نواب سر سالار جنگ مرحوم خود مردمی مجسم اور مردم شناس تھے اُن کا یہ حال تھا کہ جناب مولوی مہدی علی صاحب کے نام جو خطوط جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب کے جاتے بالالتزام اُن کو بار بار مزے لے لے کر پڑھتے اور حسنِ تحریر کی داد دیتے" غرض وہ رپورٹیں یہ ہیں۔

(۱) دو روز در محبوب نگر بتنقیح دفاتر مصروف بودم۔ انبارے دیدم پریشان تر از حواسِ دیوانگاں باستثنائے خزانہ کہ ہنوز بوجہ ضیقِ فرصت تنقیح آں باتمام نرسانیدہ ام۔ دفتر ہیچ علاقہ مرتب نیست اگر بر مجموع دفتر نظر کنند باز آں[۱] دفتر کہ در کوچک ترین اضلاعِ سرکارِ عظمت مدار ممالکِ مغربی و شمالی دیدہ ام جزوے بیش نیست با ایں ہمہ ابتری ہا بداں فراوانی کہ بگفتن نیاید ترتیب کاغذ کارے است بے مفاد۔ لاجرم کسے ایں زحمت بے منفعت نہ پسندد۔ در ہر محکمہ عملہ و کارکناں بقدرِ کفایت ماموراند فاماً ہر کسے بیشی طمع دارد۔ ما مردماں در سرکارِ عظمت مدار ہمیں یک دو کس در پیشی دانستیم کہ باختلاف القاب ایشاں را سررشتہ دار و منشی و مثل خواں گویند۔ لیکن دریں ممالک می بینم کہ چوں حاکمے بر کرسی اجلاس می فرماید اکثر عملہ گردِ او حلقہ کنند و مطابق تقسیمے کہ فی مابین شاں معہود است نوبت بہ نوبت کاغذات پیش نمایند۔ چوں از تعددِ شاں پرسشے رفت چندیں نویس برمی شمرند کہ خالد جواب نویس ست و ولید احکام نویس و حامد صاف نویس و محمود زود نویس و فلانے تلنگی نویس و آں دیگر مرہٹی نویس و "ہلم جرا"۔ ماحصل انتظامِ شاں این ست کہ اجلاس آباد و سررشتہ خراب و دفتر تباہ غلطی نخستیں کہ ایں جا شیوعِ تمام دارد این است کہ کارکناں و کارفرمایاں سررشتہ را از دفتر باز نشناسند۔ اہلکاران پیشی کاغذات را فرادیٰ فرادیٰ بر سرِ محافظِ دفتر می اندازند۔ بے خبر ازیں کہ آں بندِ کاغذ برا سہ مقدمہ است جداگانہ یا نہ۔ پس بیچارہ محافظِ دفتر دو گونہ مصیبت دارد در ترتیبِ مثل و نگہداشت آں۔ و چوں پیش از اختتام مقدمہ بیشتر حاجت می افتد بملاحظہ کاغذات متعلقہ جُلِّ اوقات محافظ دفتران مصروف ست در بہم رسانی ایں گونہ کاغذات برای حاکم مجوز و تا ایں طریقِ سلوک ست درستی دفتر چشم نباید داشت ابتری دفاتر ایں ضلع بداں پایہ کہ اگر تبدّلے از حالاتِ آں نگاشتہ آید بجا خود دفترے باید از کارکنان و محافظانِ دفتر کمتر کسے باشد کہ از مفہوم مثل و مقدمہ آگہی داشتہ باشد۔ کَیفَ مَا اتَّفَقَ۔ کاغذ چند بغایت بے تمیزی با یک دگر دوختہ و آں را مثل نام نہادہ تعداد قطعات نہ از فہرستِ مثل می تواں دریافت و نہ از فہرستِ دفتر۔ کاندریں صورت تمامی کاغذات نامعدود و غیر محفوظ اند۔ فہرست ہائے دفتر را اگر ناقص و ناتمام گویم من وجہ ستودہ باشم۔ ایں فہرست نہ خانہ دارد۔ نشانِ سلسلہ۔ عنوان مقدمہ۔ نامِ موضع و پرگنہ و تعلقہ۔ خلاصہ مضمون مقدمہ۔ تاریخ موصولہ۔ تاریخ حکمِ اخیر و مضمونِ حکم۔ تاریخ تعمیل حکم۔ تاریخ مرجوعہ محافظ خانہ تعداد قطعات از ۱۲۸۸[۲] تا

---

[۱] عبدالغفار صاحب ایک دوم تعلقہ دار تھے جنھوں نے رخصت مانگی تو اُن کی درخواست پر یہ لکھا تھا ۱۲

[۲] بمقابلہ ۱۲ ۱۳۵۳ اور اسی طرح اور ۱۲ ۵۹۶ کل ۱۲ ۵۰۹ جیسا اتفاق پیش آئے ۱۲ -

تا سالِ حال سوائے چار خانہ اولیں کہ دراں ہم خانۂ دوم و چہارم را مکرر فہمیدہ اند باقی ہمہ را خالی گزاشتہ علاوہ بریں مثلہائے ایں ضلع بوجہ اختلاط فارسی و مرہٹی و تلنگی کم تر یک رنگ باشند پس بیشتر مثلِ واحد را کاغذے چند در فارسی باشد و چندے دیگر در زبانِ ملکی و تا وقتیکہ ہمگیں کاغذاتِ مختلف الالسنہ بقدرِ تعلق معاملہ یک جا شوند تکمیلِ مثل صورت نہ بندد۔ لیکن ایں جا کاغذاتِ تلنگی و مرہٹی را از کاغذاتِ فارسی جدا داشتہ اند۔ و چوں جز طائفہ برہمناں کسے دیگرے آشنائے زبانِ ملکی کم تر باشد حالتِ دفترِ تلنگی و مرہٹی دیدنی و شنیدنی نیست۔ بعد از تنقیح دفترِ مال متوجہ دفترِ عدالت شدم کہ در مدح عہدہ داران ایں علاقہ مبالغہ می کردند۔ ہمیں کہ فہرست را برکشادم بورطۂ حیرت در افتادم۔ کہ بارِ خدایا کسانے کہ عقلِ شاں از فہمِ عنوانِ فہرستے قاصر ست بدادِ خلق چہ رسند و از ہمیں است کہ بجرم ڈاکہ زنی حکمِ حبس دو ماہ دادہ اند۔ و بسرقۂ قبضۂ شمشیرے کہ بسارق بدور و پیاں راہن کردہ بود سالے کامل بند فرمودہ و از مرہتن سیف مسروق متعرض نشدہ۔ مصیبت زدۂ از گرسنگی جاں بلب رسیدہ خوشۂ چند از کشت مجرت[1] بدزدید۔ خوشۂ چند بوٹے[2] چند بیش نمودہ باشند کہ بپاداشِ آں جزو و راشش ماہ و فی بعض الصور یک سال مقید داشتند و ندیدند کہ چندیں خسارت عائدِ حال سرکار شدہ۔ الحمد للہ کہ من بندہ حاکمِ مرافعہ نیستم مرا از کاغذے باید گفت یکے از صدایں کہ در تمامی فہرست در خانۂ خلاصۂ مضمونِ مقدمہ نوشتہ اند مثل فوجداری فلاں مدعی فلاں مدعا علیہ گویا نزدِ ایں مردم خلاصۂ جملہ مقدماتِ فوج داری واحد باشد و بس۔ برائے درستی دفاترِ مال آں می اندیشم کہ در اول کار بر محافظِ دفتر او دو کس از عملہ معمول بمددگاری و ہند و تا اختتامِ ترتیبِ دفتر ایناں را از کارہائے دیگر معاف دارند۔ ہر سر دفترے را کہ مراد از اں حاکم و افسر بالادست باشد چوں تعلقہ دار و تحصیلدار و غیرہما بتاکیدِ بلیغ می باید فرمود کہ سررشتہ را از دفترِ جدا انگارند جدا دارند و تقسیمِ کار در میانِ عمال بوجہے نمایند کہ زائد از دو سہ کس درستی نمانند بل اگر شخصے واحد ماہر السنہ مروجہ باشد و نظر بر کار مرجوع کار پیشی را سر انجام میتواں داد۔ براں یک کس قناعت ورزند۔ بکارکنانِ دیگر مدے از مدات کار خاص کردہ فہرستِ عمال پیشی و اہلمدانِ محکمہ بصراحتِ کارہا کہ بہر واحد اختصاص یافتہ بصدر ارسال دارند۔ ہر اہلمدے فہرست مقدمات آں مدِ خاص حسبِ ذیل ترتیب دادہ باشد۔ آغاز و دورانِ مقدمہ تا تکمیل۔ نشانِ سلسلہ وار۔ نام مدعی۔ نام مدعا علیہ۔ خلاصۂ مقدمہ۔ قسمِ مقدمہ۔ تاریخ دائر شدنِ مقدمہ۔ تاریخ اختتامِ مقدمہ۔ خلاصۂ حکمِ اخیر۔ تعدادِ قطعات۔ تاریخِ ادخالِ مثل بمحافظ خانہ۔ رسیدِ محافظِ دفتر۔ اہل کارِ پیشی جملہ کاغذات را بعد تحریرِ حکم و ثبت شدنِ دستخط حاکم در میانِ اہلمداں تقسیم نمایند و ایشاں ہمیں کہ کاغذِ جدیدے کہ با مقدماتِ متدائرہ سابق تعلق نداشتہ باشد آں را بنائے مقدمہ جداگانہ قرار دادہ شش خانۂ اولین فہرست یک جائے پُر کردہ و فہرستِ مثل با کاغذ مذکور منسلک نمودہ آں را در طبقے جداگانہ گزارند۔ و اگر کاغذے یابند کہ با مقدمۂ متدائرہ تعلق دارد آں را با دیگر کاغذاتِ مقدمہ منسلک داشتہ در فہرستِ مثل داخل سازند و بس۔ و ہمیں عمل کردہ باشند۔ تا آں مقدمہ من کل الوجوہ انفصال یابد آں وقت باقی خانہ ہائے فہرست یک جائی پُر کردہ اندرون ہفتہ یا در صورتِ دورہ اندرونِ دو ہفتہ مثل را با خذِ رسید حوالۂ محافظِ دفتر سازند۔ الغرض ترتیبِ مثل و نگہداشت آں تا انفصال بذمۂ اہلمد ست و محافظِ دفتر را دراں مدخلے نے لیکن ہر گاہ کہ مثل بعد اختتام بدستِ محافظِ دفتر می رسد باید کہ بمقابلۂ فہرست منسلکہ مثل شمار

---

[1] جوار [2] یوں بمعنے وانگ۔ سعدی فرماتے ہیں ؎ دست دراز از پئے یک حبہ سیم ؛ بہ کہ ببرند بدانگ و دو نیم ۱۲

از کاغذات برگیرد و بر فروگزاشت دستخط وغیرہ نظر کند اگر نقصے یابد مثل را بااہلمد واپس دہد کہ بعد رفع نقص بیارد ورنہ داخل فہرست یک جائے خود نماید۔ مقدمات کہ فی الحال دائر باشند جملہ کاغذات این چنین مقدمات بااہلمد سپردہ شوند۔ تعلقداران وصدر تعلقہ داران ہنگام دورہ بینند کہ دفتر بدرستی داشتہ اند یا نہ۔ وچوں بر غلطی وقوف یابند باصلاح بردارند کہ مردمان این جا از کوچۂ انتظام نابلد۔ لیکن تاہم تربیت پذیر ہستند۔ الزام خرابیٔ دفتر نہ تنہا بر گردنِ محافظانِ دفتر ست بل خود تعلقہ داران وصدر تعلقہ داران ہم خود را بری الذمہ نتوانند کرد۔ پریشانیٔ دفتر گواہ است کہ گاہے فی زمانٍ من الازمنہ کسے برسرِ این مظلومِ خموش نرسیدہ واگر رسیدہ بدادِ او نرسیدہ۔ ہر آں قدر کہ گفتہ شد بشرطِ نگرانی سر دست برائے ترتیبِ دفتر کافی خواہد بود بل مناسب می نماید کہ دستور العمل محافظ خانہ ہا وسررشتہ ہا منضبط شدہ اجرا یابد۔ روبکار بحیثیتِ اطلاعِ سرکارِ عالی وبامیدِ صدور احکامِ مناسب بخدمت معتمد صاحب جناب مدار المہام دام دولتہٗ ترسیل یابد +

(۳) مولانا نے جب ناگر کرنول کے دفترِ انعام کا معاینہ فرمایا تو اُس کے متعلق جو کیفیت لکھی تھی وہ یہ ہے۔

دیروز کہ از کرنول[۱] واپس آمدہ بناگر کرنول[۲] رسیدم بہ تنقیح دفترِ انعام پرداختم۔ کارے ست بے سر و پا مشحون از غلطیہائے فراواں و گوناگوں۔ ہمیں کہ از تحقیقِ انعامات سخن سر کنند ذہن ہر کودن تبادر خواہد کرد باین کہ برائے اجرائے این چنیں کار بنیادے باید و آں نیست۔ مگر فہرست ہر گونہ جاگیر وانعام ومقطعٰ وسیر سے یومیہ وغیرہ کہ از پٹواریاں گرفتہ باشند کہ بے این چنیں فہرست در راہِ تحقیق گامے فراتر نتواں نہاد۔ از ابتریِ دفترِ انعام این ضلع ناگر کرنول چہ گویم کہ خود فہرست مذکور کہ دفترِ انعام را بجائے بسم اللہ است ندارد۔ از بے ترتیبی کاغذات روزنامچہ ورسید ہا وغیرہ بخر وشتم کہ جز انضباطِ کار منفعتے ندارد کاغذات کہ کالبد این دفتر را بمنزلۂ اعضاء رئیسہ باشند سہ تا فہرست ہستند و بس۔ فہرست مرجوعہ۔ فہرست منفصلہ۔ نقول تختہائے منفصلہ۔ چوں بایں سہ رجوع آوردم بے مبالغہ می توانم گفت کہ حرفے و رقمے صحیح نیست۔ فہرست ہا نہ بمقابلہ یک دگر منطبق اند و نہ فی نفسہا درست ومکمل۔ جا ہا سلسلۂ ایشاں منقطع نشاں ہا است کہ مکرر یا متروک واقع شدہ۔ نقولِ تختہ ہا از اصلِ خود مختلف وبسیار مختلف۔ بر بسیارے از تختہ ہا ثبت ست کہ تختۂ دیگر متعلق انعام فلاں کس برائے این تختہ فرستادہ شد لیکن آن تختۂ دیگر پیدا نیست وباوجودیکہ این تختہ راہم داخلِ فہرستِ منفصلہ کردہ اند لیکن نشاں نتوانستند داد کہ بہ ثبت کدامی نشان فرستادند۔ دریں کہ اندکے از آں بیان کردم اندازۂ از کار بر گرفتن محال ست کہ چہ قدر بودہ است وچہ قدر باقی ست چار کس دریں دفتر مامور اند و کار کہ ہست سہل وسلیس ست لیکن کس پروائے آں ندارد کہ ساعتے چند مصروف بکار باشد۔ ستوہ آمدہ ام ازیں تنقیح کہ خونِ جگر خوردن ست۔ ودندانِ خشم درکف افسوس فرو بردن۔ سرزنش وملامت نہ تازیانۂ غفلت ایں مردمان ست۔ کہ چوں از پیشِ من بیروں روند بر روے یک دگر خندند۔ و تنقیح را بہ مستخر افسانہ سازند۔ بیقیں می دانم کہ تنقیح بارہا دیدہ اند شوخ چشمی وبے آزرمی پیشہ گرفتہ۔ پس مناسب می دانم کہ بر تمام عملۂ این دفتر کہ ابتریِ آں ممکن الاصلاح نیست یک ماہانہ تنخواہ جرمانہ نمایند۔ تا دیگراں عبرت پذیرند۔ واینان ہم آیندہ خبرے از کارہائے منصبی گیرند۔ نادیروز درستی

---

[۱] مدراس پریسیڈنسی کا ایک ضلع ہے جو ساحلِ دریائے تنگ بھدرا پر واقع ہے ۱۲ [۲] ممالک محروسہ سرکار عالی نظام کے ایک ضلع کا نام ہے جو اب ضلع محبوب نگر کے نام سے موسوم ہے ۱۲ [۳] گانؤں کو کہتے ہیں ۱۲

این دفتر اندیشہ می کردم لیکن چوں بسیارے از مثل ہا بدفتر مہتمم دریافت انعامات بانشان ہائے غلط رواں گردند فساد وسے کہ ہست واصلاح پذیر نیست۔ لیکن باید کہ اکنوں از پٹواریاں فہرست ہر گونہ انعامات گرفتہ بازاز کاغذات جمع بندی فراہم آوردہ کتابے ترتیب دہند وآں را فہرست انعامات تحقیق طلب نام نہند۔ وہم مقدمات مرجوعہ را در فہرستے جدید بہ نمونہ کہ ہست بحذفِ خانۂ نمبر رقم سالانہ داخل نمودہ سلسلۂ نو برائے مرجوعہ ومنفصلہ وتاریخ در فہرست تحقیق طلب کردہ باشند۔ چوں برائے تنبیہ عمّالِ سزائے جرمانہ کہ تجویز کردہ ام منظور فرمایند۔ عہدہ دارانِ بالادست را ہم کہ ایں گونہ تباہی کار پیشِ نظر شاں می رود وگاہے متصدیِ انتظام نشدہ اند بطرزے کہ مناسبِ حال شاں باشد بریں باید داشت کہ وقتاً فوقتاً از نیابت بدفتر خبرے گرفتہ باشند۔"

(۳) ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

"ہر چند گزرم بر بیابانے کہ مسکنِ قوم چنچواڑ[1] می باشد اتفاق نیفتاد وبوجہ اشتغال بہ امور دیگر امید نیست کہ در سلسلۂ ایں سفر کہ از نامساعدت موسم عن قریب انقطاع پذیرست باایں قوم بادیہ گزیں ملاقی شوم۔ فامّا در ضمنِ تحقیقاتِ عامّہ از حالات وحکایات ایں قوم بحال علوق مستفسر بودہ ام آں چناں بدریافت رسید کہ قریب ہزار تن ازیں مردماں در بیابانِ گودل[2] وامرآباد[3] بود وباش ورزند وہموارہ از جائے بجائے نقل مکان می کنند ودر حوالیِ مساکن چندے روزہ جُرت ودیگر اجناس بالخصوص سیم ہم بے منتِ آلات کشاورزی می کارند حالتِ قوت شاں از بیخ اوار خود روئیہ بیابان ست ہیچو چنچو گدّھ[4] کہ زیرِ زمیں نشوونما یابد۔ وگلِ مہوہ وخاکستر پوست درخت تمر ہندی وثمرِ تمر ہندی واقسامِ شالی خودرویہ وتیندو یعنی ثمرِ درختِ آبنوس وسیتا پھل[5] وچرونجی وگل وبار درخت بھلاواں فیض روزی رسانِ عالم بداں عموم ست کہ ایں آدم صورتان وحوش سیرت را ہم معطل نگزاشتہ وآب ورزقِ شاں بر شہد وشکار گماشتہ۔ ای خوشا چنچوڑاں کہ بشہد شیریں کام وبشکار لذت چشِ سید الطعام[6] می باشند نامردماں کالاباعن جدٍ خو کردۂ بند تمدّن ہستیم پنداریم کہ چنچوڑاں بہ بدحالی می زیند وایں پندار بداں ماند کہ طیور ہوا بر ماہیانِ بحر رحمت آرند۔ لیکن نظر بر حقیقۃ الحال معاملہ منعکس ست۔ چنچوڑاں را شنیدم کہ بمقابلۂ مامردماں توانا تر باشند۔ دیر تر زیند۔ بچگاں بسیار پیدا آرند۔ بیش بریں نیست کہ ہنوز جمعیت کوتوالی ضلع ناگر کرنول را خیالے در سر گرفتہ وبرائے آں کہ پئے تحقیق حال برود باطلاع سبقت نمودہ۔ واو از ذرائع آگہی خویش ہیچ خبر نمی دہد کہ ایں افسانۂ مصیبت در گوشِ او کہ فرو خواندہ چوں از مرگ بے کسی صدہا بندگانِ خدا شنید خود بر سرِ چندیں کس رسید وچہ کرد وچہ دہد۔ من بندہ از کسانے کہ با چنچوڑاں مزید آگہی ورزید بتحقیق دریافتہ ام کہ ایں مردماں بحالِ خود خوش می گزارند۔ چنچو گدھ نہ جنسے ست کہ بر ابرو باراں انحصارے داشتہ باشد بل ایں چیزے در زیر تالاب ہا پیدا آید وسالہا بیاوری رطوبتِ ارضی بالدو افزاید وانبارہا ازیں قسم در تہ زمین مدفون است وکس خبر چنچوڑاں بریں گنجینۂ قدرت راہ نیابد۔ ودیگر پیداوار صحرائی کہ شایان متصرفِ شاں باشد خود محرز ومحفوظ نیست۔ ونہ کسے مانع ومعترض حال چنچوڑاں می باشد۔ معاووے چند از درختانِ تمر ہندی بے شمار ست کہ متکفل رزق چندیں بودہ باشند۔"

(۴) روبکار جہتِ اطلاع جناب مدار المہام سرکار عالی بخدمت معتمد صاحب علاقہ مالگزاری شرف تبلیغ یابد۔"

---

[1] ایک خانہ بدوش اور صحرائی قوم کا نام ہے ۱۲ [2] و [3] گودل اور امرآباد شاید دو پرگنے ہیں۔ ان کے چاروں طرف دو بڑے بڑے جنگل ہیں ۱۲
[4] اریا شکر قند یا زمین قند کے قسم کی چیز ہوتی ہے ۱۲ [5] شریفہ ۱۲ [6] گوشت ۱۲

صباح فردا بعزم نلگنڈہ ضلع ناگر کرنول را خیرباد گویم۔ حسرتے کہ با خود می برم این کہ ناسورہا دیدم و مرہمی نتوانستم نہاد۔ عقدہائے معضلہ[1] یافتم بناخنم کشاد۔ اصلاح مفاسد نہ کار روزہا و ماہہاست۔ سالہا باید کہ مالکان حل و عقد امور جبل[2] ہمت بریگاں یگاں علاقہ وصیغہ محصور و مقصور دارند تا کیفیت انتظام پیدا آید۔ خدمتے کہ برمن بندہ دریں دورہ مسلّم ست بداں ماند کہ طبیبے تشخیص امراض فرماید و بیماراں را بر علل و امراض شاں مطلع نماید و پندارد کہ شرائط طبابت بجامی آرد۔ و او بزعم خود دل شاد لیکن مریضان بیچارہ بر آئین سابق در فغان و فریاد۔ دو ہفتہ در نرکھوڑہ[3] قیام ورزیدہ خون جگر خوردہ ام۔ و اگرچہ در عہدہ داراں ضلع و قسمت منسلک نیستم فاما از طول قیام باآں پٹی تعلقے خاص بہم رسانیدہ۔ باران رحمت الٰہی باریدن گرفت و زمان کشت و کار بر سر رسید۔ لیکن ہنوز از انتظامے کہ اندیشیدم خبرے و اثرے پیدا نیست۔ لاجرم کاشتکاران پٹی در انتظار منظوری و نامنظوری انتظام متحیر و معطل نشستہ التماس آں کہ ہراں چہ دریں خصوص کردنی و فرمودنی ست بلا تضییع وقت برروئے کار آوردہ شود مبادا کہ وقت از دست رود و حسرتے باقی ماند۔"

(۵) یا مثلاً ۱۳ جمادی الثانیہ ۱۲۹۴ھ کو ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

آئین اسکیل[1] و آباپٹی[2] با فضیحت ہا کہ دارد داغے است زشت کہ بر ناصیۂ انتظام مالگزاری ایں ممالک جا کردہ۔ چوں کمی و بیشی اسکیل و آباپٹی وابستہ وصول مال گزاری می باشد در ضبط اوطان[*] زمین و عطاے اسکیل نقد بجاے آں امداد و اعانت پٹیلان و پٹواریاں و دیگر وطن داراں در جمع و جبابت[3] خراج امید کردہ باشند۔ لیکن تجربۂ چندیں سال گزشتہ گواہ ست کہ نتیجہ نہ بروفق آرزو و حسب دل خواہ است۔ البتہ در وطن زمین و ایصال مبلغ معلوم از خزانہ عامرہ سرکار تفاوت نسبۃً تا نقد و تفرقہ رنج تا راحت می باشد۔ لیکن ایں نسبت کہ گفتہ شد از مقولۂ اضافت است زمین کہ سالے دوبار بار آرد و رزق رساند بہتر از نقدے کہ سالہا در انتظار نشاند۔ عاملانے کہ باوجود اختیار کامل و اقتدار مطلق بے باکانہ دست خیانت بر اموال مخزونہ سرکار دراز دارند عقل باور نکند کہ زر نقدے در دست آرند و بحق داران سپارند۔ نہ اطرا[4] ست و نہ مبالغہ کہ از زرہائے مرمت و اسکیل و آباپٹی سہ ربع وقف تاراج است و ربع باقی در یوزہ محتاج۔ ظاہر است کہ انسداد ایں چنیں خیانت عام ممکن نباشد۔ مگر آنکہ عہدہ داران موتمن[5] سالے چند متواتر در روے خود تقسیم فرمودہ باشند تا یابندگاں عادت گیرند۔ و رسانندگاں عبرت پذیرند و رسم بد نہیب[6] و غارت از میاں خیزد۔ لیکن کرا دماغ آں کہ زحمت بر خود گوارا کند لاجرم تقسیم اسکیل و آباپٹی را خاطبۃً مسدود کردند و جائے کہ مسدود نکردند در پے آں می باشند کہ مسدود کنند تدبیرے کہ ایں تعلقہ داران غیور نام جو اختیار کردہ اند یاد می دہد ازاں کہ در ممالک سرکار عظمت مدار حاکم ضلعے بودہ سفید و سادہ لوح و در حد علاقۂ او ہر سال میلۂ عظیمے فراہم آمدے و خرید و فروخت ہر گونہ مال و متاع را روز بازار بودے۔ دزداں

---

[1] اسکیل انگریزی لفظ ہے بمعنی پیمانہ۔ سرکار نظام کے دیہات میں زر مال گزاری کے وصول کے لیے ایک عہدہ دار رہتا ہے جسے پٹیل کہتے ہیں اور ان لوگوں کے حقوق وطن داراانہ اور متوارث ہوتے ہیں۔ پٹیل کے علاوہ پٹواری حساب کتاب لکھنے کے واسطے رہتا ہے۔ یہ دونوں وصول مال گزاری کے مشترکا ذمہ دار ہیں اس کے علاوہ پولیس پٹیل بھی رہتا ہے جو گاؤں کے حفظ امن کا نگراں رہتا ہے ان لوگوں کو بطور معاش وصول زر مال گزاری پر فیصدی دس[5] روپیہ ملتا ہے اسی معاش کا نام اسکیل ہے کیونکہ اس کی قرارداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ۱۲ [2] آباپٹی۔ پٹی بمعنی ٹکس۔ آباپٹی اس ٹکس کو کہتے ہیں کہ جز زر مال گزاری پر فی روپیہ آدھ آنے کے حساب سے رعایا سے وصول کی جاتی ہے یہ حق پٹواری اور پٹیل کا ہوتا ہے ۱۲ [3] جبابت جمع کردن ۱۲ [4] اطرا بمعنی تعریف ۱۲ [5] موتمن بمعنی امین ۱۲ [6] نہیب لوٹ مار ۱۲

[1] عقدہائے معضلہ یعنی گرہوں کو کہتے ہیں ۱۲ [2] ... [3] ایک مقام کا نام ہے ۱۲ [*] جمع وطن ۱۲

وحراسیان بر ضعف رائے حاکم بے پروا قوی دل شدند و دست تاراج کشادند تا آنکہ حکایت ہا بہ بلاد و امصار بردند و افسانہا بہ کاغذ اخبار۔ چوں ایں خبر بحاکم سبک سر رسید اشتہار درداد کہ آنانکہ قصد میلہ دارند از نقد و جنس جز ناگزیر نیارند کہ حفظ صیانت را بہتر ازیں تدبیرے نیست۔ الغرض اسکیل و آیاپٹی رقمے است کہ یابندگاں سالہا باُمید وصولش چشم سفید کنند و چوں بعد انتظار بسیار صلائے تقسیم بگوش خورند بنامے ازاں قناعت کنند۔ پس ایں گونہ رقم را کہ وعدہ ابلہ فریب بیش نیست نقد نام نہادن ازاں قبیل ست کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ مایوس از وصول اسکیل پٹیلاں و پٹواریاں زمین ہا کاشت کنند و دائما بقدر اسکیل باقی دارند۔ و تحصیلداراں باطمینان آں کہ آخر کار رقم اسکیل جمع و خرچ کردنی ست بر تحصیل ایں گونہ باقیات متوجہ نشوند۔ و بسیارے از پٹیلاں و پٹواریاں بحیلہ آں کہ سرکار اسکیل شاں دیرد ہد بر کاشتکاران علی قدر استطاعتہم تفریق نمودن اسکیل خود بل فی بعض الاحیان اضعاف آن وصول کنند و وانمایند کہ بوام خواستہ اند۔ بالجملہ چوں بغور کار رسند آئینِ اسکیل و آیاپٹی عمل کاغذے بیش نیست و ہر گاہ مستلزم انواع مفاسد می باشد اصلاح فوری از واجبات“

(۶) یا شلاً جب مولانا صدر تعلقہ دار سمت شمال تھے اُس وقت ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

مستعجل بودم بروانگی اندور مگر مخاصمت دوم تعلقہ دار با تحصیلداران میدک و ٹیکمال نگزاشت کہ شتاب روم۔ دوم تعلقہ دار با مزاجے دارند ہر کہ ور آمیخت در آویخت شش ہفت کس از تحصیلداراں می توانم شمرد کہ از دست ایشاں بودہ اند شاکی و گلہ مند کم اختلاطی شیوہ ایست محمود ولیکن نہ ایں قدر کہ پنج سال کامل شخصے حاکم بقعہ باشد و ہیچ کس را از اعالی و اوادنی باور سائی نہ بلکہ ہر آں کہ بزرگوار تر در نظر دوم تعلقہ دار خوار تر۔ مثلاً مشائخ صاحب ٹیکمال۔ نگویم کہ با ایں گروہ چار و ناچار ارادت باید داشت لیکن سوء ظنہ چوں بہ تعصب منجر شد۔ ہر آئینہ حاکم را از جادۂ نصفت بلغزاند۔ چنانچہ در معاملہ و مفادمہ نظم و نسق مشائخ صاحب از دوم تعلقہ دار لغزش ہا مشاہدہ شد۔ مدت ہا بر حالِ دوم تعلقہ دار تامل می کردم۔ آخر چوں در خوردم پے بہ اصل مطلب بردم کہ بجود غلط واقع شدہ اند بدرجۂ افراط خدمتِ عالیہ را دوں مرتبت خود می دانند۔ و می گویند کہ تن بقبول ایں خدمت محقرہ در ندادم مگر بدو شرط یکے قیامِ میدک کہ نزدیک است از بلدہ۔ دوم وعدہ ترقی اعجل۔ بجوش آرزوئے ترقی آنچہ یاد می کنند یاس ایں خیال بوز افزوں بہ منتہائے غایت رسیدہ۔ خلق خدا مبتلائے آفتِ خشک سالی بود دوم تعلقہ دار صاحب ترو خشک را مساوی شمردہ رتق و فتق صفاتی را ذاتی می انگارند۔ چوں چشم الضاف پوشند پروائے رفاہِ مردم ندارند۔ چوں جریب زمین مزروع گزشتہ ممنوع برعکس قاعدہ کردند۔ ہمچو معذب ناگہانی بر ہر روی نازل شدند بہ الزام ادعائے مصادرہ نمودند ایں گونہ خود یافتند۔ لاجرم برائے استرضائے حاکم و تکثیر جماعت ہمدرداں اضافہ را مضاعف داشتند و جرمانہ ہائے نامنصفانہ و بے جا۔ در تعلقات بہ مقدارے رسید معتدبہ۔ بہ تمسک ہمیں کار گزاری درخواست ترقی۔ کفیل حصول خدمت بیان مجرد۔ ہیچ یک شایستہ اعتبار و اعتماد نیست۔ عملہ از کربت راہ غربت گرفت۔ و تنازع بہ چار سوئے جہاں فاش و منتشر و محافظ بہ چار سوئے تعلقہ دویدند۔ اہل دیہ مستطیع وذی حرمت منصدع محتاج بیان نیست سکتے برہم زن عافیت خلائق

[1] ضلع کا نام ہے وسط ہند میں اسی نام کی ریاست ہونے سے اِس کا نام اَب نظام آباد ہوگیا ۱۲ [2و3] ضلع میدک کی دو تحصیلوں کے نام ہیں ۱۲
[4] عدل و انصاف ۱۲ [5] بستن و کشادن [6] اندوہ و غم ۱۲

وعجب تر آنکہ قطع و برید کاغذ بے اطلاع و اجازت این فعل رستہ است - بہ جاؔل[1] اگرچہ تحصیلدار میدک و ٹیکمال مستظہر می بودند خدانیکو تر داند کہ دوم تعلقہ دار چہا می کردند - تحصیلدار ٹیکمال امسال نجات یافت کہ تعلق او بہ اختتام جمع بندی بود منقطع شد مگر وائے بر بدبختی تحصیلدار میدک کہ تعلقۂ او تابع دوم تعلقہ دار است ہیچ پہلو از تقبیح و تذلیل و تصدیع و تکلیف نیست کہ با او عمل نیامدہ باشد - اگرچہ کارروائی دوم تعلقہ دار مطوّل و مدلّل کہ فردِ منسلک بر صراحت آں مشتمل ست برائے معطلی شاں برمن متقاضی می شد - مگر بہ نظرِ اتمام حجت بر تنبیہ قناعت کردم اگر باز آیند بہتر ورنہ خوے بد سرانجام بد"

رپورٹوں اور روبکاروں کا نتیجہ اور سر سالار جنگ کی رائے

غرض ان روبکاروں میں علاوہ شستگی و روانی و عبارت آرائی کے یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ جس صیغے کو مولٰنا ملاحظہ فرماتے تھے اُس کے جزو کل پر نگاہِ تجربہ پڑتی تھی - آخر کار اس دَورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رپورٹ میں مولٰنا نے نہایت صاف صاف الفاظ میں لکھا کہ اس ملک کی حالت بندوبست کے لائق نہیں - اول تو تلنگانہ ویرانہ بہت ہے - لاکھوں بیگہ بنجر پڑا ہے - آدمی نہیں کہ اُس کو جوتے - علاوہ اس کے بندوبست کے لیئے وقت اور روپیہ بہت درکار ہے - ایک ضلع کے لیئے سات برس کم سے کم چاہیئیں اور اسی طرح کم سے کم پندرہ لاکھ روپیہ اور سرکارِ نظام میں اتنا سکت نہیں کہ اتنے بڑے مصارف کی متحمل ہو سکے پس میرے نزدیک سرسری بندوبست و نظری ورواروی پیمایش کر کے کاشت کاروں کے ساتھ دَہ سالہ قول کر دیا جائے مولٰنا کی یہ رائے سر سالار جنگ مرحوم کے دل میں کھب گئی تھی اور زیادہ اثر کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ناظم بندوبست ہو کر مولٰنا نے ایسی رائے ظاہر فرمائی کہ جو بظاہر اُن کے مطلب کے خلاف تھی - خلاصہ یہ کہ مولٰنا ابھی نلگنڈہ ہی میں تھے کہ دفعتہً یہ حکم صادر ہوا کہ "تنہا ایک دن کی ڈاک بٹھا کر چلے آؤ - سرکار کو تم سے کچھ کہنا ہے" مولٰنا یہ حکم پاتے ہی گھبرا گئے اور دل میں کہا کہ "الٰہی یہ کیا ماجرا ہے" نلگنڈہ سے حیدرآباد تک خدا معلوم کیا کیا خیالات مولٰنا کو پریشان کرتے رہے - کبھی مرہٹی گھس گھس کے نقشے دل پر جمتے تھے - کبھی ہندوستانی ریاستوں کی بے قاعدگی پریشان کرتی تھی - مگر باوجود ان تشویشوں کے مولٰنا کا دل اُس معاہدے سے مضبوط تھا جو مابین سرکارِ نظام اور ہمارے مولٰنا کے ہوا تھا اور وہ یہ تھا کہ "سرکارِ نظام مولٰنا کو برطرف نہیں کر سکتی - بندوبست ہو یا نہ ہو تنخواہ مِلا کرے گی"

مولٰنا کی رائے سے نواب محسن الملک کو اختلاف تھا

مولٰنا نے نیک نیتی سے جو کچھ رائے بندوبست کے متعلق ظاہر کی تھی اُس سے نواب سر سالار جنگ مرحوم کو تو کُلّی اتفاق تھا - لیکن نواب محسن الملک مرحوم کو مولٰنا کی اس رائے سے اتفاق نہ تھا - نواب محسن الملک چاہتے تھے کہ بندوبست ہو اور یہ کام مولٰنا کے سپرد رہے - مگر ہمارے مولٰنا ایسی غلط رائے کیوں دینے لگے تھے جس سے سرکارِ نظام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اِس کے سوا غلط رائے کا دینا داخلِ بددیانتی بھی تھا - تاہم ہندوستانی ریاست ہونے کی وجہ سے مولٰنا قطعی طور پر مطمئن بھی نہ تھے - مولٰنا نے عہدہ دارانِ اضلاع کی بے ضابطگیاں اور چوریاں بہت پکڑی تھیں اور نواب سر سالار جنگ کو صاف لکھ دیا تھا کہ لوگوں نے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے - مفصلات میں سخت خرابی ہے - الغرض مولٰنا

[1] جال بمعنے دام ۱۲ -

دُورے پر سے بگہ وتنہا حیدر آباد پونہچے نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو بُلا کر فرمایا" بندوبست کی نسبت آپ کی راے انتظام کے خلاف ہے اور مَیں آپ کی راے کے ساتھ متفق ہوں۔ پھر سوائے اس کے کہ آپ صدر تعلقہ داری کریں اور کوئی عہدہ آپ کے لائق نہیں "

مولٰنا نے عذر کیا کہ

" بندوبست ایک محدود اور منفرد کام ہے اور اُس کی نگرانی چنداں دشوار نہیں۔ لیکن صدر تعلقہ داری میں بڑی جواب دہی اور ذمہ داری ہے اگر مَیں اس کو اختیار کرلوں تو علاوہ محنت کے چار صدر مدار المہاموں کی ماتحتی ایک عذاب ہے۔ مَیں اِس خدمت سے معاف رکھا جاؤں مَیں اُسی خدمت کو پسند کرتا ہوں جس کے لیئے بُلایا گیا ہوں"

لیکن نواب سر سالار جنگ بہادر نے بہت اصرار کیا اور خاص مہربانی سے دو سو کا اضافہ بھی منظور فرمایا اس پر بھی مولٰنا نے اِنکار کیا تو نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا۔

" بارہ سو سے زیادہ کا تو ہمارے ہاں دستور نہیں۔ اگر آپ کو زیادہ دوں تو سب تعلقہ دار فریاد کرنے لگیں گے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ مَیں آپ کی خاطر سے صدر مددگار مال ایک نیا عہدہ چار سو کا منظور کروں اور آپ اُس پر اپنے کسی عزیز کو نامزد کردیں "

جب یہاں تک نوبت پونہچی تو مولٰنا نے زیادہ اصرار کرنا سوءِ ادب سمجھ کر نواب سر سالار جنگ کا ارشاد قبول کرلیا مگر اس طرح پر کہ اُن کا اصل عہدہ نظامتِ بندوبست باقی رہے اور ناظمِ بندوبست و منصرم صدر تعلقہ دار لکھے جائیں۔ مولٰنا نے ناظمِ بندوبست اور منصرمِ صدر تعلقہ داری کی قید صرف اِس لیئے لگائی تھی کہ ناظمِ بندوبست کا بھتّہ دو سو چالیس ملے گا اور بارہ سو تنخواہ کے۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب سے رخصت ہو کر مولٰنا پٹن چرو[1] میں ناظمِ بندوبست یعنی سٹلمنٹ کمشنر اور منصرم تعلقہ دار (یعنی قائم مقام کمشنر قسمت) بن کر تشریف لے گئے۔

حیدر آباد دکن میں تصنیف و تالیف

کثرتِ کار کی وجہ سے مولٰنا کو اگرچہ وہاں تصنیف و تالیف کا وقت نہیں ملا اور بقول مولٰنا کے "وہاں اگر تصنیف و تالیف کا خیال کرتا تو کورنمکی کا مجرم ہوتا" تاہم مولٰنا کو تصنیف کا کچھ کام مل ہی گیا۔ غالباً گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اشارہ ہوا تھا کہ اب اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک بہادر کو اختیارات دینے کا وقت قریب آگیا ہے اُن کو امورِ انتظامِ ریاست سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ اساتذہ کا اسٹاف تو بہت تھا مگر اُن میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو انتظامات سے واقف ہوتا۔ اِس لیئے کلارک[2] صاحب نے ہمارے مولٰنا کو ٹیچنگ اسٹاف میں لینا چاہا۔ کلارک صاحب کی یہ بات تو مہم کبیر

---

[1] یہ بھی بالکل حسنِ اتفاق ہے جب سرکارِ عالی نظام کے یہاں مولٰنا صدر تعلقہ دار یعنی کمشنر ہوئے تو سمت شمالی کے ہوئے جس کا مستقر پٹن چرو ہے۔ اور یہ وہی مقام ہے جہاں کچھ عرصے پیشتر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور صدر تعلقہ دار رہ چکے تھے۔ اِس طرح شاگرد رشید نے اُستاد کی پوری تقلید کی ڈپٹی کلکٹر بھی ہوئے اور صدر تعلقہ دار بھی۔ ایسا حسنِ اتفاق بھی کم ہوا ہوگا یہی وجہ ہے کہ مولٰنا نے اپنے زمانِ قیامِ دکن میں خان صاحب کے صاحبزادے مولوی عبد الملک خاں صاحب اور اُن کے داماد مولوی امیر محمد خاں صاحب کے ساتھ بہت سلوک کیا۔ اور دونوں صاحب البقیہ آیندہ

[2] دیکھو صفحہ آیندہ ۱۲۵

سے پیش رفت نہ ہونے دی مگر مولٰنا سے فرمایش کی کہ انتظامات کے متعلق کچھ رسالے لکھ دیجئے۔ آخر مولٰنا نے سر سالار جنگ مرحوم کے ارشاد پر گیارہ رسالے لکھے۔ رسالوں کی تصنیف میں اتنا خیال کر لیا گیا تھا کہ زبان شستہ اور صاف ہو بیان میں شگفتگی ہو۔ پؔ

اعلیٰ حضرت کے لیئے سات رسالے تصنیف کرنا

اسی بنا پر مولٰنا نے سات رسالے لکھے۔ مثلاً مال گزاری۔ عدالت۔ تعلیمات۔ پولیس وغیرہ یہ سب رسالے سُنا ہے کہ حضور کو سبقاً سبقاً پڑھائے گئے۔ حضور کو پڑھانے سے قبل یہ رسالے انگریزی میں ترجمہ ہو کر ریزیڈنٹ کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ ریزیڈنٹ نے اِن رسالوں کو پسند کیا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب سر سالار جنگ بہادر میز پر تھے اور آنریبل مسٹر محمود مرحوم اور چند دیگر اکابر ریاست اَور بھی شریک تھے کہ مولٰنا کا ایک رسالہ پونہچا۔ نواب سر سالار جنگ بہادر سے صبر نہ ہو سکا اور کھانا تناول کرتے ہیں رسالے کو دیکھنا شروع کیا اور حاضرین کو مزے لے لے کر سُنایا اور آخر کار فرمایا "کہ مجکو ساری عمر میں رشک ہوا ہے تو مولوی نذیر احمد کے دماغ پر" پس ہمارے مولٰنا کے تمام سرٹیفکٹوں کا پشتارہ جس میں کئی لفٹنٹ گورنروں کی چٹھیاں بھی ہیں ایک طرف اور ہند کے بسمارک نواب سر سالار جنگ بہادر کا اتنا فرمانا ایک طرف۔

اِن ساتوں رسالوں کے چھپنے کے متعلق حیدر آباد میں یہ روایت مشہور ہے کہ کسی امیر نے اِن رسالوں کی نقل سر سالار جنگ سے چاہی۔ سر سالار جنگ مرحوم نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ تم کو حضور کی برابری کا خبط ہے۔ مگر مؤلف حیاۃ النذیر کی خوش قسمتی کو دیکھیے کہ اُس کو ان ساتوں رسالوں کی اصلی نقل دیکھنے کو مل گئی اور اُس نے اِن کو اول سے آخر تک نہ اُس خبط کی وجہ سے پڑھا جس کا طعنہ سر سالار جنگ بہادر نے کسی امیر کو دیا تھا۔ بلکہ اس خیال سے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام خلّد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے طفیل میں ایسے بیش قیمت رسالے دیکھنے کو مل گئے۔ ہاں سر سالار جنگ کے ارشاد کا اتنا ادب اُس نے ضرور کیا کہ باوجود اختیار کے اُس کی نقل نہیں لی اور بجنسہ اُس شخص کو واپس دے دیئے جس نے یہ رسالے مرحمت کیئے تھے۔

اِن رسالوں کا اقتباس اِس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ اصل میں وہ ٹکنیکل رسالے ہیں۔ ناظرین کو اُس سے کچھ مفاد نہیں اِس کے علاوہ جب وہ پرایوٹ طور پر حضور نظام کے واسطے خاص کر لکھے گئے ہیں تو اُن کی اشاعت بلا اجازت نامناسب ہے اِن رسالوں کی تصنیف کا گورنمنٹ نظام کی طرف سے جو معاوضہ عطا ہوا اُس کا تذکرہ مولٰنا کی پنشن میں کیا جائے گا یہاں صرف ایک یہ امر قابلِ تذکرہ ہے کہ چوں کہ یہ رسالے حضور آصف جاہ نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں بہادر کے لیئے مولٰنا کے دست و قلم سے نکلے ہیں اِس لیئے وَکَفٰی بِہٖ فَخراً۔ اِس سے بہتر مولٰنا کے لیئے اَور کونسا معاوضہ ہو سکتا ہے۔

سفرِ مدراس و میسور

اپنی سٹلمنٹ کمشنری کے زمانے میں مولٰنا نے مدراس اور میسور کا بھی سفر کیا تھا۔ سیر سپاٹے

(بقیہ صفحہ ۸۷) دوم تعلقہ داری کی خدمت تک پونہچے۔ یہ بات پرانے ہی لوگوں میں ہے کہ رتی بھر احسان کو بھی مانیں اور جہاں تک ہو سکے اُس کا بدلہ اُتاریں ۱۲

سلہ کلارک صاحب حضور نظام کے اُستاد تھے اُنھوں نے مولٰنا کو حضور کی اتالیقی میں لینا چاہا مگر ان کی بات پیش رفت نہ ہوئی اب جو مولٰنا کو ایل ایل ڈی کی ڈگری ملی تو کلارک صاحب نے پُرجوش الفاظ میں مبارک باد لکھی اور یہ بھی لکھا کہ آپ کی لیاقت کی قدر بہت دیر بعد ہوئی اب سے پیشتر آپ کو یہ اعزاز ملنا چاہیے تھا اور کیا اچھا ہوتا کہ میری تحریک کے مطابق آپ جیسا لائق و تجربہ کار شخص حضور نظام کا اتالیق ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں معتدبہ ترقی کی توقع رکھتا ۱۲

کے لیئے نہیں بلکہ اس لیئے کہ طریقۂ بند وبست سے آگہی پیدا کریں۔ غالبًا اپریل ۱۸۷۵ء کا ذکر ہی کہ مولانا
اول بنگلور۔ میسور۔ پراونسز کے دارالحکومت میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک نہایت عمدہ عالی شان مکلّف اور
آراستہ مکان میں فروکش ہوئے۔ مولانا کے ساتھ دو انگریز بھی تھے۔ مولانا میسور میں بہت سے انگریزوں
سے ملے اور اُن سے طریقۂ بند وبست پر گفتگو اور مشورہ کر کے ۲۵ مئی ۱۸۷۵ء کی صبح کو مدراس میں داخل
ہوئے۔ سفرِ مدراس کے اَور واقعات تو معلوم نہیں۔ صرف ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ مولانا نے سمندر کی
بھی سیر کی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ سمندر کے تموج سے مولانا کے دل پر بہت ہی خوف طاری ہوا تھا۔ ہاں
سفرِ مدراس کے متعلق ایک واقعہ دعوت کا بھی معلوم ہوا ہی اور چوں کہ وہ قابلِ عبرت ہی اس لیئے درج کیا جاتا ہی۔
مدراس میں جس کوٹھی کے بالاخانے پر ہمارے مولانا ٹھیرے ہوئے تھے وہ ایک مشہور سیٹھ اسمٰعیل کی
کوٹھی تھی رفتہ رفتہ سیٹھ کے ساتھ مولانا کا تعارف زیادہ ہوگیا۔ سیٹھ نے دعوت کا پیام دیا مولانا فرماتے ہیں کہ

دو مجکو سدا سے دعوت کی چڑ ہی ٹالنے کے پیرائے میں انکار کرتا رہا۔ جب چلں چلاؤ کا وقت قریب
آیا تو سیٹھ نے اس قدر اصرار کیا کہ انکار کرتے بن نہ پڑا۔ دستر خوان پر خود سیٹھ اور اُن کے
اعزہ و اقارب اور ملازم حتّٰی کہ خدمت گار سب بلا امتیاز شریک ہوئے اور اُنھوں نے
میرے خدمت گاروں کو بھی ساتھ بٹھانا چاہا۔ ان کو فی عمرہم برابر بیٹھنے اور ساتھ کھانے کا اتفاق
نہ ہوا تھا۔ بہت رکھیجے بہت رُکے اور سیٹھ ہیں کہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھسیٹے لیئے چلے جا
ہیں تو چار و ناچار مجکو کہنا پڑا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں تو اُن کو الگ
کھانے دیجئے۔ ایسا ہی ہوا۔ مگر سیٹھوں نے بڑا ہی تعجب کیا کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ کھانے
میں آقا اور نوکر کا تفرقہ کرتے ہیں اگرچہ میں اس رسم کو اپنے ہاں جاری نہ کر سکا تاہم اس واقعے
کو استحسان کے ساتھ اکثر یاد کرتا ہوں ؟

غرض مولانا مدراس و میسور وغیرہ کے سفر سے واپس آکر پھر اپنے عہدے پر کام کرنے لگے۔ مولانا کی حکومت اور
تعزّز کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہی کہ وہ اپنی قسمت میں مدار المہامی کرتے تھے۔ کیوں کہ جو نسبت مدار المہام
کو تمام ریاست سے ہی وہی نسبت صدر تعلقہ دار کو اپنی قسمت سے ہوتی ہی یعنی جیسی جامعیت مدار المہام میں ہو ویسی
ہی صدر تعلقہ دار میں بھی ہی مگر محدود بہ قسمت۔

عہدہ دارانِ ریاست حیدر آباد کی ترتیب

ریاستِ حیدر آباد دکن کے عہدہ داروں کی ترتیب اُس زمانے میں اس طرح پر تھی کہ
نواب صاحب (سر سالار جنگ) بمنزلہ لفٹنٹ گورنر بلکہ ہم رتبۂ گورنر جنرل تھے۔ جب وہ
ولایت تشریف لے گئے تھے تو مراتب شاہانہ اُن کے ساتھ برتے گئے تھے اور اس
میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ من حیث الاختیارات بادشاہِ دکن تھے۔ غرض نواب صاحب مدار المہام تھے اور اُن کے ماتحت
چار صدر المہام۔ صدر المہام مال گزاری ایک۔ جیسے ہمارے ہاں بورڈ آف ریونیو۔ اور صدر المہام کوتوالی دو۔ یعنی انسپکٹر

جنرل پولیس - اور صدر المہام عدالت یعنی ہائی کورٹ تین - اور صدر المہام متفرقات یعنی تعلیمات - طبابت - ڈاک - تعمیرات - صفائی وغیرہ چار - چوں کہ مولانا صیغۂ مال کے ملازم تھے اس لیے ان کو مدار المہام اور صدر المہام سے تعلق تھا - اُس زمانے میں مولانا کے صدر المہام نواب مکرم الدولہ بہادر تھے اور نواب محسن الملکؒ مرحوم معتمد علاقۂ مال گزاری تھے - یعنی رونیو سکریٹری - اور دستور رتن جی پارسی معتمد صدر المہام مال گزاری یعنی سکریٹری ٹو دی بورڈ آف رونیو - صدر المہام مال گزاری کے تحت میں صدر تعلقہ دار تھے یعنی کمشنر قسمت جو وہاں صدر تعلقہ دار سمت کہلاتے تھے - سلطنت بھر میں پانچ سمتیں یعنی پانچ قسمتیں تھیں -

نواب محسن الملک مرحوم تمام انتظامی امور کے سکریٹری یعنی معتمد تھے اور اس تعلق سے ان کو سر سالار جنگ مرحوم کے پاس حاضر ہونے کے مواقع بلاناغہ ملتے رہتے تھے - یہی وجہ ہے کہ اُن کو سر سالار جنگ مرحوم کے مزاج میں مدخلِ عظیم تھا -

نواب محسن الملک مرحوم اگرچہ بڑے مردم شناس اور لیاقت پسند آدمی تھے - مگر دستور رتن جی سے ہمیشہ وہ کھٹکتے رہے - دستور رتن جی ہمیشہ اس گھات میں لگے رہے کہ کسی طرح اُچک کر وہ سر سالار جنگ تک پہنچیں - لیکن مرحوم نواب محسن الملک بہادر روڑے اٹکاتے رہے - اور اُن کو وہاں تک نہیں اُچکنے دیا -

دستور رتن جی مولانا نذیر احمد صاحب پر بھی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے - اگرچہ وہ خود ایسے زبردست ذی علم نہ تھے مگر اُن کے مددگار مولوی علی رضا خاں صاحب مرحوم ایم اے ایک بہت ذی علم شخص تھے - اور مولانا اور اُن کے درمیان نوک جھونک رہا کرتی تھی - نوک جھونک والی تحریریں ہمیں نہیں ملیں - چند فقرے حیدرآبادیوں کی زبانی سنے گئے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ فقرہ بہت مشہور تھا کہ "این چہ دستورِ ناہنجار است" مولانا ایسے ہی ذومعنی فقرے دستور رتن جی پر چُست کیا کرتے تھے - چند روز تک اسی طرح کی جنگِ زرگری رہی - آخر کار دستور رتن جی کو مولانا کا لوہا ماننا پڑا -

گورنمنٹ ہند نے قحط کا ایک کمیشن بٹھایا تھا - اُس کمیشن کے سکریٹری الیٹ صاحب تھے جو آخر کار بنگال کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے - ایک زمانے میں مولانا بطور ضلع کان پور کے تحصیل دار تھے اور الیٹ صاحب قائم مقام کلکٹر - انھیں کے وقت میں مولانا نے تحصیل داری کا امتحان دیا تھا - مولانا ان سے حیدرآباد کی حالتِ ملازمت میں میسور میں بھی ملے تھے اور وہ اُن سے بڑے تپاک سے پیش آئے تھے - غرض سوالاتِ کمیشنِ قحط کے جوابات نواب محسن الملک بہادر مرحوم نے بمشورۂ مولانا نذیر احمد صاحب لکھوائے تھے - ان جوابات میں غالب حصہ مولانا کا تھا - ریاست حیدرآباد کے جوابات گورنمنٹ ہند میں مقبول ہوئے اور سر سالار جنگ کا شکریہ لکھ کر آیا - ۱۸۸۱ء کے علی گڑھ گزٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اکثر اوقات نواب محسن الملک مرحوم بزمانۂ قیام حیدرآباد علی گڑھ کالج کے حق میں بھی مضمون لکھوایا کرتے تھے -

نواب محسن الملک مولانا کو پوائنٹ بتا دیا کرتے تھے اور مولانا اُس اجمال کی تفصیل قلم برداشتہ

کردیا کرتے تھے۔ نواب صاحب مرحوم شاید اس زمانے میں بیمار تھے۔ ہم نے سوالات کمیشن قحط اور علی گڑھ کالج کے حق میں مضامین لکھنے کا جو تذکرہ کیا۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نواب محسن الملک بہادر کی کچھ تنقیص کی جائے۔ بلکہ سوالات کمیشن قحط کے جوابات کا اگر ذکر نہ آتا تو ہم اُس کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ نواب محسن الملک مرحوم کی ہم نے اسپیچیں سُنی ہیں اُن کی تحریریں دیکھی ہیں وہ جیسا چاہیئے بولتے تھے اور جیسا چاہیئے لکھتے تھے۔ اس کی شہادت کے لیئے اُن کی ضخیم تصنیفات اور اُن کے طولانی لکچر اور اُن کے آرٹیکل موجود ہیں۔ وہ بڑے بے دھڑک بولنے والے اور بے دھڑک لکھنے والے تھے۔ دو چار مضامین لکھوانے سے اُن کی کسی شان میں بٹّا نہیں لگ سکتا۔ یہ اُن کا زور لیاقت ہی تھا کہ وہ اگرچہ بقدرِ ضرورت بھی انگریزی نہیں جانتے تھے مگر ہمیشہ بڑے بڑے انگریزوں سے ربط ضبط رکھا کرتے تھے۔ وہ بڑے فیاض اور سیر چشم تھے۔ سیکڑوں کیا بلکہ ہزاروں کے ساتھ اُنھوں نے سلوک کیئے۔ مگر مولانا کے ساتھ اُنھوں نے کوئی احسان نہیں کیا احسان نہیں گیا صرف اِس لیئے کہ مولانا کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ورنہ وہ اِس مزاج کے آدمی تھے کہ احسان کرتے اور بھول جاتے۔

مولانا کا عہدہ

غرض مولانا وہاں صدر تعلقہ دار تھے اور اپنی سمت میں کل محکموں کے حاکم۔ اور مولانا میں بقدر سمت وہ جامعیت تھی جو ذات نواب صاحب (سر سالار جنگ) میں بقدرِ وسعت سلطنت تھی۔ پس مولانا کو کل صدر المہاموں سے تعلق تھا۔ عہدۂ صدر تعلقہ داری گویا ہمارے ہاں کی کمشنری تھی۔ مولانا اگر برٹش گورنمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست تھے تو حیدر آباد میں خدا کے فضل سے بمنزلہ کمشنر ڈویزن جو بورڈ آوف گورنمنٹ کا تابع ہوتا ہی۔ بہر حال جس عہدے پر مولانا باستحقاق پونہچے تھے اُس کا شکر اُن پر واجب تھا۔ اِس شکر میں اپنے بیٹے کو بھی شریک کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ ان شاء اللہ بہت سے واقع ملیں گے۔ نواب صاحب (سر سالار جنگ مرحوم) کے دل میں جگہ ہونی شرط ہی۔ پھر تو وہ اِس طرح کا سخی دل آدمی ہی کہ جو مانگو سو لو۔ مثل ہندوستانی رئیسوں کے ہمارے نواب صاحب احمق اور لا یعقل نہیں ہیں۔ اپنے وقت کا یہ شخص ارسطو اور افلاطون ہی۔ لیکن کریم النفسی اور مروۃ اس درجے کی ہی کہ "لا" اور "نہیں" اور "تو" مونہ سے نہیں نکلتا۔ بشیر! یہ بڑا عمدہ اصول ہی من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ تم نواب صاحب کے احسانوں پر نظر کرو۔ اور چوں کہ ضرور ہی تم بھی احسانوں سے تمتع کرو پس نواب صاحب کے حق میں صمیم قلب سے دعا کرنی چاہیئے "۔

انگریزی خدمت سے مولانا کا استعفار

موعظۂ حسنہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب مولانا کے فرزند رشید نے جب تعلیم سے ترکِ تعلق کیا تو اپنے پدر بزرگوار سے ریاستِ حیدرآباد میں ملازمت کی خواہش کی۔ مولانا کو اگرچہ خود بھی اِس کا خیال تھا مگر وہ موقع کی تاک میں تھے۔ ایک مرتبہ نہایت عمدہ موقع مِل گیا اور وہ اِس طرح کہ مولانا انگریزی گورنمنٹ سے دو برس کی فرلو رخصت لے کر گئے تھے۔ جب رُخصت ختم ہونے کو آئی تو مولانا نے نواب محسن الملک مرحوم کے ذریعے سے

نواب سر سالار جنگ بہادر تک یہ بات پونہچائی کہ میں رخصت کے ختم ہونے پر ہندوستان واپس جاؤں گا
اس اثناء میں نواب سر سالار جنگ بتقریب دورہ گلبرگہ تشریف لے گئے تو مولٰنا کو بھی بلوا بھیجا۔ ایک رات
نواب صاحب (سر سالار جنگ) نواب محسن الملک اور ہمارے مولٰنا صرف تین آدمی ایک جگہ تھے۔ سر سالار جنگ نے
مولٰنا سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ میں نے سُنا ہے آپ واپس جانا چاہتے ہیں؟ مولٰنا نے عرض کیا کہ وہاں کے حکام سے
میری شناسائی ہے اُن کے ذریعے سے میں اپنے اعقاب کی فکر کرنی چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا
کہ اعقاب کی فہرست دیجئے۔ مولٰنا نے مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنے فرزند۔ مولوی حافظ حاجی
احمد حسن صاحب۔ اور مولوی شرف الحق صاحب اپنے ہر دو داماد کی اسم نویسی پیش کردی نواب صاحب
نے وہ فہرست نواب محسن الملک بہادر کو دی کہ مولوی نذیر احمد صاحب سے پوچھ کر ان لوگوں کو خدمات مناسب
پر نامزد کردو۔ اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ اب کیا عذر ہے۔ مولٰنا کو کچھ کہتے نہ بن پڑا اور اس طرح مولٰنا
نے انگریزی خدمت سے استعفا دے دیا۔ چاہتے تو انگریزی پنشن محفوظ رکھ سکتے تھے مگر روپیہ بہت
بھرنا پڑتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب کے احسانوں کے مقابلے میں انگریزی پنشن کی کچھ پروا نہیں کی
وہ احسان یہ تھے کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام ایکسو پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ کار آموزی جاری
کردیا۔ مولٰنا کے دونوں خویش معقول خدمات پر ہوگئے یعنی مولوی احمد حسن صاحب کو چار سو روپیہ ماہوار کی مددگاری
صدر تعلقہ داری ملی۔ اور مولوی شرف الحق صاحب مددگار بندوبست بمشاہرہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار ہو گئے۔
علیٰ ہذا حافظ عبد الواحد صاحب مرحوم جو مولٰنا کے برادر نسبتی تھے وہ مددگار بندوبست ہو گئے۔ سر سالار جنگ
مرحوم کو مولٰنا کی اس قدر خاطر منظور تھی کہ ان سب عزیزوں کو مولٰنا ہی کی ماتحتی میں رکھا۔ مولٰنا کے چلے آنے
کے بعد مولوی احمد حسن صاحب نے ضلع کی کلکٹری تک ترقی کی اور اب چار سو ماہوار پنشن پاکر خانہ نشین
ہیں۔ مولوی شرف الحق صاحب اب چھ سو پاتے ہیں اور بندوبست میں ہیں۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب
درجۂ اول کے دوم تعلقہ دار ہیں۔ اور پانسو پاتے ہیں۔

نواب سر سالار جنگ بہادر کے دونوں صاحبزادوں کو کام سکھانا

نواب سر سالار جنگ بہادر کے دل پر ہمارے مولٰنا کی ہمہ دانی اور تجربے اور لیاقت کا سکّہ تو بیٹھا ہی ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے دونوں صاحبزادوں کو مولٰنا کے سپرد کریں تاکہ وہ کام سیکھ کر
تجربہ حاصل کریں۔ چناں چہ ایک روز ارشاد فرمایا کہ میرے دونوں لڑکوں کو آپ کچھ کام سکھلائیے۔ اور اس
غرض سے نواب میر لائق علی خاں عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب سعادت علی
خاں منیر الملک بہادر دونوں صاحبزادوں کو ٹین چرو مستقر صدر تعلقہ داری پر بھیج دیا۔ نواب عماد الملک مولوی
سید حسین صاحب بلگرامی بھی ان دونوں صاحبزادوں کے ہمرکاب تھے۔ قریب تین ہفتے کے دونوں صاحب
زادے وہاں رونق افروز رہے۔ مختلف طریقے سے ان کو عملی طور پر کام بتایا گیا۔ دفتر کی ترتیب اور کام کا

ڈھنگ اور کل ابتدائی اصول ذہن نشین کرا دیئے گئے۔ اس طرح دونوں صاحب زادے مولانا کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ آگے چل کر جب بڑے صاحب زادے مدار المہام سلطنت ہوئے اور چھوٹے صاحب زادے معین المہام مال ہوئے اُس وقت بھی وہ مولانا کا خاص ادب کرتے تھے۔ دونوں صاحب زادوں کو مولانا کے پاس ادب کا بڑا خیال تھا۔

جب دونوں صاحب زادے پٹن چرو سے کام سیکھ کر آئے تو سر سالار جنگ مرحوم نے دونوں صاحبوں کے جنرل نولج میں ایک ممتاز اور غیر معمولی ترقی پائی اور بہت خوش ہوئے۔ بڑے صاحب کے متعلق مولانا سے ایک روز سر سالار جنگ مرحوم نے دریافت کیا کہ اِن کی نسبت آپ کی کیا رائے ہی۔ مولانا نے فرمایا کہ خدا اِن کو لوگوں کے شر و فتن سے بچائے یہ بڑے بھولے بھالے اور بڑے نیک سرشت ہیں۔

نواب فخر الملک بہادر جو اَب وزیر عدالت ہیں اُنھوں نے بھی مولنٰنا سے استفادہ کیا ہی۔ اور اب بھی وہ ہمیشہ مولنٰنا کو بہت عمدہ الفاظ میں یاد فرماتے ہیں اور ہمیشہ مولنٰنا کی خداداد قابلیت کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور فخراً اس اُستادی اور شاگردی کا ذکر فرماتے رہتے ہیں۔

مولنٰنا کا حافظِ قرآن ہونا

وہیں حیدر آباد کی ملازمت میں مولنٰنا پر ایک خیر و برکت اَور نازل ہوئی وہ یہ کہ تمام ادیان آسمانی میں صرف اہل اسلام ہی کو ابتدا سے یہ گرویدگی رہی ہی کہ وہ اپنی الہامی کتاب قرآن مجید کے حفظ کرنے کو بڑے ثواب کی بات خیال کرتے ہیں۔ اہل عرب جن کی زبان مادری عربی ہی یا دوسرے ممالک کے اہلِ اسلام عربی داں کو صرف حفظِ قرآن میں بہت ثواب ملتا ہو مگر جو عربی زبان سے نا آشنا ہیں اور بے فہمِ مطلب قرآن مجید کو صرف ثواب کی غرض سے ازبر کرتے ہیں ہمارے نزدیک تو اُن کو کچھ زیادہ ثواب نہیں ملتا۔ کیوں کہ بغیر عمل کے ناظرہ اور حفظ دونوں کی ایک حالت ہی۔ بہر حال دونوں کو برابر ثواب ملتا ہو یا نہ ملتا ہو۔ لیکن خدا جس کو توفیق عنایت فرماتا ہی وہ ضرور حفظ قرآن کی طرف متوجہ ہوتا ہی۔ خلاصہ یہ کہ مولنٰنا کو بھی خدا نے حفظِ قرآن کی توفیق مرحمت فرمائی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حفظِ قرآن سے مولنٰنا نے نہ صرف ثواب ہی حاصل کیا بلکہ جناب ممدوح نے بڑے بڑے دینی و دنیوی کام حفظِ قرآن سے لیے مولنٰنا کے ہر لکچر کو اُٹھا کر دیکھیے۔ ہر تصنیف و تالیف پر نظر ڈالیے تو اکثر ایسی مفید باتیں معلوم ہوں گی جن کو احکامِ الٰہی اور قرآنِ مجید سے خاص قسم کا تعلق ہی۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولنٰنا نے اپنی تصانیف میں قرآن مجید کا اِس قدر استعمال کیا ہی کہ اگر وہ ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو پورا قرآن مجید تیار ہو سکتا ہی۔ حفظِ قرآن ہی سے مولنٰنا میں یہ قدرت پیدا ہو گئی ہی کہ احکامِ مذہبی کو وہ نہایت عمدہ طریقے پر سامع یا ناظر کے ذہن نشین کر دیتے ہیں اور قرآن کے تمام اوامر و نواہی کی تشریح اس فصاحت سے کرتے ہیں کہ معمولی و غیر معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو فوراً تسکین ہو جاتی ہی۔ ہمارے خیال میں مولنٰنا کی تصانیف سے اُن لوگوں کو مخصوصاً ایک فائدہ اَور پہنچتا ہی جنھوں نے قرآن مجید کو بالائے طاق رکھ دیا ہی وہ یہ کہ جب مولنٰنا کی تصانیف میں جا بجا وہ قرآن کی آیتوں کو دیکھتے ہیں تو مطلب سمجھنے کے لئے قرآن کی

آیتیں اُن کو ضرور پڑھنی پڑتی ہیں اور اس طرح سامعین اور ناظرین کے دل میں قرآن مجید اپنا اثر کرتا رہتا ہے - اور اُن کو قرآن پڑھنے کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے -

غرض ہمارے ہاں ہندوستان کے مسلمانوں میں کہیں کہیں یہ دستور ہے کہ خدا جن کے ماں باپ کو توفیق دیتا ہے وہ اپنے بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے ہیں مگر وہی ابتدائی عمر میں تاکہ حفظ میں آسانی ہو اور محنتِ شاقہ کے اثر کو محسوس کر کے بچہ بھاگے نہیں - بچے ماں باپ کے شوق سے جبریہ طور پر حفظ قرآن کرتے ہیں مگر یہاں مولٰنا کی نہ یہ عمر تھی اور نہ جبر - جو کچھ سمجھیئے وہ خدا کی توفیق تھی اُسی نے مدد کی اُسی نے شوق دلایا - ورنہ عمر کے لحاظ سے بوڑھے طوطے کا وقت آگیا تھا ایسے وقت میں قرآن مجید کے تیس ۳۰ پاروں کا برزبان کرنا کوئی مونہ کا نوالہ نہیں تھا - بلکہ جب کسی نے اس ثواب کے کمانے کا ایسی عمر میں ارادہ کیا ہو وہی خوب اندازہ کر سکتا ہے کہ اِس راہ میں اُس کو کتنی دقتیں پیش آتی ہیں اور یہ لوہے کے چنے کتنی مشکلوں سے چبانے پڑتے ہیں خصوصًا اس زمانے میں جب کہ حفظ کرنے کی عمر باقی نہ رہی ہو الغرض مولٰنا نے حفظ قرآن کا اُس وقت خیال فرمایا جب کہ اُن کی عمر اس کی متقاضی نہ تھی - مگر ہمتِ مرداں کے استقلال اور مددِ خدا کی توفیق سے حفظِ قرآن کے ثواب کی گٹھری مولٰنا نے صرف چھ سات مہینے کے عرصے میں باندھ کر اُٹھا لی وہ اِس طرح پر کہ بڑھاپے کے زمانے میں جب کہ وہ حیدر آباد کے صوبۂ شمال کے صدر تعلقہ دار تھے باوجود کثرتِ کار ایک دفعہ دورے کو جاتے وقت حفظِ کلام مجید کا خیال فرمایا - جاتے جاتے قرآن شروع کیا ۔ چھ مہینے سترہ دن میں دورے سے واپس تشریف لائے تو قرآن مجید کے پورے حافظ - کچہری کے وقت دفتر کے کام سے فرصت کم ہوتی تھی - بیچ بیچ میں چند منٹ کی فرصت ہوئی تو قرآن مجید دیکھ لیا لیکن بغیر اس کے کہ کارِ سرکار میں کسی طرح کا فتور واقع ہو حفظِ قرآن میں مولٰنا کو اُن کی لائق اور خدا پرست بی بی صاحبہ مرحومہ سے بہت مدد ملتی تھی - اکثر ایسا ہوتا تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مولٰنا اپنا کل کا یاد کیا ہوا پارہ ایک دفعہ پڑھتے اور بی بی صاحبہ سُنا کرتیں -

بعض کی نہیں اکثر حفاظ کی یہ رائے ہے کہ متشابہات کا لگنا حافظوں کا ہنر ہے جس طرح دوشالے کا رفو - دوشالے پر جتنے رفو ہوں گے اُتنا ہی وہ قیمتی ہوگا - خیر ہنر کی تو کوئی بات نہیں - انسان کی جہاں اَور قوتیں مکمل نہیں وہاں قوتِ حافظے کی تکمیل بھی اُسے عطا نہیں فرمائی گئی کہ وہ زوال پذیر نہ ہو - بہر حال عام حافظوں کی طرح زیر زبر کی غلطی تو مولٰنا سے ممکن نہیں ہاں اُن کے متشابہات کا خاص حال ہے وہ یہ کہ مولٰنا کو اشتباہ ہوتا ہے مگر الفاظِ مترادف میں - مثلاً یَعۡلَمُوۡنَ - یَفۡعَلُوۡنَ وامثالہا - دوسری بات یہ ہے کہ ترتیبِ آیات توقیفی[له] ہے - مولٰنا کو اکثر یہ یاد نہیں رہتا کہ اس کے بعد کیا مضمون ہے اگر مولٰنا کو اردو میں مضمون بتا دیا جائے تو اشتباہ رفع ہو جاتے - آیات کے بعد سکوت ہوتا ہے کہ اب کیا پڑھیں - ہمارے نزدیک یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا کو متشابہات اس لیئے لگتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑھاپے میں کلام اللہ حفظ کیا ہے ؛

[له] یعنی جس ترتیب سے جبرئیل علیہ السلام نے جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیتیں پڑھیں پیغمبر صاحب نے اُسی ترتیب سے کاتب وحی کو لکھوا دیں اور اُسی ترتیب سے اَب تک مصاحف میں نقل ہوتی رہیں ۱۲

عام قاعدے کے موجب نا وقتیکہ کوئی حافظ رمضان کی تراویح میں قرآن نہ سُنائے حافظ ہونے کا اطلاق اُس پر نہیں کرتے مولٰنا جب حافظ ہوئے تھے تو مشیر قیصر میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اِس میں غالباً یہ لکھا تھا کہ ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں حافظ بھی آئے تھے مولٰنا کا امتحانِ حفظ لیا گیا تھا۔ بعض حافظوں نے ہم سے اِس جلسے اور اس امتحان کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ جلسے میں امتحان دینا اَور بات ہے اور تراویح سُنانا اَور بات۔ حافظ ہونے کی کسوٹی امتحان نہیں بلکہ تراویح ہے خواہ ایک ہی دو دفعہ عمر بھر میں ہو۔ غرض تراویح کی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ ایک چھوڑ تین تین مرتبہ مولٰنا نے تراویح سُنائی ہے۔ اول مرتبہ پٹن چرو میں جہاں مولٰنا کے پیچھے پانچ حافظ ہوتے تھے۔ اور بس پردہ مولٰنا کی بی بی صاحب بیوی صاحب تراویح کے بعد مولٰنا کو ملامت کیا کرتیں اور کہتی تھیں کہ "جس قسم کی غلطیاں تم حفظ قرآن کے وقت کرتے تھے اُن میں کچھ کمی نہیں ہوئی" پھر دلی آکر پہلے برس اپنے گھر قرآن سنایا۔ چند حافظ بطور سامع پیچھے تھے۔ پھر ایک مرتبہ مجبوریں میں پڑھا۔ یادداشت میں جو نقص شروع میں تھا وہی اب تک ہے۔ ادب کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں۔ تو استشہاد کے لیئے قرآن کا لفظ تو یاد آجاتا ہے پوری آیت یاد نہیں آتی اور کوئی پچھلی آیت پڑھوا کر دیکھیے تو مولٰنا پڑھ نہیں سکتے اور اس خصوص میں ہم نے اکثر حافظوں کو عاجز پایا ہے۔ اب تصنیف و تالیف کی وجہ سے اور قلتِ فرصت کی وجہ سے تلاوت میں بھی کمی ہوگئی ہے۔ تاہم صبح کے وقت اکثر اوقات تھوڑا بہت پڑھ لیا کرتے ہیں مگر ایک خاص حمائل ہیں جس میں کہ انھوں نے حفظ کیا تھا علی العموم حافظوں کا ایک ہی قرآن دیکھا گیا ہے کہ اُسی میں وہ آسانی سے آیتیں نکال سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے مولٰنا سے دریافت کیا کہ آپ نے شبینہ بھی سُنایا ہے تو ارشاد فرمایا میں نے کبھی شبینہ نہیں سُنایا میرے نزدیک اس میں کراہت ہے۔ کیونکہ تلاوت قرآن کے متعلق صاف حکم ہے کہ وہ ترتیل سے پڑھا جائے اور ممکن نہیں کہ ایک رات میں سارا قرآن ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے خاص کر تراویح میں اور تراویح بھی وہ جس میں رکوع و سجود اور قیام اور قومہ اعتدال کے ساتھ ہو۔ الغرض مولٰنا جب حافظ ہوئے تو خداوند تعالیٰ کا شکر اُن پر واجب تھا چنانچہ کیا اچھے الفاظ میں جناب ممدوح نے خدا کا شکر ادا کیا ہے وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۱؎

حیدرآباد کی ملازمت میں انقلاب کا پیدا ہونا۔

ملازمت جیسی خس پوش اور کم زور عمارت کی بنیاد کی مثال ارنڈ کی جڑ سے دی گئی ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ لیکن ہمارے نزدیک ریاستوں کی ملازمت کی سرے سے جڑ ہی نہیں اور یہ اُس سے بھی زیادہ سچ ہے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق ایک جگہ مولٰنا فرماتے ہیں کہ "جو یہاں ہے وہ وہاں (ممالک متحدہ میں) نہیں یعنی عزت و آبرو و بیش قرار تنخواہ اور جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں یعنی قاعدہ قانون اور کامل اطمینان۔ باقی جو وہاں سو یہاں جو یہاں سو وہاں۔ دلی میں برائے نام ایک بادشاہ تھے جن کو لاکھ روپیہ مہینہ پنشن کے طور پر ملتا تھا۔ میں نے یہاں ایک سلطنت دیکھی کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ سالانہ کے جاگیردار ہیں۔ غرض مسلمانوں کی سلطنت کی ایک یادگار ہے" ایک خط میں اپنے صاحب زادے کو لکھا ہے "تم نے کوئی ہندوستانی سرکار دیکھی نہیں۔

۱؎ اور خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہ رستہ دکھایا اور بے اُس کے رستہ دکھائے ہم ہرگز رستہ نہ دیکھ پاتے ۱۲

اور تم یہاں کا طرزِ انتظام سمجھ نہیں سکتے یہاں آسمان پر چڑھ جانا اور تحت الثریٰ میں گر جانا ایک بات ہے۔ جو لوگ کہ نوکر ہو گئے ہیں اُن میں سے کسی کو نوکر نہیں سمجھتا۔ ہر ایک ملک کے سیکڑوں ہزاروں بڑے بڑے لائق برسوں سے پڑے جھک مارتے پھرتے ہیں کوئی پُرسانِ حال نہیں اور چوں کہ یہ ایک بہت بڑی ریاست ہے خلقِ خدا ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑی ہے پھر یہاں کی گُل فردلے قیامت ہے۔ وعدہ اور حکم کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی نواب صاحب کی قدردانی اور مولوی مہدی علی صاحب کی مہربانی تھی اور فی الاصل مجھ پر احسان کرنا منظور تھا کہ میرے عزیزوں کو عہدوں پر نام زد کر دیا ورنہ یہاں کون پُوچھتا تھا۔ مَیں نے رخصت کی درخواست کی تھی۔ بڑی حُجّت کے بعد منظور ہوئی۔ لیکن پھر جو غور کیا تو جانا کچھ مناسب سا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر چند رخصت پر جانے میں میرا ذاتی چنداں نقصان نہیں مگر ساتھ والوں کی بڑی خرابی ہے۔ تم ایسے مطمئن ملک میں رہتے ہو کہ تم یہاں کے حالات مشکل سے سمجھو گے۔ ہندوستانی ریاست ہے اور ہم چند جلیل القدر ہندوستانیوں کا یہ حال ہے کہ در و دیوار دشمن ہو رہا ہے اور وجہ عداوت یہ ہے کہ ہم لوگ بڑے عہدوں پر ہیں اور بڑے اختیار رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں تو کہیں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ساری خلقت یہیں ٹوٹ پڑی ہے خاص کر ہمارے ہم وطن ہی ہمارے دشمن ہیں دیکھ کر جلتے اور بیخ کنی میں لگے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک دم کے لیے بھی نوکری سے جُدا ہونا مصلحت نہیں معلوم ہوتا یہاں ایک دن میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے نہ کہ مہینہ۔ البتہ چھوٹے عہدے والے اور گُم نام آدمی بڑے مزے میں ہیں۔ قاعدہ ہے کہ آندھی سے اگر خطر ہے تو بڑے بڑے اُونچے درختوں کو نہ جھاڑی اور گھاس کو۔[1]

اَمَا تَرَی الرِّیحَ اِنْ ہَبَّتْ عَوَاصِفُہَا فَلَیْسَ تَعْصِفُ اِلَّا وَمَا ھُوَ الشَّجَر

غرض مولٰنا جس انقلاب کے آثار دیکھ رہے تھے اُس کے وجود کا وقت آ گیا۔ آپس کی کشمکش نے بنیادِ ملازمت کو ہلا ڈالا اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بڑے بڑے نامی عہدہ دار تتر بتر ہو گئے۔ سب سے اول مولٰنا کے قدم حیدر آباد کے ایک قحط نے ڈگمگائے وہ قحط کوئی معمولی قحط نہ تھا بلکہ "یاراں فراموش کردند عشق" والا قحط تھا۔ بارانِ رحمت نے ایک بوند پانی کو ترسا رکھا تھا۔ غلّے کی گرانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ نرخ گھٹتے گھٹتے ساڑھے تین سیر کا رہ گیا تھا۔ مخلوقِ خدا جان سے بیزار ہو گئی تھی اور بے چارے غریب مفلس اور متوسطین کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہاں اُمرا و متموّلین اپنا پیٹ بے دردی کے ساتھ تخمہ ہونے کی حد تک بھر لیا کرتے تھے۔ جس سلطنت میں قحط نے ایسا ظلم ڈھایا ہو وہاں انتظامِ ملک میں جتنا اور جس قدر فتور پڑے تھوڑا ہے۔ یہ عالم دیکھ کر مولٰنا گھبرا اُٹھے وحشت زیادہ پریشان کرنے لگی۔ مگر خدا نے رحم فرمایا اور جوشِ رحمتِ ابلِ پڑا لگا تار تین چار پانی خوب ہوئے +

ہندوستانیوں کا انگریزوں سے تعصّب اور اُس کی مثالیں۔

خیر یہ قحط تو ڈھل گیا مگر اُسی کے ساتھ ساتھ سرزمینِ دکن میں حسد کا ایک اور آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا جس کی چنگاریوں نے نظامِ تمدن اور شیرازۂ بندوبست کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ وہ اس طرح کہ دکھنیوں کی نظر میں ہندوستانی خار کی طرح کھٹکتے تھے اور خصوصاً وہ ہندوستانی جو حیدر آباد میں خدماتِ جلیلہ پر مُمتاز تھے۔ پس جس ملک کا در و دیوار۔ زمین و آسمان دشمن ہو رہا ہو ایسے پُرخطر

[1] کیا ہوا کو نہیں دیکھتے کہ جب اُس کے سخت جھوکے آتے ہیں تو بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتے ہیں ۱۲

وقت میں مولانا کا ٹھیرنا کیوں کر مناسب ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ آفتیں بھی انگیز کی جاتیں۔ مگر ان سے بڑھ کر ہندوستانیوں کے لیے مخصوص ایک اور طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہ کہ سر سالار جنگ بہادر مرحوم ایک مدّتِ دراز سے عہدۂ وزارت پر ممتاز تھے۔ نواب افضل الدولہ بہادر مرحوم جو اس وقت حضور تھے۔ سر سالار جنگ بہادر سے سخت ناراض تھے۔ اور جتنے بھی ہندوستانی ممتاز عہدوں پر تھے وہ سب کے سب انھیں کے آوردے تھے۔ بہر حال نواب افضل الدولہ بہادر کی ناراضی کی وجوہ جو کچھ بھی ہوں مگر لوگوں نے اُن کو شاید بدنام کر رکھا تھا کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ دربار میں کسی کو انگریزی کپڑا پہن کر آنے نہیں دیتے۔ گھڑی گھنٹے سے اُن کو قلبی نفرت ہے۔ انگریزی کاغذ پر عرضی دینا حرام جانتے ہیں۔ رزیڈنٹ سے ہاتھ ملاتے ہیں تو گھنٹوں صابن سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ بگھی فیٹن ٹمٹم پر کبھی سوار نہیں ہوتے۔ خدا معلوم یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ مگر نواب سر سالار جنگ مرحوم بڑے زمانہ شناس تھے۔ اُنھوں نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزوں کی یا یوں کہیے کہ تہذیب کی تقلید کر کے کچہریاں بٹھائیں۔ عدالتیں جاری کیں متعصبین کو یہ ناگوار رہا ہوگا۔ وہ نواب افضل الدولہ بہادر سے جھوٹی سچی باتیں لگاتے ہوں گے۔ بعض پیرجی صاحبوں نے جو نواب سر سالار جنگ مرحوم کے دشمن ہو گئے تھے۔ مرحوم پر سیفیاں پڑھوائیں مگر سب اُلٹی پڑیں اور وزیر کو موقوف نہ کرا سکے۔

افسوس وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھو تعصب ہی کے بادل چھائے ہوئے تھے ابتدا ابتدا میں یہ تعصب ہر قوم مفتوح میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کوئی دوسری قوم ایک قوم پر مسلط ہوتی ہے تو قوم فاتح کے ہنر اور صواب بھی عذاب معلوم ہوتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ تعصب گھٹتا جاتا ہے اور آخر کو بالکل نابود ہو جاتا ہے۔ اِس کی زندہ مثالیں بعض دیسی ریاستیں اور ہندوستان کے کُل صوبجات موجود ہیں۔ ہم تعصب کی دو ایک مثالیں اَور بیان کرتے ہیں۔

(۱) انگریزوں نے کسی ہندوستانی ریاست میں تار برقی لگایا۔ والی ریاست نے محلات سے نکلنا چھوڑ دیا کہ گزرگاہوں پر انگریزی تار تنا ہوا ہے اُس کے نیچے سے گزر ہوگا

(۲) ایک رئیس نے۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا تمغہ ٹینی کُتّے کے گلے میں باندھ کر انگریزی چھاؤنی کی طرف کو ہانک دیا۔

(۳) مولوی مملوک العلی صاحب ہمارے مولنا کے اُستاد تھے۔ دہلی کالج میں کوئی شامت کا مارا مسلمان انگریزی خوان مولنا کی جماعت میں آنکلا اور کالج کے مٹکے میں سے پانی پی لیا تو مولوی صاحب نے وہ مٹکا تُڑوا دیا۔

(۴) ماسٹر رام چندر مشہور ریاضی داں عیسائی ہمارے مولنا کے اُستاد نے اسلام کی تردید میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ مولنا سے اُس کے ایک باب کا ترجمہ کرایا۔ اِس ترجمے کو کہیں مولوی عبد القادر صاحب مرحوم نے دیکھ پایا تو فتویٰ لیے پھرے کہ اس کا نکاح [illegible] ہا گیا۔

غرض ایک حیدرآباد کیا سارے ہندوستان کا آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ غیر ہندوؤں کا مذہب تو چھوت

چھات کا مذہب ہی۔ مسلمانوں پر کیا قہر ٹوٹ پڑا تھا جو ایسی ناشائستہ حرکت کر بیٹھتے تھے اور مذہب کو ناحق بدنام کرتے تھے۔ ہم کو ہندو مسلمانوں کی سیکڑوں حکایتیں معلوم ہیں۔ لیکن طوالت کے لحاظ سے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔

خلاصہ یہ کہ نواب محبوب الدولہ بہادر نظام الملک آصف جاہ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و حشمتہ (جو اب نظام دکن ہیں حضرت غفران مآب کی وفات کے وقت) کا سن شریف دو سال کا تھا۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم نے کوشش کر کے ان کو تخت نشین کیا۔ وزارت بوجہ صغر سنی حضور ایک عہدہ مشترک تھا درمیان شمس الامرا اور نواب سر سالار جنگ مرحوم کے۔ لیکن شمس الامرا مرحوم کا انتقال ہو گیا اور شمس الامرا مرحوم کے بھتیجے وقار الامرا امیر کبیر شمس الامرا ہوئے۔ اور اُن کے لیئے ولایت سے خلعت و خطاب آیا۔ وقار الامرا بہادر کو اصرار تھا کہ شرکت مدار المہامی میں بھی ہونی چاہیئے۔ جیسے شمس الامرا بہادر مرحوم کو تھی۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم کہتے تھے حضور جو صاحب ہوش ہوئے اَب وزارت میں شرکت کی حاجت نہیں۔ اور اگر وقار الامرا کی شرکت ہوئی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا یہ بھی مشہور تھا کہ انگریز سب وقار الامرا بہادر کے طرف دار تھے۔ کیونکہ نواب سر سالار جنگ بہادر کا انتظام ریاست میں انگریزوں کی مداخلت کو روکتا تھا۔ اور وقار الامرا بہادر نرے ہندوستانی امیر تھے۔

افواہیں سُنتے سُنتے بہت جلد وہ وقت آ گیا کہ نواب وقار الامرا بہادر کو خلعت نیابت بندگانِ عالی حضور پُر نور ہوا اور فوراً بینتالیس ۴۵ اعتراض نواب مختار الملک سر سالار جنگ پر وارد کئے گئے اُن میں سے ایک یہ کہ تم بار بار ولایت گئے اور سفر ہندوستان کیا۔ اور لاکھوں روپیہ یعنی مجموعی ایک کروڑ سے متجاوز صرف ہوا۔ چوں کہ یہ سفر واسطے منفعت نظام کے نہ تھے بلکہ تمھاری سیر و تفریح ان سفروں کا باعث تھی پس یہ روپیہ خزانہ عامرہ میں داخل کرو۔ دوسرے ابتدائے وفات نواب آصف جاہ افضل الدولہ مرحوم سے آج تک جمع خرچ سلطنت کا حساب دو۔ تیسرے یہ کہ باوجودے کہ ایک سے ایک لائق آدمی۔ مدراسی پارسی۔ دکنی۔ مرہٹہ۔ وغیرہ موجود ہیں تم نے ہندوستان سے ناواقف لوگوں کو بلا کر بڑے بڑے عہدے دیئے اس کا سبب بیان کرو۔ ورنہ ان کی تنخواہیں واپس کرو۔ چھ آدمیوں کے نام مشہور تھے۔

نواب محسن الملک مرحوم۔ مولوی سید حسین بلگرامی۔ مولوی چراغ علی مرحوم۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب۔ مولوی امین الدین صاحب اور مولانا مولوی نذیر احمد صاحب۔

بہر حال جہاں خود وزیر پر ایسے اعتراض کئے جاتے ہوں وہاں اُس کے آوردوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ان لوگوں کی بے چینی کا حال وہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ جو ایسی پریشانیوں میں مبتلا ہو۔

غرض ابتدا ابتدا میں ان لوگوں کو اُکھاڑنے کی بہت کچھ کوشش کی گئی مگر اُس وقت کسی کا جادو

جادو اُن پر نہ چل سکا۔

مجلس مال گزاری کی رکنیت

بہرحال سر سالار جنگ مرحوم کے آخری زمانے میں جب انقلاب کی آندھیاں چلنی شروع ہوئیں تو ہمارے مولانا پٹن چرو کی صدر تعلقہ داری سے بُلا کر مجلس مال گزاری کے ایک ممبر بنا کر حیدر آباد میں بلائے گئے اس مجلس کے اُس زمانے میں تین رکن تھے ایک مولوی دلیل الدین صاحب احترام جنگ۔ دوسرے منشی اکرام اللہ خاں صاحب نواب یار جنگ بہادر تیسرے ہمارے مولانا۔ ان تینوں ارکان ثلثہ کی تنخواہیں سترہ سترہ سو تھیں۔ الغرض اس رکنیت کی وجہ سے مولانا کا قیام اب مستقل طور پر حیدر آباد میں ہوگیا یہ زمانہ نواب میر لائق علی خاں بہادر سر سالار جنگ ثانی فرزند اکبر نواب سر سالار جنگ اوّل کی مدار المہامی کا تھا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ نواب میر لائق علی خاں بہادر اور نواب میر سعادت علی خاں منیر الملک بہادر معین المہام مال دونوں کو ہمارے مولانا سے تلمذ تھا۔ وہ اُستادی شاگردی اس وقت کام آئی۔ مدار المہام سرکار عالی کے پاس علی التواتر باریابی ہونے لگی۔ بلکہ ہفتے میں دو دن خاص اس کے لیے مقرر ہوئے کہ ہمارے مولانا مدار المہام کو تعلیم دینے جایا کریں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے دیکھا تو یہ بات اُن کو کھٹکی۔ اور انھوں نے پہلے مولوی شرف الحق صاحب اور حافظ عبد الواحد صاحب پر ہاتھ صاف کیا دونوں کو تخفیف میں ڈال دیا۔ مولوی احمد حسن صاحب بھی صوبہ شرقی کے شکست ہونے سے گھر بیٹھ گئے تھے۔ مولانا کو ایک دم سے اپنے تین عزیزوں کی علحدگی بہت ناگوار گزری۔ نواب محسن الملک مرحوم نے باوجود مقتدر ہونے کے کوئی مدد نہ کی۔ اِن سے کہا بھی گیا۔ مگر انھوں نے اِس کان سُنا اور اُس کان اُڑا دیا۔ یہ بنا بگاڑ کی ہوئی اور دلوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ سازش کا بازار گرم ہوا۔ مجلس کے تینوں رکنوں میں سوء مزاجی شروع ہوگئی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکنے لگے۔ مولانا نے جب یہ انقلاب دیکھا تو فوراً استعفا دے دیا مولانا کا استعفا دینا تھا کہ مجلس مال گزاری کے کل پُرزے ڈھیلے پڑ گئے۔ مولانا کی جگہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کرسی نشین ہوئے مگر کب جب کہ اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ سُنا ہے کہ یہ مجلس کئی دفعہ ٹوٹی پھوٹی۔ اب اس کی جگہ ریونیو سکرٹریٹ قائم ہے۔

مولانا کا استعفا و پنشن

مجلس مالگزاری کے کام کی خرابی کی شکایت۔ ارکان کے باہمی اختلافات کو خود مولانا نے مدار المہام بہادر سے عرض کیا۔ بعض لوگوں نے پولیٹیکل جوڑ توڑ چلے۔ آخر صلاح یہ ٹھیری کہ چوں کہ مولانا کو رکنیت مجلس پسند نہیں ہے بہتر ہوگا کہ کوئی دوسری خدمت دی جائے مگر مشکل یہ تھی کہ کوئی دوسری خدمت ایسی نہ تھی جس میں سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مل سکے۔ لہذا ایک جدید خدمت مشیر مال کی گھڑی گئی جو بے کار محض اور برائے نام تھی۔ مطلب صرف یہ تھا کہ مولانا کو انگشتِ ششم بنا کر بٹھا دیا جائے تنخواہ تو پوری ملتی مگر کام کچھ بھی نہ تھا۔ مولانا نے اس طرح تنخواہ لینا پسند نہیں کیا۔ جس شخص کی ساری عمر کام کرتے گزری ہو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیونکر بیٹھ سکتا تھا مولانا نے اِس اختراعی عہدے سے صاف انکار کر دیا سر سالار جنگ ثانی نے مولانا کی بہت دل جوئی کی اور بہت کچھ سمجھایا مگر مولانا نے ایک نہ مانی اور غصے میں آ کر استعفا دے دیا سر سالار جنگ مرحوم ثانی نے کئی دن تک استعفے کو یوں ہی ڈال رکھا خود بھی مولانا کو سمجھایا اور لوگوں سے بھی کہلوایا جب ہر طرح سر سالار جنگ مجبور ہوگئے تو ناچار استعفا منظور کرنا پڑا۔ استعفے کا منظور ہونا تھا کہ مولانا کبیدہ خاطر ہو کر حیدر آباد سے فوراً بیک بینی و دو گوش نکل کھڑے ہوئے کسی کو

ان کے جانے کی خبر ہوئی کسی کو نہیں۔ گھر کا سامان گھوڑا گاڑی سب بھرا پُرا چھوڑ گئے جو بعد میں کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا گیا۔ مولنا نے ایک جگہ حیدر آباد سے اپنے آنے کی نسبت یہ فقرہ لکھا ہے "سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد اُن کے سبھی آوردوں کے پائے ثبات لڑکھڑا اُٹھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا"

مولنا نے جس زمانے میں استعفا دیا تھا اُس زمانے میں حسن بن[1] عبد اللہ جو آگے چل کر نواب عماد نواز جنگ بہادر سے ملقب ہوئے اکونٹنٹ جنرل تھے ہمارے مولنا کے عہدِ صدر تعلقہ داری میں عماد نواز جنگ اِن کے ماتحت ضلع میدک کے کلکٹر رہ چکے تھے۔ آدمی راست باز اور دیانت دار تھے اور چوں کہ عرب کے شریف قبیلے کے تھے اُن کی رگوں میں صداقت کا خون دوڑ رہا تھا وہ مولنا کے چلے آنے سے بہت ملول ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ عام لوگوں کی زبان پر جاری تھا کہ حیدر آباد سے ایک ایسا لائق و فائق آدمی چلا گیا۔ انھیں حسن بن عبد اللہ صاحب نے مولنا کی پنشن کی کارروائی کو سُلجھایا۔ جو معاہدہ خدمات گورنمنٹ انگریزی سے مستعار لینے کے وقت ہوا تھا اُس میں ایک یہ بھی شرط تھی کہ مولنا کی مدتِ ملازمت گورنمنٹ انگریزی میں بھی پنشن کے وقت محسوب کر لی جائے گی اِس کے شامل کرنے کے بعد بھی مدتِ سی سالہ جو نصف پنشن کے لیے درکار ہے پوری نہیں ہوتی تھی پنشن کو پورا کرنے کے لیے مولنا کے اُن رسائل پر لحاظ کیا گیا جو اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی حضرت نظام دکن کے لیے تصنیف فرمائے تھے۔ اگرچہ اُن کو لکھے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے مگر اُن کے صلے میں دو سو روپے ماہوار کا دوامی انعام منظور ہوا۔ اور اس طرح چھ سو روپیہ ماہوار کی معقول پنشن گورنمنٹ نظام سے مولنا کو گھر بیٹھے مل رہی ہے بہر حال خداوند تعالیٰ نے نہایت نیک نامی سے ملازمت کے دن کاٹ دیئے۔ اس کا مولنا ہمیشہ شکر بجا کرتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خاں بہادر ادام اللہ اقبالہ و خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کو دل سے دعائیں دیا کرتے ہیں ؎

[1] حیدر آباد میں بلکہ ہندوستان میں یہ بہت مشہور شخص گزرے ہیں حسن نامی ایک ماہوار رسالہ بھی یہ بزرگ شائع کرتے تھے ۱۲۔

حصّہ چہارم

حلیہ مولٰنا نذیر احمد صاحب کا قد نہ بہت لمبا ہے نہ چھوٹا۔ بلکہ خیر الامور اوسطہا کی رو سے متوسط ہے۔ بدن دُہرا ہے۔ رنگ کُھلا ہوا گندمی۔ چہرہ مصحف اُبھرا ہوا چیچک کے داغوں سے پاک گویا تفسیر فیضی ہے کہ نقطہ ندارد۔ بلند اور چوڑی پیشانی بھویں جُدا مگر گھنی۔ آنکھیں بڑی اور رعب دار۔ ناک بلند نتھنوں پر قدرے پھیلی ہوئی۔ ہونٹ پتلے۔ دہانہ متوسط۔ دانت ہموار اور سفید تھے۔ گردن موٹی اور متوسط۔ جس پر کوتہ گردن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ سینہ بہت چوڑا۔ بالوں سے صاف ایسا سینہ جو علم و فضل کا گنجینہ ہے بہت کم دیکھنے میں آیا ہے ڈاڑھی زنخداں پوش۔ رخساروں پر چھدرے بال۔ مونچھیں بڑی اور بھری ہوئیں۔ ڈاڑھی کو اوائل میں کچھ قصر کیا کرتے تھے مگر اب نہیں۔ قصر الشوارب کرتے ہیں مگر اُسترے سے نہیں۔ کبھی کبھی خود چھوٹی سی مقراض لے کر لبوں کے بال تراش لیتے ہیں۔ اب عرصے سے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے مگر حدِّ اعتدال سے قدرتی طور پر بڑھنے نہیں پائی کہ بڑی ڈاڑھی کی تعریف میں شمار کی جائے۔ سر کے بال سُنا جاتا ہے کہ آغازِ ملازمت کے وقت سے تھے مگر اب تو ایک زمانے سے ہم چھوٹے چھوٹے دیکھتے ہیں۔ سُنا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں سر گُھٹا رہتا تھا اب بیچ میں چند و اصاف ہے بال بتدریج اُڑ گئے ہیں۔ چندوے کا صاف ہونا بلند اقبالی اور خوش بختی کی نشانی بیان کی جاتی ہے۔ ہاتھ اور پاؤں دونوں بھرے بھرے ہیں۔ ہتھیلیاں چوڑی چوڑی اور پنجے زبردست ہیں۔ پاؤں کا پنجہ بھی چوڑا ہے۔ پیٹھ بھی چوڑی ہے۔ توند نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ ڈیل ڈول ہمیشہ سے گداز رہا جو دُبلے اور موٹے کے درمیان میں تھا۔ اب بوجہ پیرانہ سالی اُس میں کمی آ گئی ہے۔ بدن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ورزشی تھا اور سُنا بھی ہے کہ مدتوں مگدر ہلاتے رہے اِس وجہ سے گوشت اب تک لٹکا ہوا نہیں۔ چہرہ بہت رعب دار ہے اور مجموعی حالت سے شرافت اور امارت ٹپکی پڑتی ہے۔ رفتار تیز ہے نہ سست بلکہ میانہ روی ہے جس طرح بھلے مانس چلا کرتے ہیں۔ آواز بہت بلند ہے اور اتنی بلند ہے کہ لکچر دیتے وقت بڑے

آڈینس میں بھی اُن کی اسپیچ کا ایک ایک لفظ واضح طور پر سُنائی دیتا ہے۔ آہستہ بات کرتے ہیں تو بھی ایک ایک لفظ سُنائی دیتا ہے دیوار ہم گوش دارد اُن کے پاس نہیں۔ کمرے کے اندر ہوں تو باہر سب باتیں سُنائی دیتی ہیں مشورے میں اور متفرق عام باتوں میں کچھ فرق نہیں۔ جہیر الصّوتی ہیں کریہ الصوتی نہیں ہے ایک خوش گوار بلند آوازی ہے۔ سر کی بڑائی دکھاتی ہے کہ اُس میں کیسا عمدہ بھیجا ہے اور بھیجے میں کیسے عمدہ ذہنی قوٰی ✽

وضع ولباس اور طریق بود و باش

جس طرح لوگوں کو بناؤ سنگھار، کنگھی۔ چوٹی۔ لباس فاخر عطر پان اور پھولوں کا شوق ہوتا ہے ان میں سے مولٰنا میں ایک بات بھی نہیں۔ انھوں نے نہ کبھی بال پالے نہ کنگھی کی نہ تیل ڈالا۔ بُرش تو اپنی جگہ رہا۔ لمبے بال والوں کو جو ہمیشہ بناؤ سنگھار میں تضیع اوقات کرتے ہیں ان کو بہت ناپسند ہے اپنے بچّوں کو کبھی بال بڑھانے یا تیل ڈال کر پٹیاں نہیں جمانے دیں۔ خود فوق البھڑک یا لباس فاخر کبھی نہیں پہنا ہمیشہ صوفیانہ لباس مرغوب طبع رہا۔ برٹش گورمنٹ کی ملازمت کے زمانے کا لباس ایک بر کے پائجامے۔ گھٹنوں سے نیچے کرتے جن میں گھنڈی دار گریبان دونوں طرف نکمے اور گھنڈیاں لگی ہوئی۔ چوڑی آستینیں اور اچکن بس اسی قسم کا لباس تھا۔ بندوبست کی ڈپٹی کلکٹری تھی جانچ پڑتال کے لیئے اُن کو اکثر اوقات کھیت کھیت پھرنا پڑتا تھا ہندوستانی جوتی اس رگڑ میں کیا ٹھیرتی ناچار انگریزی بُوٹ پہننے لگے تھے مگر دو چار دن کے لیئے دہلی آتے تو گھر میں سے کبھی کے پڑے ہوئے پھٹے پُرانے لیتڑے ڈھونڈ کر پاؤں میں لگا لیتے تب کہیں گھر سے باہر نکلتے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ ان باتوں کو بھی کفر و ارتداد کے درجے تک پُہنچا دیتے تھے۔ جب سے حیدر آباد گئے تو لباس میں ذرا تغیر پیدا ہو گیا۔ بر کے پائجاموں کی جگہ تنگ پائچوں کا پائجامہ مگر ٹخنوں پر پڑا ہوا پہننے لگے تھے۔ ٹخنوں سے نیچا تو کبھی بھی نہیں ہوا۔ مگر اب ٹخنوں سے اُونچا ہو گیا ہے مگر اتنا نہیں جیسا وہابی پہنا کرتے ہیں لمبے کرتوں پر بعض اوقات صدری بھی پہنتے ہیں سب کپڑے ڈھیلم ڈھالے ہوتے ہیں۔ بدن میں مڑھے ہوئے کپڑوں سے ہمیشہ متنفّر رہے۔ گوٹا۔ کناری۔ لیس یا سلمے ستارے کی ٹوپیاں کبھی اُن کو نہ بھائیں۔ اُس زمانے میں ترکی ٹوپی کا رواج نہ تھا کانپور کی ساخت کی سیاہ اطلس کی سوزنی کی چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ سرکار دربار میں جب جاتے تو سر پر عربی عمامہ اور چُغہ مستزاد۔ جو حال ٹوپی کا تھا وہی جوتی کا تھا کبھی کامدار جوتی نہیں پہنی وہی سلیم شاہی سادہ نری کی مگر قیمتی اور مضبوط استعمال کیا کرتے تھے۔ کچہری دربار کے وقت صرف انگریزی شوز پہن لیتے تھے مگر گھر پر کبھی نہیں پہنتے تھے اور اسی طرح کبھی کف دار کرتا۔ قمیص یا کوٹ پتلون نہیں پہنا۔ حیدر آباد میں اگرچہ فیشن کا بہت چرچا تھا اور نواب محسن الملک مرحوم کا میلان اِس طرف بالخصوص تھا اور مولٰنا کو ہمیشہ وہ مجبور بھی کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات مولٰنا کی پُرانی روش پر چھیڑتے بھی تھے لیکن اُنھوں نے اپنی پُرانی وضع نہیں چھوڑی۔ تاہم کہنے سُننے سے یا وقتی ضرورت کی وجہ سے ٹرکی ٹوپی اور کبھی فلٹ کیپ اور شروانی پہننے لگے تھے اور اسی کے ساتھ بوٹ نہیں بلکہ شوز۔ لیکن کالر۔ نک ٹائی۔ بریچز۔ فراک کوٹ۔ اوورکوٹ۔ السٹر وغیرہ وغیرہ کا ان کے پاس گزر نہ تھا۔ اوورکوٹ اور السٹر کی جاڑے میں فرغل اور روئی دار کپڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ غرض انگریزی لباس اور طرز سے کچھ دلی نفرت سی تھی۔ لیکن اور لوگوں کی خاطر یا فرنگیانہ طرز معاشرت یورپ کی وجہ سے قسم قسم کا فرنیچر اور میز کرسی سب کچھ

موجود تھا مگر وہ جب بیٹھتے تو مسند ہی پر تکیہ لگا کر۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں مجبوراً میز کرسی پر اجلاس کرتے تھے اور اسی طرح جب وہ حیدر آباد میں رونیو بورڈ کے ممبر تھے میز کرسی پر اجلاس کرتے تھے۔ وہاں اگر ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ وہاں کا یہی طریقہ تھا لیکن جب تک صدر تعلقہ دار رہے گھر اور دورے میں عادۃً فرش کی نشست رکھتے تھے۔ ملنے ملانے والے وہیں دوڑا تو بیٹھ جاتے تھے کوئی بڑا آدمی آگیا تو بعض وقت اُس کے لیئے کرسی منگادی اور خود مسند پر بیٹھے رہے یا بلحاظ ضرورت وقتی کبھی خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے مگر بے چین اور متردد آرام اُن کو فرش ہی کی نشست میں ملتا تھا۔ مولٰنا نے کبھی انگریزی لباس اور طرز ماندوبود کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ اُس سے متنفر رہے۔ جن لوگوں نے ابن الوقت دیکھی ہے اُن کو مزید شہادت کی کیا ضرورت ہے لباس کے متعلق مولٰنا کا جو کچھ خیال ہے وہ ضرور قابل قدر ہے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں "باوجودے کہ لباس جزو بدن نہیں پھر بھی اُس کو آدمی کی روحانی اور جسمانی زندگی میں بڑا دخل ہے۔ جسمانی زندگی میں اِس لیئے کہ دفع حرّ و برد کے واسطے لباس کی ضرورت ہے اور روحانی زندگی میں اِس لیئے کہ بھلمنساہت اور وضع داری کی حد سے گزر کر لوگ لباس میں اسراف ناروا کرنے لگے ہیں اور اسراف کے علاوہ لباس کو اظہار کبر کا ذریعہ قرار دے رکھا ہے اسراف اور اظہار کبر نہ ہو تو لباس میں خوش حالی کا اظہار ایک پیرایہ شکر کا ہے۔ شارع اسلام نے مسلمانوں کے لیئے کسی خاص وضع کی وردی تجویز نہیں کی۔ اور خاص وضع کی وردی کا تجویز کرنا مناسب بلکہ عموم اسلام کے لحاظ سے ممکن بھی نہ تھا۔ یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کافۃ انام کی طرف مبعوث ہوئے اور کافۂ انام تمام روے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور روے زمین پر کہیں خشکی ہے۔ کہیں تری۔ کہیں پہاڑ۔ کہیں جنگل۔ کہیں میدان۔ کہیں سردی۔ کہیں گرمی۔ کہیں دن۔ کہیں رات۔ تو موسموں اور آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کے لباس میں لوگ زندگی بسر کر نہیں سکتے۔ پس یہ بڑا دانشمندانہ اُصول تھا جو اختیار کیا گیا کہ لباس کو لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیا کہ اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے جو چاہیں اور جیسا چاہیں پہنیں اوڑھیں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو اہل عرب نے لباس کی تراش خراش میں کچھ ایسی ترقی کی نہ تھی اُن کا معمولی لباس تھا ایک ردا (چادر) ایک ازار (تہمد) ہاں مردوں کے منہ پر ڈاڑھیاں ہوتی تھیں۔ سر پر عمامے پیروں میں چپل (چمڑے کی تلیاں تسمے دار) بااین ہمہ پیغمبر صاحب سے شامی جبے اور سبتی جوتے کا پہننا بھی ثابت ہے۔ ہاں احادیث میں ٹخنوں سے نیچے ازار کے لٹکانے پر بڑی لتاڑ ہے سو کبر کے لحاظ سے کہ اُن وقتوں کے آوارہ مزاج بانکے چھیلا ایسا کیا کرتے تھے ایک حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ[1] ہے جس پر ان دنوں بڑا غل مچا ہوا ہے۔ لوگوں نے انگرکھا پائجامہ چھوڑ کر کوٹ پتلون اختیار کر لیا ہے اور ایک کوٹ پتلون پر کیا موقوف ہے تمام تر تمدن انگریزوں کا سا ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔ اس پر پُرانی وضع پرانے خیال کے مسلمان اتنا تشدد کرتے ہیں کہ فہو منہم سے کفر و ارتداد کا استنباط کرتے ہیں۔ حالانکہ وضع ظاہر کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ انگریزی وضع کی تقلید کرنے والوں کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی خاص وردی مقرر نہیں ہر ملکے وہر رسمے ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ بے شک ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی خاص وردی مقرر نہیں مگر باوجود اختلاف اوضاع کے اتنا امتیاز تو ضرور باقی ہے کہ ہندوستانی لباس انگریزی لباس سے صاف پہچان

[1] جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اُن ہی میں سے ہے ۱۲

پڑتا ہے۔ پس اس امتیاز کو مٹا دینا اور رواجی وضع کو ترک کر کے ایسی وضع اختیار کرنا جو اس ملک میں اہل یورپ کے ساتھ خاص ہے۔ اگر آرام و آسائش کے لیئے ہو تو خیر ایک وجہ بھی ہے مگر اس ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے انگریزی لباس اُلٹا تکلیف دہ ہے اور سوائے تشبہ کے اور کوئی وجہ اس کے اختیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ اور تشبہ کی غرض و غایت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی نقل کرنے للاس عظمۃ و ہیبۃ سے جو فی عین الناس لازمۂ قوم حکمراں ہے حصہ لے ہم قانون فوجداری میں ایک دفعہ پاتے ہیں جس کی روسے ملازم سرکاری کے ساتھ تشبہ کرنا جرم فوجداری قرار دیا گیا ہے۔ چوں کہ جرموں کا مدار نیت پر ہے ہم تو انگریزوں کا سا لباس پہننے والے اور ملازم سرکاری کے ساتھ تشبہ کرنے والے کو ایک درجے میں رکھتے ہیں کیونکہ دونوں کی نیت ملتی جلتی ہے۔ جرم فوجداری نہ سہی یہ اخلاقی الزام کیا کم ہے کہ انگریزی لباس پہننے والا اظہار قومی کی تذلیل کرتا ہے لیکن اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ کا آہنی قاعدہ اپنا اثر دکھا رہا ہے اور لوگ مجبور ہیں۔"

اسی طرح مولانا کھانے پینے میں بھی شروع سے اب تک ہندوستانی طریقے سے کھاتے پیتے ہیں۔ ہاں کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ دوستوں کے اصرار سے یا کسی ڈنر کے موقع پر میز کرسی پر اور چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک مرتبہ جب اول اول میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا تو عجیب واقعہ گزرا اس واقعے کی نسبت مولانا فرماتے ہیں کہ "مجکو پہلے پہل ایک دوست کے ہاں انگریزوں کی طرح میز چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا تو لوگ دہنے ہاتھ میں چھری اور بائیں میں کانٹا لے کر کانٹے سے بوٹی کو رکابی میں دباتے اور دہنے سے کاٹتے اور کانٹے میں بیندھ کر بوٹی کو بائیں ہاتھ سے مونھ میں رکھ لیتے۔ میں کن انکھیوں سے دوسروں کے عمل کو دیکھتا اور اسی کی نقل کرتا جاتا تھا تاکہ اناڑی نہ سمجھا جاؤں۔ تاہم ایک یا دو مرتبہ تو ایسا ہوا کہ مہارت تو تھی نہیں بایاں ہاتھ اچھی طرح بوٹی کو نہ دبا سکا اور کانٹے میں بوٹی اُچٹ کر غنیمت ہوا کہ میری ہی آنکھ میں لگی۔ دوسری اضطراری بے تمیزی یہ ہوئی کہ آنکھ کی جلدی میں سالن سے بھرے ہوئے چھری کانٹے کو رکابی کے باہر رکھ دیا۔ میز کے اُجلے دسترخوان میں دھبے پڑ گئے۔ میں دیکھتا تھا کہ خدمت گار تک میری اس حرکت پر مونھ پھیر کر ہنس رہے ہیں۔ بارے ایک خدمت گار نے سالن کی دوسری رکابی سامنے لا کر رکھ دی اس مرتبہ میں نے یہ احتیاط کی کہ بڑی بوٹی کو چھوا تک نہیں۔ چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کانٹے میں بیندھ کر مونھ میں رکھنی شروع کیں۔ اب ایک اور نئی مصیبت پیش آئی کہ بائیں ہاتھ کا نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا پیٹ تو کیا بھرتا۔ خدا خدا کر کے ڈنر تمام ہوا اور میں دیوالی کی کلھیا کی طرح الوان نعمۃ سے چپا ہوا مونھ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ انگریزوں میں تو کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کلی کرنے کا دستور نہیں کھانے کو ہاتھ لگایا ہو تو دھوئیں لیکن میں کیونکر مونھ نہ دھوتا کہ سارا لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد بارہا متشبہ بالنصاریٰ دوستوں کے ساتھ میز پر چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا ہے پہلے کی طرح تو نشانہ خطا نہیں کرتا مگر میز اور چھری کانٹے کا پورا پورا ادب سُنا ہے کہ محتاج تعلیم و مشق ہے خصوصاً میزبانی بڑی ٹھیڑی کھیر ہے۔"

چھپے ہوئے اور مُہر شدہ فتووں کے سوا ہمارے ملک کے بعض متعصبین علماء اور عوام جہلا کی زبانوں پر اس قسم کے اکل و شرب داخل مِن تشبہ ہیں لیکن ہمارے نزدیک لوگوں کے صرف توہمات ہیں وضع ظاہری اور طرز ماند و بود

انفنٹری کے کچھ لوگ جس میں حوالدار جماعہ دار اور عہدہ دار سب شریک تھے مولنا کے مکان پر پونہچے۔ یہ لوگ تعداد میں کوئی پچاس ہوں گے۔ سب کے سب مسلح وردی پہنے ہوئے ایک ساتھ مردانے مکان میں دراتے گھس گئے اُس وقت مولنا تنہا بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے حُقّہ سامنے رکھا تھا السّلام علیکم کی پچاس آوازوں نے مولنا کی نگاہ کتاب کی طرف سے ہٹائی۔ دیکھا کہ بہت سے مسلح فوجی لوگ ہیں۔ وعلیکم جواب پاکر ایک ایک نے مصافحہ کیا۔

مولنا نے پوچھا :- آپ صاحبوں نے کیوں تکلیف کی ؟

فوجی لوگ :- آپ کی شہرت۔ نام آوری۔ اور آپ کی تصانیف اور مخصوص ترجمۃ القرآن نے ہم لوگوں کو گرویدہ کیا ہے۔ جس طرح دہلی کے عجائبات اور قابلِ دید مقامات وارد و صادر کے لیئے دیکھنے کی چیزیں ہیں آپ کی زیارت بھی کم متبرک نہیں بلکہ ہم لوگ اِس سے زیادہ متبرک آپ کو سمجھتے ہیں آپ فخرِ اسلام اور حکیمِ اُمت ہیں۔ دہلی آکر اگر ہم آپ کی زیارت نہ کرتے تو گویا دہلی آنا ہمارا بے کار تھا۔ اِس لیئے ہم نے یہ جرأت کی اور آپ کی قدم بوسی کو آئے سوائے اِس کے اور کوئی تمنّا یہاں نہیں لائی

مولنا :- مجھ جیسِ ناکارہ کو کیا دیکھنے آئے ہو۔ مَیں تو بانگ دہل ہوں جو دور ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے

چو صوتِ دُہل ہولم از دور بُود به عیبہ[1] درم عیب مستور بود

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ ؎

کس قسم کے لوگوں سے مِل کر خوش ہوتے ہیں

دنیا کا قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے ہم مشربوں سے مِل کر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولنا ذی علم آدمیوں کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ ہوا کرتے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں بہت کم یاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بے تکلفانہ صحبت بہت کم رہا کرتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ مولنا کا بالطبع طالب العلم وضع اشخاص کی طرف زیادہ رجحان ہے اور وہ اِس قسم کے لوگوں سے بے تکلف ملتے ہیں۔ کم عمر نوجوانوں سے بھی مل کر خوش ہوتے ہیں خصوصًا وہ جو کسی قدر ترقی تعلیم کے آثار دکھاتے ہیں اور نیچری خیالات کے مطابق ہونہار کہے جا سکتے ہیں ❊

وقت کی پابندی

اگرچہ ہمیشہ سے رہنے سہنے کی طرز پُرانے طریقے پر ہے لیکن وقت کی پابندی انگریزی طریقے پر ہمیشہ سے رہی ہے۔ ملازمت کے زمانے میں یا یوں کہیے کہ پنشن لینے سے قبل وہ ہر کام اپنے وقتِ مقرر پر کرتے تھے۔ ریل کے سفر کے وقت کچھ دیر پہلے سے اسٹیشن پر جا بیٹھتے۔ بہرحال جس بات کے لیئے جو وقت مقرر کر لیتے حتی المقدور اُس کی ضرور پابندی کرتے کسی کام میں ڈھیل نہ ڈالتے ایک روز حیدرآباد میں نواب افسر الدولہ بہادر کے ہاں جانے کے لیئے نواب اکبر علی صاحب آنے والے تھے گو انتظار میں مولنا گھبرا رہے تھے مگر سنا ہے کہ بار بار گھڑی کھولتے نہیں دیکھا۔ حال آں کہ گھڑی اُن کی جیب میں موجود تھی کچہری آنے جانے میں سختی سے وقت کے پابند تھے۔ نماز روزہ پڑھنا پڑھانا۔ کھانا پینا۔ غرض سب کاموں میں وقت کی پوری پابندی کرتے تھے۔ پنشن لینے کے بعد بھی وقت کی پابندی کا وہی حال ہے نشست کے کمرے میں اب بھی ایک بڑی گھڑی دیوار میں لگی ہے جیب گھڑی نہیں رکھتے۔ انعام والی گھڑی اپنے بیٹے کو دے دی لیکن از بسکہ ہمیشہ مشغول رہتے ہیں قدرتی طور پر کام کرتے کرتے ایک طرح کی پابندی ہوگئی ہے۔ وقت کی پابندی ہمارے خیال میں یہ ہے کہ جب وقت آئے آدمی بے چین

[1] عیبہ یعنی توشہ دان وجامہ دان ۱۲

ہوجائے اور جس طرح بارود آگ کی چنگاری پونہچتے ہی بھک سے اُڑ جاتی ہو فوراً وہاں سے اُڑ جائے یا جہاں جس وقت جانا ہو
ٹھیک اُسی وقت پونہچ جائے یا ٹھیک وقتِ مقررہ پر اپنے کاموں یا اپنے فرائض کو انجام دے۔ اس قسم کی وقت کی پابندی
سُنا گیا ہو کہ ملازمت کے وقت تک تھی اب خانہ نشین ہونے کے بعد نہ چنداں اُس کی ضرورت ہو نہ ویسا اب اہتمام ہو مگر وہی
عادت کی وجہ سے سب کام اپنے اپنے وقت پر ہوتے رہتے ہیں۔ اُٹھنے کے وقت اُٹھتے ہیں کھانے کے وقت کھانا کھاتے ہیں۔
سونے کے وقت سوتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے وقت لکھتے پڑھتے ہیں اور حسبِ معمول روزانہ نمازِ عصر پڑھنے کے بعد حافظ
سراج الدین صاحب کی دُوکان پر جاتے ہیں اور سات آٹھ بجے رات کو آتے ہیں +

مہمان داری اور طریقِ طعام

"خورانیدن صد عیب و نہ خورانیدن یک عیب" مولٰنا نہ صرف اِس مثل کے قائل
ہیں بلکہ عامل بھی ہیں۔ اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مہمان داری کو پسند نہیں کرتے نہ صرف اَوروں کی اپنے ہاں بلکہ اپنی بھی
اَوروں کے ہاں دعوت نک سے چڑ ہی۔ بہت ہی مجبوری سے وہ کسی کی دعوت کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سخت مجبوری کی
حالت میں دعوت کھاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شائبۂ بخل ہو۔ مگر ہمارے نزدیک لوگوں کا یہ خیال غلط ہو۔ لوگوں کے اس
خیال کو نہایت صحیح طور پر ہم آگے چل کر **صرفِ دولت** کے عنوان میں مثالیں دے کر غلط ثابت کریں گے۔ بہر حال مولٰنا
کے ہاں مہمان داری کچھ بھی نہیں لیکن اگر کوئی آجائے تو بھوکا بھی نہیں جاتا۔ نہ اُس کے لیئے کوئی خاص آؤ بھگت ہوتی
ہو اکا دُکا کوئی مہمان آجاتا ہو۔ یہ بھی ایک اتّفاق کی بات ہو کہ مولٰنا کے ہاں جو مہمان ہوتے ہیں وہ بھی اُنھیں کے فیشن اور
اُنھیں کے مزاج کے ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر کسی مہمان کے لیئے تکلّف ہوتا ہو تو ہوتا ہو۔ ورنہ سب ایک ہی لاٹھی سے ہانکے
جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں سُنا کہ مولٰنا نے ایک مرتبے کے سوا کبھی کسی کو ڈنر دیا ہو یا ہینکوٹ ہوا ہو۔ اور یہی وجہ ہو کہ برتنوں کے
سٹ یا سلور پلیٹ یا چھری کانٹے اور کھانے کی میز کا اُن کے ہاں نام و نشان بھی نہیں۔ جب کبھی دعوت تو کیا کسی کو اگر
اپنے ساتھ کِھلاتے ہیں تو دستر خوان پر۔ کھانا بھی وہی معمولی۔ اِلّا ایک دفعہ جب کہ سر سالار جنگ اول کے صاحب زادے نواب
لائق علی خاں بہادر (عماد السلطنہ سر سالار جنگ ثانی) پٹن چرو مستقر صدر تعلقہ داری پر رونق افروز ہوئے تھے۔ اُن کو
انگریزی ڈنر دیا گیا تھا۔ چوں کہ پٹن چرو سے حیدر آباد قریب ہو سب سامان شہر سے منگوا لیا گیا تھا +

غرض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ مولٰنا مہمان نواز نہیں اور ہم کہتے ہیں کہ وہ مہمان نواز تو ہیں مگر رسم و رواج کی پابندیوں
سے ضرور گھبراتے ہیں۔ خام طبع لوگوں کی طرح اُن میں گھلاوٹ اور ملاوٹ فوراً پیدا نہیں ہوتی۔ اِس خاص بات میں ہمارے مولٰنا
کو ڈاکٹر جونسن سے کسی قدر نسبت دی جاسکتی ہو کہ وہ بھی اِن فضول رسموں سے بہت ہی گھبراتا تھا۔

مولٰنا ہمیشہ اُبلے ہوئے انڈوں اور چائے کا ناشتہ کرتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہو کہ ایک متوسط قدح میں شیر گرم ناشتے
کی جگہ پی لیتے ہیں مگر کھانے پینے کا کوئی خاص کمرہ مقرر نہیں ہو وہیں جہاں نشست ہو بلکہ اُسی بالشت سوا بالشت میز پر جہاں
لکھتے پڑھتے ہیں ناشتہ۔ کھانا پانی سب وہیں ہوتا ہو۔ چائے کے ساتھ بسکٹ نہیں ہوتے۔ چائے بھی صرف صبح ہی کو پیتے
ہیں اور کسی وقت نہیں۔ سب سے زیادہ اہتمام کھانے کے وقت کا پابندی سے ہوتا ہو۔ صبح کو ہلکے ناشتے کے بعد دن کا کھانا بارہ
بجے کے قریب کھا لیتے ہیں بغیر طلب آدمی کھانا لے آتا ہو وہی فرشی میز پر چن دیتا ہو لقمے کو شوربے میں خوب ڈبو کر کھاتے ہیں

اور اسی طرح رات کا آٹھ بجے کے بعد کھاتے ہیں جو کچھ کھانا پینا ہو ان دونوں وقتوں کے سوا بیچ میں کبھی نہیں کھاتے اور کھانے میں حتی المقدور گوشت روٹی ہی زیادہ مرغوب ہے۔ مختلف اغذیہ سے جو معدے میں گڈ مڈ ہو جائیں پرہیز کرتے ہیں صرف تبدیلِ ذائقہ کے لئے کسی قسم کی بھی ہو تھوڑی مٹھاس بالالتزام چکھ لیتے ہیں۔ کوئی خاص مٹھائی متعین نہیں اور کچھ نہ ہو تو شکر ہی سہی +

حقہ پان وغیرہ

معلوم ہوتا ہے کہ حقے پان کی عادت پرانی ہے بعض خطوط سے اس کا پتہ بھی چلتا ہے مثلاً ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "ذرا مہربانی فرما کر کم بخت حقے کو درست کرا رکھیئے گا۔ شاید چلتے چلتے تو بات چیت کرنے لگا تھا" ایک جگہ اور لکھا ہے "مجکو جو تکلیف ہے حقے کی ہے میں کیا جانتا تھا کہ حیدرآباد ایسا نامعقول شہر ہے۔ اچھا تمباکو نہیں۔ حقہ نہیں۔ نیچہ نہیں قفلی نہیں۔ بڑی بے حرمتی سے گزرتی ہے۔ اگر آنا ہو تو دو حقے ایک بدری دوسرا حسب پسند اور چار نیچے۔ دو عمدہ۔ دو معمولی ضرور لانا یا بھیج دینا"

غرض مولنا حقہ پیتے ہیں مگر نہ افیمیوں کی طرح۔ اَب تو پان کھاتے دیکھا نہیں مگر جب کبھی کھاتے تھے تو بیگموں کی طرح نہیں کھاتے تھے کہ ہر وقت کلّے کے تلے پان دبا رہے پان میں چونا اور کتھا ملا کر لگایا جاتا تھا کہ مونھ نہ پھٹ جائے۔ الائچی کا التزام نہ تھا کسی نے ڈال دی تو خیر ورنہ نہیں البتہ زردے کی عادت تھی۔ خاصدان میں پان کی گلوریاں بھری رکھی رہتی تھیں۔ مگر بکری کی طرح سے چبانے کے لئے نہیں۔ آئے گئے کے واسطے بے زردے کا پان آیا کرتا تھا۔ اور زردہ کھانے والے کو خاصدان میں سے عطا ہوا کرتا تھا۔ حقہ صرف ایک ہی رہتا تھا وہ بھی پیچوان یا کلی نہیں بلکہ قفلی دار حقہ مگر بڑا جس میں پانی زیادہ آئے اور خوب آواز دے۔ تمباکو البتہ جون پوریا لکھنؤ کا ہوتا تھا جس سے سارا کمرہ مہک اُٹھتا تھا۔ مولنا کے ادب کی وجہ سے کوئی شخص اُن کے سامنے حقہ نہ پیتا تھا ہاں کسی شخص پر عنایتِ خاص ہوئی تو وہ اپنا حقہ اُس کے آگے کھسکا دیا کرتے تھے پان اور حقے کی طلب زیادہ نہ تھی مگر مشغلہ ضرور زیادہ تھا۔ طلب نہ ہونا اس وجہ سے کہا گیا کہ دونوں چیزیں سفر ریل میں یا دورے میں چھوٹ جاتی تھیں۔ نہ حقہ ساتھ جاتا تھا نہ پان دان۔ اب جب سے دانت گر گئے ہیں پان تو یک لخت چھوڑ دیئے ہیں مگر حقہ جاری ہے صرف اتنا فرق ہے کہ خمیرہ ندارد معمولی سادہ تمباکو پیتے ہیں۔ صبح سویرے اُٹھتے ہی عادۃً ایک چرٹ پی لیا کرتے ہیں وہ بھی پورا نہیں آدھا صبح سویرے آدمیوں کو حقہ بھرنے کی تکلیف نہیں دیتے۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن حقے پان کے متعلق مولنا کی جو کچھ رائے ہے وہ اس قدر صائب ہے کہ لکھے بغیر چارہ نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان تمباکو کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ حال آں کہ یہ سب چیزیں ہم مسلمانوں میں اِس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اَب ان ہی کی تواضع مدارات رہ گئی ہے اور غالبًا دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد و زن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقہ پان تمباکو ماکولات اور مشروبات کی قسم سے ہیں نہیں.... مگر بولتے ہیں حقے پان تمباکو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے...... حقے پان تمباکو میں حقے کا تو کچھ قصور نہیں کہ وہ ایک آلہ ہے اور نہ پان کا کہ وہ پتا ہے قصور جو کچھ ہے تمباکو کا ہے تو مولویوں کے جھگڑے میں کون پڑے کوئی اِس کو حرام بتاتا ہے کوئی مکروہِ تحریمی کوئی مکروہِ تنزیہی اور بعض اس کی حلت کے بھی قائل ہیں ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک لت لگا لینے کی تو بات ہی

اور یہ تمباکو کھایا جائے یا پیا جائے یا سونگھا جائے عادت سے پہلے لایعنی تو ضرور ہے اور مِنْ حُسْنِ اسلامِ المرءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ (آدمی کے اسلام کی خوبی سے لایعنی باتوں کا چھوڑ دینا ہے) کی رو سے تمباکو کا استعمال کسی طرح بھی ہو پرہیزگاری کی شان سے ہی بعید جتنے کا تمباکو ملک میں خرچ ہوتا ہے صوبے صوبے میں یونیورسٹی (دار العلوم) بنا دینے کا تو میں ٹھیکہ لیتا ہوں لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدّی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح پا سکتی ہے۔ مولوی بے چارے حرمت نہیں کفر و ارتداد کے فتوے بھی دیں تو تمباکو کا رواج رُک نہیں سکتا کہ اب شرطِ زندگی ہو گیا ہے ✤

سلسلہ رسل و رسائل جس طرح اِس زمانے کے شوقین عمدہ اسٹیشنری۔ مانوگرام۔ چوڑے لفافے اور صدہا قسم کے تکلفات مراسلت میں کرتے ہیں اُن کا یہاں پتا نہیں۔ ماسوای اس کے خط و کتابت سے شوق بھی نہیں۔ نہ شوقیہ نہ اظہارِ خیر و عافیت نہ طلبِ خیر و عافیت۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا نو نیوز از گڈ نیوز (بے خبری ہی خوش خبری ہے) کے قائل ہیں تاہم جواب طلب اور ضروری خطوط کا ضرور جواب دیتے ہیں۔ بعض اوقات اِس میں بھی التزام نہیں اپنے لکھنے پڑھنے کے اوقات میں مراسلت کے لیئے بہت کم وقت صرف کرتے ہیں بلکہ ہفتوں خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی اس لیئے کہہ سکتے ہیں کہ خط و کتابت کا دائرہ بہت تنگ ہے اور جب سے ہاتھ مرتعش ہو گیا ہے یوں کہئے کہ مراسلت بند ہے اعزہ و اقربا کو بھی خط نہیں لکھتے لیکن جب کبھی کوئی ضروری بات لکھنی ہوتی ہے تو دوسرے سے لکھوا دیا کرتے ہیں کوئی محرر اس کام کے لیئے مخصوص نہیں خط لکھوانے کے وقت جو لکھا پڑھا آدمی موجود ہوتا ہے اُس سے لکھوا دیا کرتے ہیں بعض وقت شاگرد ہوتے ہیں بعض وقت دوست ملاقاتی بعض اوقات اپنا کوئی ملازم۔ انگریزی خطوط کا جواب بھی خود بول کر لکھواتے ہیں مصنف حیاۃ النذیر کو بھی اس کی شکایت ہے کہ اُس نے اپنے بہت سے عریضوں کا جواب نہیں پایا ایک عرصۂ دراز تک اُس نے مسلسل اور متواتر عریضے بھیجے کہ اپنی زندگی کے کچھ نوٹ مرحمت کیجئے لیکن ہمیشہ ٹال ٹال دیا آخر تنگ آکر اُس کے تقاضائے شدید کے بعد خاص اپنے دست و قلم سے بخط مرتعش ایک خط لکھا جس کو حیاۃ النذیر کے مصنف نے بطور یادگار اوٹوگراف میں چھپوا کر حیاۃ النذیر میں منضم کر دیا ہے۔

صحت جسمانی صحت جسمانی ہمیشہ اچھی رہی۔ کیونکہ غذا بہت سادی اور وقت پر کھاتے تھے۔ مشی کی عادت بہت تھی دورے میں پیدل بہت چلا پھرا کرتے تھے مگدر بھی ہلایا کرتے تھے۔ گھوڑے پر بھی سوار ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ضعفِ معدہ اور پیٹھ کے ریاحی درد کی شکایت ہو جایا کرتی تھی مگر معمولی چند روزہ۔ اب تک بفضلہ تعالیٰ صحتِ جسمانی بہت خاصی ہے ہاتھ پاؤں مضبوط ہیں گو اب دانت نہ رہنے سے غذا اچھی طرح نہیں چبائی جاتی ہضم میں فتور۔ اور سقوطِ اشتہا اور اسی کے ساتھ گھٹنوں اور کمر میں درد بہت خفیف ثقلِ سماعت اور رات کو صاف دکھائی نہ دینا۔ چلنے پھرنے میں تکلّف یہ سب باتیں عمر کے ساتھ یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہیں "پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند" چلنے پھرنے کی حالت میں عصائے پیری سے مدد لیتے ہیں۔ اِس سن کہولت میں کم بخت بواسیر نے ستانا شروع کر دیا ہے۔ کمزور ہوتے جاتے ہیں مگر اس کے سوا کوئی شکایت نہیں۔ بغیر عینک کے لکھتے پڑھتے ہیں ✤

صوم و صلوٰۃ اور تلاوۃِ قرآن مجید صبح کی نماز اول وقت جب کہ اندھیرا ہوتا ہے مولٰنا ہمیشہ سے پڑھتے ہیں اور وہ نماز بڑے حضورِ قلب اور خشوع و خضوع سے پڑھتے ہیں ہم نے اسی نماز میں اُن کو بڑی بڑی سورتیں پڑھتے

سُنا ہو ورنہ اور وقت کی نمازوں میں چھوٹی چھوٹی سورتوں پر اکتفا کرتے ہیں اِس سے اندازہ ہوتا ہی کہ حضورِ قلب کی پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں لہاس کاٹنا نہیں چاہتے ایک جگہ مولنا فرماتے ہیں "غیر تو کیا جانے گا خود صاحبِ دل کو اپنی دل کی چوری کی خبر نہیں ہوتی جس لفافے کو خدا بند رکھنا چاہے کس کی طاقت ہی کہ کھول سکے ؏ عمر بھر مستور رکھا رازِ دل ؛ قبر میں جاکر لفافہ کھل گیا ؛ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہی کہ کسی نے اُن سے پوچھا مَا تَقُوْلُ فِیْ یَزِیْدَ (یزید کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں) آپ سُن کر خاموش ہو رہے یہ خاموشی وہی حضرت موسیٰ کی عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتَابٍ (اُن کا حال میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہی) کی مرادف تھی - اور حکمِ شرع بھی یہی ہی کہ بالتعیین کسی کو کافر کہنا درست نہیں مگر حکمِ شرع کو اور صرف حکمِ شرع ہی کو نہیں بلکہ عقل و انصاف کو بھی مانتا ہی کون ہی - اب تو لوگ تعیینِ اسمی پر بھی قناعت نہیں کرتے - جب تک اُس وہمی مقتدی کی سی تعیین نہ کرلیں جو نماز کی نیت کرتے وقت اِقْتَدَیْتُ بِهٰذَا الْاِمَامِ (میں اس امام کے پیچھے ہولیا) کے کہنے پر بس نہ کر کے موںھ سے امام کی طرف اشارہ بھی کیا کرتا تھا پھر اُس کا وہم ترقی کرتا گیا تو صف سے نکل کر امام کو چھونے لگا - تو اگر لوگ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح چُپ رہیں یا موسیٰ علیہ السّلام کی طرح علمِ خدا پر حوالہ کریں تو پھر ہماری ہندوؤں کی - ہماری عیسائیوں کی - ہم میں سُنّی شیعوں کی - مقلّدوں غیر مقلّدوں کی دو الین ذو الّین کی لڑائیاں کیا - اگر کوئی جنت میں جانا چاہتا ہی تو چشم ما روشن دل ماشاد - وہ کوئی دنیا کا سا مکان تو ہی نہیں کہ بہت آدمی جمع ہوں گے تو جگہ گھر جائے گی اُس کی وسعت تو عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (اُس کا پھیلاؤ ہی آسمان و زمین سے ظاہر ہوتی ہی) اور اگر کوئی جہنّم کی طیاری کر رہا ہی تو اُس کی خوشی آخر جہنّم بے چاری بھی تو هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (کیا کچھ اور بھی ہی) پڑی پکار رہی ہی - اُس کی فریاد بھی تو کسی کو سُننی چاہیئے - لیکن لوگوں کا حال یہ ہی کہ وہ اپنے فرائض تو پورے پورے ادا کر چکے آدمی خالی بیٹھا کیا کرے چلے خدا کا ہاتھ بٹوانے ؏ تو کارِ زمین را نکو ساختی ؛ کہ با آسمان نیز پرداختی ؛ بات یہ ہی کہ انسان ایسا مخلوقِ خود غرض ہی کہ اگر اُس کی حاجتیں خدا سے متعلّق نہ ہوں تو یہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہ کرے کہ وہ ہی کون اور کہاں رہتا ہی - ہم جیسی نمازیں پڑھتے ہیں اگر واقع میں پڑھتے بھی ہوں تو انصاف کی بات یہ ہی کہ نہ پڑھنے سے بدتر ہی کیونکہ حکم کا نہ بجالانا نافرمانی ہی لیکن اُس کو بُری بھونڈی طرح پر - بے دلی - بے توجّہی - بے پروائی سے بجالانا بے ادبی اور گستاخی - جو بعض صورتوں میں نافرمانی سے زیادہ ناگوار ہوتی ہی - حدیث شریف میں آیا ہی کہ نماز جو بے حضورِ قلب ادا کی جائے وہ اُلٹی پڑھنے والے کے موںھ پر مار دی جاتی ہی - وہی دوسرے کے مافی الضمیر کے جاننے کی مشکل ہی لیکن مَیں اپنے اُوپر قیاس کر کے کہتا ہوں کہ اگر لوگ ایسی ہی نمازیں پڑھتے ہیں جیسی میں ساری عمر پڑھتا رہا ہوں تو افسوس اِس نماز پر - افسوس اِس کے پڑھنے پر!! افسوس اس کی مقبولیت کی اُمید پر!! - افسوس اِس کے صلے کی توقع پر!!! - یہ نماز اِس سے زیادہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی جیسے کسی سکول کا لڑکا سکول کے وقت میں حاضر ہوتا اور پڑھتا لکھتا خاک نہیں - کیا صرف حاضر رہنے سے وہ امتحان پاس کرلے گا -؟ ہرگز نہیں"

غرض مولنا ابتدا میں نماز کے بعد اکثر مشہور دعائیں جو رسالوں کی صورت میں چھپ گئی ہیں پڑھا کرتے تھے - مگر اب وہ سب دعائیں چھوڑ دی ہیں - حاجت پڑے پر اب صرف قرآنی دعائیں پڑھا کرتے ہیں - نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کرتے ہیں - جماعت کی چنداں قید نہیں - ہاں مغرب کی نماز باہر جماعت سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ آپ کے باہر رہنے کا وقت ہی - جس زمانے میں پنشن لے کر آئے تھے

اُس وقت پنج وقتی نماز اکثر مسجد میں پڑھا کرتے تھے مگر اب کہیں نہیں جاتے اور یہی حالت جمعہ اور عیدین کی نماز کی ہے۔ شاید ہی عیدگاہ میں جا کر کبھی نماز پڑھی ہو گھر میں پڑھتے ہوں تو خبر نہیں۔ نہیں معلوم وہ ایسا کیوں کرتے ہیں بالا خانے کے صحن کے ایک گوشے میں ذرا سا چبوترہ بطور مسجد کے بنا رکھا ہے وہیں اکثر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو مولٰنا علاوہ آسمانی کتاب ہونے کے علم ادب کی اعلیٰ درجے کی کتاب کے خیال سے بھی مزے لے لے کر پڑھا کرتے ہیں۔ جب تک وہ حافظ نہیں ہوئے تھے جُملے کے جُملے۔ آیتوں کی آیتیں اور رکوع کے رکوع اُن کو ازبر تھے جب حفظ کرنے کا ارادہ کیا تو بالالتزام حرف حرف پڑھا تھا۔ لیکن اَب کبھی کسی وقت اِس التزام سے پڑھتے نہیں دیکھا ہاں حافظوں کی طرح اُن کا بھی ایک قرآن (حمائل) ہے جس میں اُنھوں نے قرآن مجید یاد کیا ہے جب کبھی کسی آیت کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اُسی میں دیکھتے ہیں۔

ابتدا میں کلام مجید مع تفسیر بالاستیعاب پڑھا کرتے تھے بلکہ ایک قرآن ایسا بھی موجود ہے جس کے زیرِ متن اُنھوں نے اپنے قلمِ خاص سے جابجا عربی زبان میں تفسیر کے قسم کے نوٹ لکھے تھے۔ اِسی قرآن مجید پر مولٰنا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب کے نوٹ لکھے ہوئے موجود ہیں +

روزوں کی یہ حالت ہے کہ سِن کہولت کی وجہ سے دو چار یا دو ایک رکھ لیئے تو رکھ لیئے ورنہ یہ بھی نہیں یہ سب عمر کا تقاضا ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اب وہ معمولی غذا گوشت روٹی بھی بخوبی ہضم نہیں کر سکتے اِس قسم کی غذا تقریبًا چھوٹ گئی ہے دُودھ سے پیٹ بھر لیا کرتے ہیں۔ شاید دن بھر میں ایک آدھ پھُلکا کھا لیتے ہوں تو کھا لیتے ہوں ورنہ صرف دودھ پر اکتفا کرتے ہیں بھلا ایسا شخص کیا روزے رکھ سکتا ہے۔ ان کا سن نہیں کہ وہ تکلیف مالایطاق اُٹھائیں۔ تاہم روزے کے بارے میں جو کچھ مولٰنا کی رائے ہے وہ مختصر طور پر یہ ہے کہ "روزے سے مزاج میں عجز و انکساری کی صفت پیدا ہوتی ہے اور روزہ دار کو روزی کی قدر آتی ہے اِس کے علاوہ روزہ جسمانی تندرستی کے لیئے بھی مفید ہے کہ اُس سے ردی رطوبتیں جو اکثر مولدِ مرض ہوتی ہیں خشک ہو جاتی ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ روزہ دار اُن مصیبت مندوں کی مصیبت کا اندازہ کر سکتا ہے جن کو پیٹ بھر کر روزی میسّر نہیں آتی اور جب دوسروں کی مصیبت کا اندازہ کرے گا تو اُس کی طبیعت میں اُن کی امداد کا بھی تقاضا ضرور پیدا ہوگا۔ اور لوگ روزوں کے دنوں میں توسیعِ رزق بھی کرتے ہیں اِس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ روزوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شب کو لوگ تراویح میں قرآن پڑھتے ہیں اور اس سے لوگوں کو قرآن کے حفظ کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس ذریعے سے خدا اپنا وعدہ ایفا کرتا ہے جو اُس نے قرآن کے محفوظ رکھنے کی بابت کیا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ روزے کو عبادات میں داخل کرنے سے شارع کی غرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چست و چالاک اور صابر و ضابط قوم بنائے نہ بندۂ شکم اور حریص و طامع کہ تھوڑی دیر بھی بھُوک اور پیاس کے ضبط کرنے پر قادر نہ ہوں"

میلے ٹھیلے ناچ رنگ کا شوق میلے ٹھیلے ناچ رنگ کا شوق مولٰنا کو کبھی نہیں رہا۔ البتہ گورنمنٹ کی ملازمت کے زمانے میں بعض اَوقات کبھی کبھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ وہ ناچ رنگ میں شریک ہو گئے ہیں خاص کر گورکھپور کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں لیکن اپنے ذاتی شوق سے کبھی اس قسم کی محفلیں گرم نہیں کیں۔ تاہم سماع کے دل سے شائق

ہیں۔ مولانا کے لکچروں سے پایا جاتا ہے کہ اس قسم کی مجلسوں میں اکثر شریک ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا سماع کے نہ صرف دل سے شائق ہیں بلکہ وہ از روئے شرع شریف اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ "خدا نے انسان کی روح کو رنگ اور بو اور ذائقے اور آواز اور لمس سے متلذذ ہونے کی صلاحیت دی ہے اور حواس خمسۂ ظاہری ان لذتوں کے حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ ضرورت کے اعتبار سے یہ لذتیں مختلف مدارج کی ہیں یہاں تک کہ بعض شرط زندگی ہیں اور بعض شرط عافیت کیا خوب کہا ہے ؎

دیدہ شکیبد ز تماشائے باغ | بے گل و نسرین بسر آرد دماغ
گر نبود بالش آگندہ پر | خواب تواں کرد حجر زیر سر
ور نہ بود دلبر ہم خوابہ پیش | دست تواں کرد در آغوش خویش
ایں شکم بے ہنر پیچ پیچ | صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

اسلامی شریعت کی تعلیم اس اصل پر مبنی ہے کہ انسان کی فطری قوتوں کے تمام سر چشمے جاری رہیں مگر اعتدال کے ساتھ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ[۵۱] کا یہی مطلب ہے۔ خدا نے یہ قوتیں ضرور کسی مصلحت سے انسان کو عطا فرمائی ہیں فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُو عَنِ الْحِكْمَةِ[۵۲]۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[۵۳] پس ان میں سے کسی قوت کا معدوم کرنا ضرور خلاف مرضی خداوندی ہے مگر ان کا حد اعتدال میں رکھنا بھی کارے دارد۔ پھر یہ لذتیں جو حواس خمسہ کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہیں۔ فانی اور عارضی ہونے کے علاوہ ادنیٰ درجے کی لذتیں ہیں اور ان نعمتوں میں ذلیل ترین حیوانات بھی مشارک انسان ہیں۔ بلکہ بعض صفتوں میں شریک غالب۔ ان جسمانی لذتوں کے علاوہ جن کو ہم کبھی نعمت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی قوت سے عقلی اور دماغی اور روحانی اعلیٰ درجے کی قوتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ سب سے برتر سب میں برگزیدہ ان تمام اعلیٰ درجے کی مجموعی قوتوں کا نام ہے قوت علم ؎

ازل سے جو علمی شرافت ملی ہے | اسی سے الٰہی خلافت ملی ہے

ان ادنیٰ اور اعلیٰ درجے کی قوتوں میں ایک خاص طرح کا تعلق ہے کہ ادنیٰ درجے کی قوتیں معتدل حالت میں ہوں تو اعلیٰ درجے کی قوتوں کی تقویت کرتی ہیں ورنہ اُن کے حق میں مرض مہلک کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات لحاظ کے قابل اور ہے کہ جن کو اعلیٰ درجے کی قوتوں کی چاٹ لگی ہوتی ہے ادنیٰ درجے کی لذتیں اُن کو مزے کی معلوم نہیں ہوا کرتیں۔ ایک سچ مچ کا بہادر دشمن پر فتح پانے سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا درگزر سے وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ[۵۴] ع در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست"۔ ایک بخیل کو جمع مال سے جو مسرت ہوتی ہے تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا[۵۵] وہ اُس مسرت کے مقابلے میں ہیچ ہے جو ایک سخی کو خرچ کرنے سے ہوتی ہے ؎

---

۵۱ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے ۱۲ ۵۲ حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ۱۲ ۵۳ اے ہمارے پروردگار تو نے اس (کارخانۂ عالم) کو بے فائدہ (تو) نہیں بنایا ۱۲ ۵۴ اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں ۱۲ ۵۵ تم (مال کے ایسے حریص ہو کہ) مُردوں تک کا ترکہ سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو (اور تم کو عبرت نہیں ہوتی) اور مال کو بہت عزیز رکھتے ہو ۱۲۔

غنچہ خنداں نہ ہو کیوں۔ کر کے زر اپنا بر باد کہ اُڑانے ہی میں ہیں دولت کے ہیں دولت کے مزے
سجدے میں پائے خُمِ مَے ہو ہی کس لطف سے مست یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اسی پر تمام لذتوں کو قیاس کر لو۔ غرض انسانی قوتیں دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ادنیٰ جسمانی۔ اعلیٰ روحانی۔ جسمانی اور روحانی قوتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ موافقت اور مخالفت کے دونوں پہلو ہیں۔ مگر ایک گروہ کی قوتیں آپس میں متحد اور ایک دوسرے کی مدد کے لیئے مستعد رہتی ہیں۔ اندھوں کی قوتِ سامعہ اور لامسہ عدم البصر کی تلافی کرتی ہے اور بسا اوقات سامعہ باصرہ کا کام دیتی ہے؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یہ مضمون بہت طول چاہتا ہے مگر ہم کو اِس جگہ صرف قوتِ سامعہ پر بحث کرنی ہے۔ تو حواسِ خمسہ کی قوتوں میں ہم کو باصرہ اور سامعہ دو قوتیں خطرناک معلوم ہوتی ہیں باصرہ اِس لیئے کہ اس کا بُرا استعمال منجر ہوتا ہے بدکاری کی طرف اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ[۵۱] اور اسی لیئے مسلمان مردوں کو حکم ہے یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ[۵۲] اور مسلمان عورتوں کو یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ[۵۳] سامعہ اس لیئے کہ وہ باصرہ کی قائم مقامی کرتا ہے۔ بلکہ باصرہ کے عمل کے لیئے تو مواجہہ بھی شرط ہے سامعہ ہندوستان بیٹھے سمندر پار تک کی خبر لیتا ہے۔ ایک امیر کی نسبت پچھلے دنوں سنا گیا تھا کہ اُس نے سرکیشیا کی عورتوں کے حُسن وجمال کی تعریف سُن کر ایک مصاحبِ قرم ساق کو سرکیشیا کی لڑکیاں جتنی بھی ملیں لانے کو بہت سا کچھ دے دلا کر روانہ کیا مگر وہ وہیں کا ہو رہا ؂

وصف اُس پری رُخ کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر۔ تھا جو راز داں اپنا

شارع اسلام نے باصرہ پر تو غضِ بصر کا پہرہ بٹھایا۔ سامعہ کو نغمہ و سرود کے استماع کی ممانعت کی۔ اس میں شک نہیں کہ راگ ہر ایک طرح کے جذبے کو ہیجان میں لانے والا ہے جیسے خوشی کے ویسے رنج کے۔ جیسے حیوانی ویسے روحانی اور یہ بھی مشاہدات اور بدیہیات میں سے ہے کہ آدمی تو آدمی جانور تک راگ سے فطرۃً متاثر ہوتے ہیں۔ شراب کو سنتے ہیں کہ نشے کی حالت میں عقل تو زائل ہو جاتی ہے۔ بیہوشی میں طبیعت کے اصلی جوہر اضطراراً کھل پڑتے ہیں اسد اللہ خاں غالب ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ بڑے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ مدمن الخمر۔ ہمہ وقت نشے میں چور رہتے۔ ان کے چوٹی کے اشعار وہ ہوتے تھے جو نشے کی حالت میں کہا کرتے تھے۔ یہی حال ایک جج کا سُنا گیا بلکہ دیکھا ہے۔ جس کے فیصلوں کی ولایت تک دھوم تھی۔ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہوتا تو اُس کے فیصلے کو سرور کے وقت کے لیئے اٹھا رکھتے اور جو لکھتے دوسرے اُس کو سند گردانتے اور اُس سے استشہاد کرتے۔ چوں کہ لوگوں کے خیالات مختلف طرح کے ہیں یہی راگ بعض کے حق میں خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ[۵۴] کا موجب ثابت ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ کی سلطنتیں ان ہی

[۵۱] آنکھیں زنا کا باعث ہوتی ہیں ۱۲ [۵۲] اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۱۲۔
[۵۳] اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۱۲۔
[۵۴] اُس نے دنیا (بھی) کھوئی اور آخرت (بھی) صریح گھاٹا یہی کہلاتا ہے ۱۲۔

خرمستیوں کی نذر ہوئیں۔ اور ابھی حال کا مذکور ہے کہ نیوں برس سال مولوی[1] محمد حسین صاحب مرحوم الٰہ آبادی حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی تقریب سے اجمیر گئے۔ قوال نے حقانی غزل گائی۔ ان پر ایک حالتِ خاص طاری ہوئی بدن میں تھرتھری چھوٹی۔ آخر قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی۔ راگ اپنی ذات سے بُری چیز نہیں سُننے والے اُس کو بُرا بنا دیتے ہیں۔ ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ۔۔۔ در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی راگ سُنا۔ اور اُن کی موجودگی میں صحابہ نے سُنا۔ اور آپ نے سماع سے منع بھی فرمایا تو اجازت اور منع دو مختلف حیثیتوں سے دونوں بجائے خود درست۔ اب ہم سے کوئی سماع کی حلت اور حرمت کو پوچھے تو ہم کہیں گے اِستفت قلبک[2]۔ للمؤلف ؎

إذا كنت أهلاً له فاستمع ۔۔۔ وإلا فدع واجتنب وامتنع[3]

مفہومِ حسن | ہم حصۂ اول حیاۃ النذیر کے عنوان "عنفوانِ شباب" میں مولٰنا کے مفہومِ حسن کے متعلق ایک اشارہ کر آئے ہیں وہاں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر موقع ہوگا تو حصۂ چہارم میں اِس کے متعلق کچھ بالتصریح لکھا جائے گا۔ غرض ہم کو یہاں دو باتیں دکھانی ہیں اول یہ کہ حُسن کیا چیز ہے دوم یہ کہ ہمارے مولٰنا کی فطرۃ میں مفہومِ حُسن کا صحیح مادّہ موجود ہے۔ اور اُس کے حسنِ استعمال کی خداداد قابلیت موجود ہے۔

اِس لئے مناسب تھا کہ مولٰنا نے اپنی تصانیف میں جابجا جو حسن کا فلسفہ بیان کیا ہے اُس کو نقل کیا جائے لیکن اِس میں طوالت کا خوف ہے۔ ناظرین نے "فسانۂ مبتلا"، "رویائے صادقہ" اور "الحقوق والفرائض حصہ سوم" میں حسن کے متعلق مولٰنا کے خیالات پڑھے ہوں گے ہمارے نزدیک ضرورت ہے کہ وہ دوبارہ پڑھے جائیں تاکہ معلومات میں تجدید ہو جائے تاہم حسنِ صورت کے متعلق چند سطری مضمون نقل کئے بغیر ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ اس عنوان کو چھوڑ دیں۔ دل یوں گوارا نہیں کرتا کہ چند متنفس کے سوا اس مضمون کو کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا یہ مضمون ہم نے مولٰنا کی ایک معرکۃ الآراء کتاب اُمہات الامہ سے لیا ہے۔ اِس مختصر مضمون میں حسن اور مفہومِ حسن دونوں چیزیں موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ "فی اکثر الاحوال تکثیرِ ازدواج کی اصلی محرک حسن پرستی ہوتی ہے اور حسن کا حال یہ ہے کہ ایک ملک کے لوگ اعضائے خاص کی شکل و صورت اور رنگ و وضع کی نسبت ایک قرارداد کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے اعضا کو حسین سمجھیں گے۔ اول تو مذاقِ حسن سب جگہ یکساں نہیں۔ انگریز کرنجی آنکھوں اور بھورے بالوں کے شیدا ہیں۔ ہم موتی چور آنکھوں اور کالے بالوں کے

---

[1] مولوی محمد حسین الٰہ آبادی بڑے صاحب دل بزرگ ہو گزرے ہیں ہمارے مولٰنا نے جس حقانی غزل کی طرف اشارہ کیا ہے اُس کا مقطع یہ ہے ؎ گفت قدوسی فقیرے درفنا و در بقا ۔۔۔ خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی ۔۔ یہ جناب قدوسی کی مشہور غزل ہے اسی مقطع کو بار بار گواتے تھے۔ اسی نے اُن کی جان لی۔ اللہ رے اثر ۱۲

[2] آپ اپنے دل سے فتویٰ لے ۱۲

[3] جب تو راگ سُننے کا اہل ہے تو سُن ورنہ اُسے چھوڑ اور کنارہ کشی کر اور باز رہ ۱۲۔

چینیوں نے ناک کو چہرے کی ہمواری میں خلل انداز سمجھ کر بچوں کی ناک پر کمانیاں چڑھا چڑھا آخر ناک کو مٹا چھوڑا۔ حبش میں کوئی ہمارے ملک کا گیہواں رنگ آدمی جا نکلے تو اُس کو مبروص سمجھ کر اُس کی چھاؤں سے دور بھاگیں۔ حبشیوں کے ہونٹوں کو تو سنا ہوگا " لب زبرینش تا پرہ بینی رسیدہ ولب زیرینش تا زنخداں فرو ہشتہ " اختلافِ مذاق پر طرہ یہ کہ ہر شخص کو اپنے مذاق کے مطابق حُسن سے یکساں طور پر ہیجان ہوتا ہے۔ حال آنکہ اعضاءِ خارجی کے حسن کو کیسا ہی ہو نفس خواہش میں کچھ بھی دخل نہیں مثلاً ہمارے شاعر ناک کی شان میں کہتے ہیں ع آتش حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر کسی کی ناک اچھی ہو تو وہ اُسی ناک والے کے کام کی ہے وہ بھی اُس صورت میں کہ اُس کی قوتِ شامہ صحیح ہو۔ نتھنوں کی راہ آمد و شد میں رکاوٹ نہ ہو۔ کسی غیر کو اُس کی ناک سے کیا تعلق۔ یہ ہے اولادِ آدم کی سمجھ ؎ برخیالِ نامِ شان و ننگ شان ÷ برخیالِ صلح شان و جنگِ شان ÷ با ایں ہمہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی کی فطرت میں جہاں اَور باتیں ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ اوائل عمر میں اُس کی طبیعت جو رنگ پکڑ لیتی ہے وہ تا بزلیست زائل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق حسن صورت کی طرف فطرۃً مائل ہوگا اور اس میلان میں اُس پر کچھ الزام نہیں۔ غایۃ ما فی الباب یہ میلان مہیج ہے اصل قوت کا۔ پس میلان کا بُرا بھلا ہونا موقوف ہے اصل قوت کے حسن یا قبیح ہونے پر اور اصل قوۃ خدا داد یعنی فطری قوت ہے کہ عمر کی ایک حدِ خاص کو پہنچ کر خود بخود ظہور کرتی ہے اور تمام خداداد اور نطری قوتیں حسَن ہیں اس واسطے کہ کسی مصلحت سے خدا نے دی ہیں [1] اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ + لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ [2]"

مولٰنا نے حسن کے متعلق یہ نہایت ہی مختصر مضمون لکھا ہے۔ اس سے بہت زیادہ اور بہت واضح اُن کتابوں میں حُسن کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جن کے نام عنوان نہا کے قریب ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں۔ غور کرنے سے حسن کی حقیقت واقعی کُھل جاتی ہے۔ یہ جنون نہیں تو کیا ہے کہ ایک ایسی بے ثبات اور جلد فنا ہونے والی صفت پر سارے جہان میں ایک فسادِ عظیم برپا ہے۔ کتابیں اُٹھا کر دیکھئے تو اِسی عارضی صفۃِ حسن کی بدولت سیکڑوں خونی ندیاں بہتی ہوئی پایئے گا۔ انسان عجیب قسم کا نادان بچّہ ہے کہ چند روزہ زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور تجربہ ہونے کے بعد بھی باز نہیں آتا۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو اس کی لت پڑ جاتی ہے اول تو اُن کی نیت کچھ ایسی ڈانواڈول ہو جاتی ہے کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور اُن کی رال ٹپکی۔ ایسے لوگ اکثر بدوضع۔ آب روباختہ۔ لوگوں کی نظروں میں سبک اور کچھ بازاری طور کے آدمی ہوتے ہیں اِن بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ تم ایسی ناپایدار چیز پر کیوں فریفتہ ہو تو کچھ جواب نہیں دیتے۔ جواب نہیں دیتے اِس لیے کہ حُسن پرستی سے ہمیشہ نفس امارہ کی تحریک ہوا کرتی ہے۔ نفسِ امّارہ کی کُھلی کھلی تائید کیوں کر کر سکتے ہیں کاش یہ لوگ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کو بھی تلاش کریں۔ مگر وہ اس کو نہیں سمجھتے کہ۔ ؎

حسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بدون ÷ جن گلوں میں بو نہیں وہ خوشنما کہنے کو ہیں

---

[1] اُس نے جو چیز بنائی خوب ہی بنائی ۱۲ [2] ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا ۱۲

جو لوگ جوانی کی سرحد سے گزر کر پیری کی سرحد میں قدم رکھتے ہیں ان کے دماغوں میں ایک خبط یہ بھی سما جاتا ہے کہ کسی صورت سے جوانی پھر عود کر آئے مگر ؎ وقت پیری شباب کی باتیں - ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں -

خیر جوانی تو کیا عود کر سکتی ہے - مگر جوانی کا رنگ و روغن باقی رکھنے کے لیئے بہت سے پوڈر اور خضاب لگاتے ہیں ؎

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی   کالا کرے گا مونہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

کاٹھی کا کساؤ قائم رکھنے کو چست لباس اور لوہے کے تاروں کے شکنجے ایجاد کیئے جاتے ہیں اور خدا معلوم کیا کیا انتظامات ہوتے ہیں کہ جوانی دیوانی قائم رہے - بالوں کے ساتھ ساتھ عمر بھی چھپائی جاتی ہے لیکن اتنا خیال نہیں آتا کہ ؎

گرفتم سال را کردی نہاں باموچہ می سازی   گرفتم موے را کردی سیہ بار و چہ می سازی

ہر ملکے وہر رسمے ایک مثل ہے اسی طرح اگر ہر ملکے وہر حسنے کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا - مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ٹلک تو الگ رہا یہاں ہر شخص کا جداگانہ مذاق ہے - ایک ہی مُلک کے انسان اپنے ہی مُلک کے مفروضہ حُسن کے طویلے میں لتیاؤ کرنے سے باز نہیں آتے - کوئی ناک پر لٹو ہے - کوئی آنکھوں کا بیمار ہے - کوئی صراحی دار گردن پر فریفتہ ہے - کوئی موٹی چور آنکھوں پر - کوئی کالی کالی زلفوں پر - کوئی کمرِ معدوم پر - کوئی غنچہ دہنی پر کوئی کسی پر کوئی کسی پر - ایک کہتا ہے کہ ؎

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد   بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی اپنی مثنوی حسن میں لکھتے ہیں:-

او حسن عجیب چیز ہے تو   پیارا ہے تو عزیز ہے تو
ہیئت کا شریک حال ہو کر   روشن ہوا تو جمال ہو کر

خارج میں جمال ساتھ تیرے   داخل میں خیال ساتھ تیرے
فطرت نے اثر دیا ہے تجھکو   نیرنگ سے بھر دیا ہے تجھکو

وہ قوت جذب تونے پائی   جس کا شیوہ ہے دل ربائی
وجدانِ صحیح پہ ترا زور   اقلیم دماغ میں ترا شور

مقناطیسی کشش ترا کھیل   دل کو سببِ تپش ترا میل
اطرافِ جہاں کو تونے گھیرا   چھایا ہے دلوں پہ رعب تیرا

قابو ترا ہوش پر خرد پر   یہ بھی زد پہ ہے وہ بھی زد پہ
مفہوم کی جاں تیری صورت   ادراک کی روح تیری مورت

آساں نہیں تیرا راز کہنا   مشکل کا لباس تونے پہنا
تحریر میں آئے تو یہ دشوار   حرفوں میں سمائے تو یہ دشوار

لازم نہیں منحصر نہیں تو   پابند ایک ہی شکل پر نہیں تو
مطلوب کا لفظ تجھ پہ حاوی   تو خوب سے وزن میں مساوی

تو ہے وہی جو کھبے نظر میں   جم جائے تصورِ بشر میں
تو ہے وہی لوٹ جس پہ دل ہو   جس لطف پہ ذہن منتقل ہو

کیا پست و بلند ہونا   ہے حسن فقط پسند ہونا
حسنِ رخ و مو ہے ایک ہی چیز   ہر شکل میں تو ہے ایک ہی چیز

وہی تجھ میں جمال تیرا   خلقت ہم میں خیال تیرا
مرغوب صبیح اس بشر کو   محبوب ملیح اس نظر کو

کالی آنکھوں کی ایک کو چوٹ   نیلی آنکھوں پہ دوسرا لوٹ
معشوق کہیں وہ حسن والے   جن کے گیسو ہیں کالے کالے

بھورے بالوں پہ کوئی شیدا   سونے کی چمک ہو جن سے پیدا
اُس کا رخ خوش نما کتابی   اُس کا رخ روشن آفتابی

اونچے قد سے وہ دل ربا ہے   چھوٹے قد سے یہ فتنہ زا ہے
تجھ سے نہ تو وہ نہ یہ ہے خالی   سب فرقِ پسند ہے خیالی

جس طول میں تو وہ طول ہے خوب   جس عرض میں تو وہ عرض مرغوب
جس آنکھ میں تو حسین وہی ہے   پیاری وہی دل نشیں وہی ہے

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ مذاقِ حُسن کا یہ مُشتے نمونہ ہی۔ لوگوں کی فطرۃ میں تو حُسن پرستی کا مادہ موجود ہی ہمارے شعرا کا خدا بھلا کرے۔ اُنھوں نے اس قسم کے شورش انگیز جذبات کو اپنے دیوانوں میں اس کثرت سے قلم بند کیا ہی کہ ہندوستان کا ہر ایک نوخیز ان خیالات کو دیکھ دیکھ کر فرہاد و مجنوں بن جاتا ہی اور کہتا ہی ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار — گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

ظرافت طبع اور برجستہ گوئی

زندہ دلی خدا کی ایک بڑی نعمت ہی۔ جس میں یہ نہیں وہ مردہ دل ہی۔ زندہ دلی کی ایک شاخ ظرافتِ طبع بھی ہی۔ ظرافت طبع میں اگر برجستگی ہو تو اُس کا کیا کہنا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا میں ظرافتِ طبع کا عنصر غالب ہی وہ باوجود اس علم وفضل و تہذیب کبھی کبھی حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کلکتہ کانفرنس میں حسب عادت لکچر سے پہلے اپنی نظم پڑھ رہے تھے اُس میں یہ شعر بھی تھے ؎

بھلا یہ بھی جینے کی کوئی ادا ہی — کہ محتاج ہی کوئی کوئی گدا ہی
کسی کو ہی مقدور اگر شاذ و نادر — نہیں ضبط کرنے پہ خواہش کے قادر
وہ مصروف ہی عیش و تن پروری میں — پڑا چین کرتا ہی بارہ دری میں
اُسے قوم کے حال کی کیا خبر ہو — کہ ڈو ڈو بجے دن کے اُس کی سحر ہو
غرض اُس کو اسباب صارف بہت ہیں — کہ خود اُس کے اپنے مصارف بہت ہیں
بلا سے گرانی ہو یا خشک سالی — کنھیا نے برسات خاصی منالی
ہر اک سمت اور جا بجا جھم گڑے ہیں — درختوں پہ ریشم کے جھولے پڑے ہیں
حسینوں کی چار و ناطرف ٹولیاں ہیں — برابر کی عمریں ہیں ہمجولیاں ہیں
ہنسی ہو رہی ہی کہیں اور کہیں قہقہے ہیں — عنادل ہیں اور باغ میں چہچہے ہیں
ہی آہوے رم خوردہ ہر رانڈ گویا — کہ چھوٹا ہوا اُن میں اک سانڈ گویا

جس وقت یہ آخری شعر مولانا نے پڑھا اور مثل سانڈ کے جھومتے ہوئے اسٹیج پر ایک چکر لگایا اور ذرا اور بھاری آواز سے دوسرے مصرع کو دُہرایا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ سماں مولانا کی شان و عظمت سے بہت بعید تھا۔ غرض مولانا میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہی۔ جس بے تکلفی سے وہ اپنی تحریر میں ظرافتیں خرچ کرتے ہیں اُسی بے تکلفی سے اُن کی تقریروں میں اُس کا جلوہ نظر آتا ہی اُن کے چند لطائف و ظرائف ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) جس زمانے میں مولانا سمت شمال (ملک دکن کا ایک صوبہ) کے صدر تعلقہ دار تھے اُن کی پیشی میں کاشی راؤ نامی ایک اہلکار رہا کرتا تھا وہ بوجہ مزاج شناسی۔ زود نویسی اور خوش فہمی کے پیش پیش تھا۔ لیکن اُسی کے ساتھ وہ واحد العین بھی تھا۔ سر سالار جنگ اول نے ایک دفعہ اثنائے ملاقات میں بر سبیل تذکرہ مولانا سے پوچھا کہ کہیئے آپ کے ڈویزن کا کام کس طرح چل رہا ہی۔ مولانا نے جواب دیا کہ سارے صوبے کا کام صرف تین آنکھوں پر چلتا ہی۔ سر سالار جنگ متحیر ہو کر پوچھنے لگے یہ کیوں کر؟ مولانا نے جواب دیا کہ دو میری آنکھیں اور ایک میرے اہلکار پیشی کی۔

(۲) مولانا کے پاس ایک بزرگ آئے اور کہا کہ مولوی دلیل الدین صاحب سے آپ میری سفارش کر دیجئے۔ مولنا نے فرمایا آپ اپنا اظہار لیاقت کیجئے تاکہ میں اندازہ تو کر لوں۔ اُنھوں نے کہا عربی جانتا ہوں۔ حافظ ہوں حاجی ہوں۔ اور صرف تحصیلداری کا خواہش مند ہوں۔ مولانا نے فوراً دوات قلم اُٹھا مولوی دلیل الدین صاحب کو رقعہ لکھ دیا کہ یہ صاحب جو اس رقعے کے ذریعے سے حاضرِ خدمت ہوتے ہیں۔ مولوی ہیں

مجھ سے بہتر آپ سے کم تر۔ حافظ ہیں آپ سے بہتر میری برابر۔ حاجی ہیں مجھ سے اور آپ سے دونوں سے بہتر۔ مدت سے امیدوار خدمتِ تحصیل داری ہیں مجھ سے اور آپ سے دونوں سے کم تر ؏

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ۔ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(۳) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آئینہ خانے (حیدرآباد میں سر سالار جنگ اول کے محل میں آئینہ خانہ ایک بڑی عمدہ عمارت تھی) ایک بڑا جلسۂ دعوت تھا۔ کسی بڑے بھاری انگریز کی دعوت تھی نواب سر سالار جنگ اول میزبان تھے اسٹیٹ کے تمام بڑے بڑے عہدہ دار بھی مدعو تھے۔ مکان کی آراستگی اور فرش و فرنیچر۔ روشنی سامانِ شاہی تھا تکلفات کا کیا پوچھنا۔ سر سالار جنگ کی ڈیوڑھی جس نے دیکھی ہے وہی اُس کی شان و شوکت کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے نواب صاحب مہمانوں سے بہ خندہ پیشانی گفت و گو فرما رہے تھے۔ مولٰنا کو یہ شاہی کارخانہ دیکھ کر ایک وجد سا ہو گیا۔ جب تخلیئے میں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو مولٰنا نے بے اختیار اس شان و عظمت کی تعریف کی اور اپنا خیال ظاہر کیا کہ ضرور آپ ایسی حالت میں مسرور رہوں گے۔ یہ سُن کر سر سالار جنگ مرحوم نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا۔ مولوی صاحب آپ کو میرا حال معلوم نہیں اور فوراً شیروانی کے بٹن کھول کر دکھلایا کہ دیکھو مجھ میں سوائے پوست و استخوان کے کچھ باقی نہیں۔ مولٰنا نے فوراً برجستہ یہ تین مصرعے علی الترتیب پڑھے ؏ آں راکہ عقل بیش غم روزگار بیش۔ ؏ جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے ؏ آناں کہ غنی تراند محتاج تراند +

(۴) سفرِ پنجاب میں مولٰنا آنریبل سر سید کے ساتھ تھے واپسی کے وقت لدھیانے میں مشن کی کوٹھی میں قیام ہوا ایک پادری صاحب نے مولٰنا سے اپنے زعم میں اسلام کے نقائص پر صحیح بحث شروع کی۔ سب سے بڑا الزام جنت کی حالت پر لگایا کہ مسلمانوں نے جنت کو بازاری عورتوں کا چکلہ بنا دیا ہے جو خداوند تعالیٰ جَلَّ وَعَلَا شانہ کی عظمت و جبروت اور تقدس کے صریح خلاف ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ وہاں ہزاروں حوریں اور غلمان ہوں اور اگر ایسا ہو تو خدا کی خدائی میں فرق آجائے۔ مولٰنا نے ہنس کر جواب دیا کہ "یہ تو خبر نہیں کہ وہاں ایسا ہو یا نہ ہو لیکن دنیا میں تو ہم ایسا ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بازاری عورتیں بھی موجود ہیں اور کیا کچھ نہیں ہے اور کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی سب چیزوں کا پیدا کرنے والا وہی ہے تاہم اُس کو سب خدا مانتے ہیں۔ کوئی اُس کی خدائی سے روگرداں نہیں ہوا۔ پس اگر وہی خدا مرنے بعد جنت میں ایسا کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دنیا میں تو وہ بااین ہمہ سب کائنات کا خدا مانا جائے اور عقبیٰ میں اگر ایسا کرے تو اُس کی شانِ الٰہی میں فرق آجائے جو خدا یہاں ہے وہی وہاں ہے" +

(۵) کسی نے سر سید کی تفسیر کے متعلق مولانا کی رائے دریافت کی تو فرمانے لگے "میرے نزدیک وہ تفسیر دیوانِ حافظ کی اُن شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چونڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے مگر میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے ہیں۔ہاں ہاں قرآن کے مُنزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور اُن معانی کو ماننا مشکل یہ وہ معنی

ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا نہ جبرئیل حامل وحی کا نہ رسولِ خدا کا نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا نہ اصحاب کا نہ تابعین کا نہ تبع تابعین کا نہ جمہور مسلمین کا۔“

(الف ۵) مولانا نے ایک مرتبہ مجمع عام میں مرحوم جنرل عظیم الدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم مدرسہ طبیہ کی اعانت و امداد کے اعتبار سے السابقون الاولون میں تھے۔ غرض اُن کی فضیلت اُنھیں کے ساتھ خاص تھی اور وہ ہماری شکرگزاری کا لائنز شیئر لے گئے جس کے وہ مستحق تھے۔ کیا مشکل ہے اُن لوگوں سے بات کرنا جو انتی بھی انگریزی نہیں جانتے جتنی کہ میں۔ اب تم کو لاؤ لائنز شیئر کے معنی سمجھاتا پھروں۔ لائنز شیئر کے معنی ہیں شیر کا شیر۔ یعنی حصہ۔ مبتدی بچوں کے پڑھنے کی انگریزی کتابیں ریڈر کہلاتی ہیں۔ اُن میں یہ مشہور حکایت چلی آتی ہے کہ ایک بار چار جانوروں نے شکار میں ساجھا کیا چاروں جانوروں میں دو تو مشہور شکاری ہیں۔ شیر اور بھیڑیا۔ لومڑی اگرچہ شکاری نہیں ہے لیکن چوں کہ شکار کی پس خوردہ خوار ہے۔ عجب نہیں اُس نے بھی ساجھا کیا ہو۔ چوتھا جانور چوں ہار بمدہ ہمیں عزیزہ است ہرگز شکاری نہیں اور مجکو صاف طور پر اُس کا نام لینے میں تامل ہے۔ کیوں کہ حسن ظن بزرگاں معلوم اُس کا نام لیتے وقت جس سے آنکھیں چار ہوں گی وُہی بُرا مانے گا کہ مجھ پر آوازا کسا۔ لیکن حکایت کو تو پورا کرنا ہے۔ چوتھے شریک کا نام لیے بدون بن نہیں پڑتی۔ تو میں اپنی آنکھیں ڈھانک کر کہتا ہوں کہ وہ چوتھا شریک تھا گدھا۔“

(۶) سرسالار جنگ ثانی نواب میر لائق علی خاں بہادر مرحوم مغفور نے مولانا سے تعلیم پائی تھی اور وہ مولانا کا بہت ادب کرتے تھے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد جب وہ مدار المہام ہوئے تو مولانا کو حکم دیا کہ آپ مجھے ہفتے میں دو مرتبہ آکر پڑھا جایا کیجیے۔ الامر فوق الادب مولانا جاتے لیکن نواب صاحب اول تو امیر اور پھر مدار المہام۔ گھنٹوں مولانا انتظار میں بیٹھے رہتے۔ اب بلاتے ہیں جب بلاتے ہیں۔ کبھی بلایا کبھی نہیں بلایا۔ کبھی عدیم الفرصتی کا عذر کر دیا۔ کبھی بلایا بھی تو گپ شپ میں وقت کاٹ دیا۔ پڑھنا پڑھانا کام کی بات ندارد۔ ایک دو دن مولانا نے صبر کیا۔ لیکن جب پیاپی یہی نوبت ہونے لگی تو مولانا نے عرض کیا ”سرکار آپ تو اب بافضال الٰہی مدار المہام ہو گئے۔ اِس سے بڑھ کر اَور کیا رتبہ ہو سکتا ہے۔ پھر اب پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ضرورت نہیں اور مجھے فرصت نہیں۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔“ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بات نواب صاحب کو ناگوار ہوئی۔ اور پھر حاشیہ برداروں نے نمک مرچ لگا کر اس بات کو جو خالی الذہن طور پر کہی گئی تھی پولیٹیکل رنگ چڑھا دیا۔

(۷) مولانا سے اور نواب محسن الملک مرحوم سے بہت بے تکلفی تھی۔ مولانا کسی وقت اور کسی موقع پر اُن سے نہیں چوکتے تھے بعض وقت ان دونوں صاحبوں کی بے تکلفی میں اَور لوگ بُرا مانتے تھے لیکن نواب محسن الملک بہادر نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ ایک روز وہیں حیدر آباد میں مولویت کا ذکر چل پڑا۔ کسی نے اُسی جلسے میں ”مولوی مہدی علی“ کہا یہ سُن کر مولانا بولے کہ اگر مہدی علی مولوی ہیں تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں ہے

(۸) جس وقت سرسالار جنگ ثانی شملے سے لوٹتے وقت علی گڑھ تشریف لے جا رہے تھے تو نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں نے تار دے کر مولانا کو دہلی سے علی گڑھ بلوایا۔ علی گڑھ تو مولانا گئے نہیں۔ غازی آباد ہی پر جا کر مل لیے۔ اسپشل پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور سرسالار جنگ مع اسٹاف کے ڈائننگ روم میں خاصہ تناول فرما

فرما رہے تھے۔ اطلاع ہوئی تو مگا بلالیا مولوی بشیر الدین احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ اول نذر دی سر سالار جنگ نے مولانا کو اپنے پاس بٹھایا اور حکم دیا کہ دو پلیٹیں اور لاؤ۔ وہ مولانا کے سامنے رکھی گئیں لیکن مولانا نے عذر کیا اور معافی چاہی۔ غرض کرسی پر مولانا بیٹھے رہے۔ سر سالار جنگ نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا کہ آپ کو پنشن ماہ بماہ پونہچتی ہی؟

مولانا۔ جی ہاں ملے چلی جاتی ہی۔ مگر جس مہینے کی مل جاتی ہی اُسی کو میں اپنی سمجھتا ہوں۔ آیندہ مہینے کی اُمید نہیں رکھتا۔

سر سالار جنگ۔ آپ ناحق حیدر آباد سے چلے آئے۔ آپ نے بہت جلدی کی۔ اب بھی آپ چلے آیئے باوا جان (سر سالار جنگِ اول) کی لائف آپ سے بہتر کون لکھے گا؟

مولانا۔ نمک خوارِ سرکار ہوں۔ مگر میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اب جس حال میں ہوں وہی میرے لئے مناسب ہی ایک مرتبہ حیدر آباد جاکر تو پنشن پر نکالا گیا۔ اب دوسری مرتبہ جاؤں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں سالار جنگ اس جواب پر متبسم ہوئے اور اس کے متعلق پھر کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

(۹) جب مولانا شروع شروع پنشن لے کر دہلی میں خانہ نشین ہوئے تو دہلی کے حکام کو اُن کے حالات اور مرتبے سے آگہی نہ تھی۔ کسی قسم کا کوئی جلسہ ہوا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے اُس جلسے میں روساء شہر کو بُلایا ایک معمولی فہرست سب کے نام کی تھی۔ مولانا کا نام بھی اُس میں کسی جگہ تھا فہرست کے مُرتب کرنے والے ایک تحصیلدار صاحب تھے اور داعی جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر۔ مولانا کو ایسی دعوت ناگوار ہوئی۔ چناں چہ فہرست کے حاشیے پر لکھ دیا۔ کہ" اگر یہ سرکاری طلبی ہی تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیئے۔ دوستانہ بلاوا ہی تو چٹھی آنی چاہیئے۔ اور یہ دو صورتیں نہیں ہیں تو آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہی۔ تو میں نہیں آسکتا۔ ڈپٹی کمشنر نے اِس ریمارک کو دیکھکر نوٹس لیا اور تحصیلدار سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہی۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ فلاں صاحب ہیں۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے کہا جب ایسا تھا تو تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا۔ اور پھر فوراً انج کی چٹھی کے ذریعہ سے مولانا کو بُلایا اور زبانی معذرت کی۔

(۱۰) مولانا غالباً ضلع جالون کے بندوبست کے کام میں مشغول تھے اور دورہ کر رہے تھے۔ رمضان کا تھا مہینا اتّفاق سے ایک دوست متشدّد فی المذہب دن کے وقت تشریف لائے اور مولانا کو حقّہ پیتے دیکھ لیا تو تعجّب کیا اور پوچھا کہ کیا آپ کا روزہ نہیں۔؟

مولانا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہی آپ دیکھتے ہی ہیں۔

دوست۔ خیر ہی کیا عذر ہی۔؟

مولانا۔ سفر!

دوست۔ دَورے کو امام ابو حنیفہ رحہ نے سفر تسلیم نہیں کیا۔

مولانا۔ کون امام ابو حنیفہ رحہ؟

دوست۔ ایں۔ آپ کیسی تجاہلِ عارفانہ کی سی باتیں کرتے ہیں اجی وہی امام ابو حنیفہ رحہ جن کے ہم سب حنفی مقلّد ہیں

مولانا:- وہ کہیں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہے تھے-؟

دوست:- لاحول ولاقوۃ الا باللہ- اُن کی شان اِس سے ارفع و اعلیٰ تھی- اُنھوں نے خدمتِ قضا تو قبول کی ہی نہیں ڈپٹی کلکٹری لعنت بھیج کیا چیز ہے-

مولانا:- امام ابو حنیفہ رح "زحمتِ کشتی نیاز مودہ بود" تو دورے کو سفر نہیں مانتے اور گورنمنٹ تین روپیہ روز بھتا دیتی ہے از برائے خدا انہیں یہ مسئلہ کسی حاکم کے گوش گزار نہ کر دیجئے گا- ورنہ ہم بے چارے ڈپٹی کلکٹروں کا بھتا مارا جائے گا-

(۱۱) مولانا فرماتے تھے کہ میرزا غلام احمد قادیانی کے بعض مُرید میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرزا قادیانی کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ سارا پنجاب اُن کا قائل ہے- میں نے کہا پنجاب کے لوگوں کی سند نہیں- اُن کی ڈھل مِل یقینی کا تو یہ حال ہے کہ اگر میں چھ مہینے وہاں پھروں اور دعویٰ بھی کوئی معمولی نہ کروں بلکہ دعوےِ خدائی تو اسی چھ مہینے کے عرصے میں میں آپ کو پچاس ہزار بندے دکھا سکتا ہوں- فرماتے تھے کہ یہ مضمون کسی نے میرزا تک پونہچا دیا- اُسی زمانے سے وہ مجھ سے بیزار رہے- اِسی طرح میرزا کی نسبت ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ مسیح موعود میرزا قادیانی کو تو کون مانتا ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر اصلی مسیح بھی اُتر آئیں تو اُن کو بھی کوئی نہ مانے-

(۱۲) مولانا فرماتے تھے کہ ایک بار دلی میں فتویٰ نکلا تھا کہ اجمیر اور کچھوچھا اور تونسہ شریف کہنا درست بھی ہے یا نہیں ایک شخص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا- میں نے تو اُس کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر مزاج شریف کہنے میں شرعاً مضایقہ ہو سکتا ہے تو بے شک اجمیر شریف میں بھی تامل ہے-

(۱۳) سر سالار جنگ اول مرحوم کے آخر زمانے میں ایک ریونیو بورڈ بنام مجلسِ مال گزاری قائم ہوا تھا- اِس بورڈ کے تین ممبر مقرر ہوئے تھے اور تینوں کی سترہ سترہ سو ماہوار تنخواہ تھی- مولوی دلیل الدین خاں صاحب جن کا خطاب اختر ام جنگ بہادر تھا صوبۂ بنگال سے جہاں وہ انسپکٹر جنرل رجسٹریشن تھے حسب سفارش سر اسٹوارٹ بیلی رزیڈنٹ بلائے گئے اور بورڈ کے ایک رکن مقرر کیے گئے دوسرے رکن منشی اکرام اللہ خاں صاحب المخاطب بہ نواب یار جنگ بہادر صدر تعلقہ دار صوبۂ گلبرگہ تھے- اور تیسرے رکن ہمارے مولانا جو صدر تعلقہ دار سمتِ شمال تھے رکن بورڈ مقرر ہوئے- مولوی دلیل الدین صاحب کو جوع البقر کا عارضہ تھا- منشی اکرام اللہ خاں صاحب شوقین مزاج تھے ہمارے مولانا کی جزرسی و کفایت شعاری مشہور تھی- چناں چہ اراکین بورڈ کی نسبت ایک روز سر سالار جنگ مرحوم نے دریافت فرمایا تو مولانا نے فرمایا کہ ہم ارکانِ ثلثہ کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا کے مصداق ہیں- *

(۱۴) حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے ہاں ایک جلسہ تھا اُس میں سر سید بھی تھے- مولانا کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے اسی اثنا میں کسی نے ان کو مولانا حالی کا تصنیف کیا ہوا ایک رقعۂ شادی دیا- مولانا نے وہ رقعۂ شادی لے لیا- اور اُس کے متعلق کچھ فرمانے لگے رنگین کاغذ تھا اور سُنہری چھپائی- سر سید نے اشارے سے پُوچھا یہ کیا ہے؟ مولانا نے ایک خاص تیور سے کہا میاں جی عیدی نہیں ہے اس فقرے پر سارا جلسہ ہنس پڑا اور سر سید کو ایک خاص قسم کی خفت ہوئی

(۱۵) دہلی دربار کے زمانے میں ایجوکیشنل کانفرنس بھی وہیں دہلی میں منعقد ہوا تھا میں بھی اُس کانفرنس میں

موجود تھا مولٰنا لکچر دے رہے تھے کہ اتنے میں کسی ریاست کے رزیڈنٹ کانفرنس میں آئے۔ نواب محسن الملک مرحوم نے رزیڈنٹ بہادر سے مولٰنا کا تعارف کرایا۔ تعارف کرتے ہوئے نواب صاحب نے مولٰنا کی طرف ہو کر کہا کہ آپ (رزیڈنٹ) عربی بھی جانتے ہیں۔ مولٰنا نے نہایت سادگی اور سوکھے مونھ سے فرمایا "جی ہاں جتنی عربی آپ جانتے ہوں گے اُتنی انگریزی میں بھی جانتا ہوں"۔ اِس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ کیا عربی جانتے ہوں گے۔

(۱۶) اسی کانفرنس میں مولٰنا لکچر دے رہے تھے کہ اتنے میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواجِ ہند کی آمد کی خبر گرم ہوئی آڈینس نے خبر سُنتے ہی مولٰنا کی طرف سے بے توجہی کی اور لگے دروازے کی طرف دیکھنے اول خبر پر کمانڈر انچیف نہ آئے تو آڈینس مولٰنا کے لکچر کی طرف پھر مخاطب ہو گئے۔ دورانِ لکچر میں پھر یہ خبر مشتہر ہوئی کہ کمانڈر انچیف صاحب وہ آئے۔ آڈینس یہ سُنکر پنڈال کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ مولٰنا نے آڈینس کا یہ حال دیکھ کر لکچر تو میز پر رکھ دیا اور فرمایا کہ "اگر وہ آتے ہیں تو بندہ جاتا ہے"۔ اس کے بعد فرمایا "وہ کیا آتے ہیں قیامت آتی ہے اپنے اپنے گھر جا کر دیکھو کہیں اسقاطِ حمل تو نہیں ہو گئے"۔ غرض اسی دوران میں لارڈ کچنر تھوڑی دیر کے لیے کانفرنس میں آئے چند منٹ بیٹھنے کے بعد کچھ تقریر کر کے بیٹھ گئے۔ لوگوں نے بہت کچھ تحسین و آفرین کی اس کے بعد وہ تشریف لے چلے ابھی اسٹیج سے نیچے نہیں اُترے تھے کہ مولٰنا نے برملا اور بلا تامل فرمایا جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اہلِ کانفرنس یہ سن کر ہنس پڑے سُنا ہے کہ لارڈ کچنر عربی بھی جانتے ہیں اُنھوں نے افریقہ میں مسلمانوں کے لیے ایک خرطوم کالج بھی قائم کیا ہے۔

(۱۷) اسی کانفرنس کے پریسیڈنٹ اِس سال ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے جس وقت مولٰنا کا لکچر ہو رہا تھا اُس وقت تک ہز ہائی نس پنڈال کانفرنس میں نہیں پونہچے تھے اثنا لکچر میں ہز ہائی نس آئے اور کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے باوجودیکہ پنڈال اتنا بڑا تھا اور ہزارہا مسلمان نبق بنق لباس میں نظر آتے تھے اُن میں ہر قسم کے خوبصورت اور صاحبِ وجاہت بھی تھے لیکن ہز ہائنس کے آتے ہی ماشاءاللہ سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے سب سے اول نواب محسن الملک بہادر کے ذریعے سے ہز ہائی نس اور مولٰنا میں تعارف ہوا۔ مولٰنا کے ہاتھ میں جو لکچر تھا وہ اُنھوں نے میز پر رکھ دیا اور بڑی متانت کے ساتھ ہز ہائی نس سے مخاطب ہو کر فرمایا ؎

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری
آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام

اِس برجستہ اور فی البدیہہ گوئی پر نہ صرف آڈینس ہی خوش ہوئے بلکہ ہز ہائی نس بھی مونھ پر رومال رکھ کر بہت دیر تک مُسکراتے رہے اور آڈینس نے تو مولٰنا سے اِس شعر کو چیرز دے دے کر چار چھ مرتبہ پڑھوایا۔

غرض ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں جن سے مولٰنا کی برجستہ گوئی اور ظرافتِ طبع ٹپکتی ہے اُن میں ذرا بھی جھینپ اور جھجک نہیں۔

کتاب خانہ اور مطالعۂ کتاب و اخبار و شوقِ تعلیم

مولٰنا کا کتاب خانہ کوئی باقاعدہ کتاب خانہ نہیں ہے میرے خیال میں مولٰنا کو لائبریری کا شوق نہیں ہے اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ فطرتاً تالیف کا ضبط و تحمل نہیں رکھتے وہ تلاشِ مضامین کے آدمی نہیں ہیں صرف اپنے خیالات سے زیادہ مدد لیتے ہیں کیوں کہ قوتِ متخیلہ بہت قوی ہے۔ مولٰنا کی کل تصنیفات میں اسی قوت کے زیادہ جلوے نظر آتے ہیں۔ بہر حال مولٰنا کے کتاب خانے میں ادب کی کتابیں غالباً زیادہ ہیں مگر لغت کی ایک، دو جلدیں ہوں گی۔ حدیث کی کتابیں بھی کچھ نظر آتی ہیں۔ کتابوں کے لیے الماریاں نہیں

یوں ہی میزوں اور تپائیوں پر رکھی ہیں اہتمام میں اہتمام صرف یہ ہے کہ جلدوں پر چولیاں چڑھی ہیں۔ تاریخ کا کچھ بہت شوق نہیں
فنِ ادب کی کتابیں کچھ اہتمام کے ساتھ جمع ہیں۔ وہ کل کتابیں جو مصر و شام یا یورپ میں اب چھپ رہی ہیں غالباً مولانا کے ہاں
نہیں ہیں یاد نہیں کس ضرورت سے مؤلفِ حیاۃ النذیر نے ایک مرتبہ مولانا کو خط لکھا تھا غالباً کسی کتاب کی ضرورت تھی اور اس نے
سنا تھا کہ ان کے کتاب خانے میں ہے۔ غرض اس کے عریضے کے جواب میں مولانا نے یہ فقرہ تحریر فرمایا تھا کہ "آپ اس بات کو
بڑے تعجب کے ساتھ سنیں گے کہ کتاب خانہ جس سے عبارت ہے وہ میرا دماغ ہے ورنہ کتاب کے نام میرے پاس ایک پرچہ بھی
محفوظ نہیں" مطالعۂ کتب اور اخبار کی وجہ سے مولانا کا کوئی وقت خالی اور بے کار نہیں جاتا۔ اکثر اوقات کتبِ عربی و انگریزی
اور اخباروں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں چوں کہ حافظہ غیر معمولی طور پر قوی ہے اکثر مضامین اور جملے کے جملے ذہن پر چڑھ جاتے
ہیں کتابوں پر وہ جا بجا مارک کر دیا کرتے ہیں بلکہ نوٹ بھی لکھ دیا کرتے ہیں۔ جو پڑھتے ہیں وہ سرسری نظر سے نہیں بلکہ ٹھہری اور
غائر نظر سے سمجھ کر۔ لیکن اسی کے ساتھ بڑی سے بڑی کتاب جب مولانا کو مزے دار معلوم ہوتی ہے تو ایک دو روز میں دیکھ لیتے
ہیں۔ عمر بھر اسی طرح کتابیں پڑھتے رہے اور اب بھی برابر پڑھا کرتے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظر او معلومات کس قدر وسیع
ہوگی۔ اور کتنی ہزار کتابیں نظر سے گزر گئی ہوں گی۔
اکتسابِ علم اور معلوماتِ تازہ و جدیدہ کا بایں پیرانہ سالی اس قدر شوق ہے کہ قیام حیدرآباد میں تلنگی زبان کی کتابیں سبقاً
سبقاً پڑھ لیں جو فی نفسہ سخت مشکل زبان ہے اور اب بھی سنسکرت کسی پنڈت سے دہلی میں پڑھا کرتے ہیں۔ غرض دل میں اکتسابِ
علم کی طرف وہی شوق ہے جو ایک جوان آدمی کو ہو سکتا ہے۔
مولانا کو تعلیم دینے کا شوق اب تک چلا جاتا ہے اوائل میں انھوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کو خود تعلیم دی۔ لڑکے کو عربی انگریزی
ریاضی سب کچھ خود ہی پڑھایا۔ گورکھپور کے قیام میں بھی تعلیم دینے کا شوق جاری رہا وہاں کے اکثر صاحبوں نے مولانا سے
تعلیم پائی ہے اور وہ سب کے سب اعلیٰ درجے کے مرتبے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شغلہ علی التسلسل جاری ہے۔ دہلی میں
خانہ نشین ہونے کے بعد اور بھی زیادہ اس طرف توجہ ہوئی۔ حاجی سراج الدین صاحب جفت فروش کے لڑکے عبدالرحمن صاحب کو اول
سے آخر تک پڑھایا۔ اور نہ صرف پڑھایا بلکہ مثل اپنی اولاد کے ان پر روپیہ صرف کیا اور صرف کر رہے ہیں اب وہ بی۔ اے ہیں اور لاہور
میں بی۔ ایل کے واسطے کوشش کر رہے تھے ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی اکثر طلبہ کو مولانا کی خدمت میں استفادہ و کسبِ علوم کے لیے
اکثر حاضر دیکھا ہے یہ طالب علم مقاماتِ حریری۔ دیوانِ متنبی۔ دیوانِ حماسہ۔ قصائدِ سبعۂ معلقہ اور ادب کی اونچی اونچی کتابیں پڑھا کرتے
ہیں۔ پرانے اور نئے فیشن دونوں قسم کے منتہی طالب علم آتے ہیں اور پڑھ کر چلے جاتے ہیں بعض ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جیسے کہ
مولانا بنجابی کٹرے کی مسجد میں تھے اور بعض کالجوں کی اعلیٰ جماعت بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ کے طلبہ۔ زیادہ تر علم ادب پڑھانے کا شوق ہے
مولانا کو دیوانِ متنبی اور دیوانِ حماسہ کے اکثر شعر اور مقاماتِ حریری کے مقامے کے مقامے ازبر ہیں۔ پڑھاتے وقت مولانا پر ایک وجد کا
سا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ جوش کی حالت میں پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور
طلبہ کو مطلب سمجھاتے جاتے ہیں مولانا کی یہ حالت قابلِ دید ہے راقم الحروف نے مولانا کی یہ حالت بچشمِ خود کئی مرتبہ دیکھی ہے۔
علاوہ اس کے مولانا پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ اے اور ایم۔ اے اور مولوی فاضل او منشی فاضل کے عربی اور فارسی کورس کے

ممتحن بھی ہیں۔

سُنا گیا ہے کہ دہلی سینٹ اسٹیفن کالج میں عربی کا پروفیسر نہ ہونے سے وہ انسٹی ٹیوشن بیٹھنے والا تھا۔ مشن کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ ایک تنخواہ دار پروفیسر رکھ سکے اور گورنمنٹ جب تک اسٹاف نہ ہو گرانٹ نہیں دے سکتی۔ مولانا کے سامنے وہاں کے پادریوں نے یہ بات پیش کی۔ مولانا نے کہا کہ یہ تو مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ میں کالج میں آکر پڑھاؤں مگر ہاں یہ کر سکتا ہوں کہ عربی جماعت کے طلبہ میرے پاس آجایا کریں تو میں پڑھا دیا کروں گا۔ چناں چہ اب ایسا ہی ہوتا ہے کہ کالج کے طلبہ روزانہ آتے ہیں اور پڑھ کر چلے جاتے ہیں مشن کے پادری مولانا کے از حد ممنون ہیں کہ انھوں نے اُن کے کالج کو اس سخت مصیبت سے بچا لیا +

اخبار پڑھنے کی حالت یہ ہے کہ ٹائمز آف انڈیا دیکھتے ہیں۔ پنجاب آبزرور بھی آتا ہے۔ اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی وکیل البشیر اور بہت سے اخبار اور رسالے آتے ہیں کسی کے خریدار نہیں ہیں لوگ مفت بھیجتے ہیں بعض پڑھ لیتے ہیں اور بعض یوں ہی بند پڑے رہتے ہیں اکثر اخبار بہ توقعِ مضمون نگاری آتے ہیں لیکن کسی اخبار یا رسالے میں مضمون نہیں لکھتے اور اخباروں کے متعلق تو مجھے کوئی رائے معلوم نہیں ہو سکی البتہ ایک روز البشیر کی نسبت میرے سامنے یہ فرمایا تھا کہ ہندو متعصب اخباروں نے چھیڑ چھیڑ کر اس کا لہجہ بہت سخت کر دیا ہے۔ مگر جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔

اور اسی طرح صدہا کتابیں بغرض ریویو آتی ہیں لیکن اُن کو اتنی فرصت کہاں کہ ایسی کتابوں کو دیکھیں اور ریویو کریں۔ ایک آدھ کو سرسری طور پر دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اگر کوئی لگ لپٹ کر اپنی کتاب پر ریویو لکھوالے تو یہ دوسری بات ہے اس بارے میں سُنا ہے کہ شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر بھی شکایت کرتے ہیں معلوم نہیں کتنے اور لوگوں کو شکایتیں ہوں گی۔ مؤلفِ حیات النذیر کا ایک جوابِ مضمون "وکیل نسواں" جب چھپا تھا تو مولانا کی خدمت میں یوں ہی بھیج دیا تھا۔ ریویو کی غرض سے نہیں بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا کا ایک کارڈ مجھے ملا جس میں تحریر فرمایا تھا کہ "وکیلِ نسواں میرے ہاتھ سے اُس وقت تک نہیں چھوٹا جب تک میں نے اُس کو اول سے آخر تک نہیں دیکھ لیا" بس اس فقرے کے آگے کچھ نہ تھا غرض میرے نزدیک لوگوں کی شکایت بے جا ہے مولانا کو حقیقت میں اس قسم کے کاموں کے لیئے ذرا بھی فرصت نہیں۔

محنت اور جفاکشی مولانا بڑے محنتی اور بڑے جفاکش ہیں طبیعت محنت و جفاکشی اور سختی اُٹھانے کی خوگر ہے بندوبست کے کام میں دورہ بہت کرنا پڑتا تھا پیدل چل کر بہت کچھ تنقیح کرتے تھے۔ زمانِ قیامِ حیدر آباد میں بھی محنت کا وہی حال تھا اپنی طبیعت پر بہت سختی اُٹھاتے ہیں کام باقی نہیں رکھتے۔ چوں کہ طبیعت محنت کی خوگر ہو گئی ہے اب خانہ نشینی کے بعد بھی خالی نہیں بیٹھ سکتے۔ درس و تدریس اور کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم ہے۔ مولانا کی سب سے بڑی اور مسلسل محنت اور جفاکشی ترجمۂ قرآن سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ مولانا نے ڈھائی برس ترجمے میں صرف کیئے ہیں مگر ایک حساب سے ڈھائی برس نہیں بلکہ پانچ برس کیونکہ رات دن اور صبح و شام بلکہ ہمہ وقت مولانا کا دماغ اسی میں صرف ہوتا رہتا تھا۔ ترجمہ استقلال سے روزانہ لکھواتے تھے لیکن تلاش و اقتباس کی زحمت اُن سے برداشت نہیں ہوتی ہے اس لیئے ایسے کام وہ بغیر کسی مددگار کے نہیں کر سکتے۔

مقدمات کی نسبت مشہور ہے کہ مسل کو اطمینان سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرے سے دیکھتے ہی نہ تھے

بعض اہم گواہوں کے بیانات سن لیے اور فیصلہ سنا دیا۔ لیکن عدالتِ ماتحت کا فیصلہ پورا دیکھ لیتے تھے وکلائے فریقین کی بحث سن کر مقدمے کی نسبت رائے قائم کر لیتے تھے۔ چوں کہ قانونی مذاق اور استخراج کا مادہ مولٰنا میں کافی طور پر موجود تھا اِس لیے فیصلے عمدہ اور صحیح ہوتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے سوا پنجاب یونی ورسٹی کی ایک محنت اور اٹھانی پڑتی ہے کہ بی۔ اے۔ ایم اے۔ کے پرچے خود سٹ کرتے ہیں اور خود ہی جانچتے ہیں اور خود ہی نمبر دیتے ہیں۔ کسی دوسرے کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں۔

ذہانت و حافظہ طبیعت کی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کچھ اوپر پانچ مہینے میں اور بالخصوص اس عمر میں حافظِ قرآن ہو گئے۔ مشکل سے مشکل کتابیں مثل دیوانِ متنبی، دیوانِ حماسہ۔ قصائدِ سبعہ معلقہ۔ مقاماتِ حریری وغیرہ کے فقرے کے فقرے اشعار کے اشعار ازبر ہیں۔ جب کسی کو پڑھاتے ہیں تو کتاب پڑھنے والے کے ہاتھ میں رہتی ہے اور خود برابر پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُقلیدس اور جبر و مقابلہ اور حساب یہ سب مشکل چیزیں ہیں اگر ان کی مزاولت نہ ہو تو دماغ سے نکل جاتی ہیں بالخصوص اُس شخص کے دماغ سے جس میں ان علوم کی صلاحیت نہ ہو لیکن مولٰنا کو سب کچھ یاد ہے۔ مولٰنا کے بشرے میں ایک خاص قسم کی ذہانت کی چمک ہے۔ آنکھیں آسمانِ ذہانت پر ستاروں کی طرح چمکتی اور گردش کرتی ہیں۔ سر کی بڑائی خود دکھاتی ہے کہ اُس میں کیسا عمدہ بھیجا ہے اور بھیجے میں کیسے عمدہ ذہنی قوٰی۔

راست بازی اور محبت راست بازی ہمارے مولٰنا کے خمیر میں داخل ہے اس لیے ہر معاملے میں عموماً راست بازی پائی جاتی ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو ضرورت سے زیادہ ہے کسی کی خوشامد، چاپلوسی، للّو پتّو سے زبان آشنا نہیں جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے اور واقع میں اُن کی زبان دل کی سچّی ترجمان ہے۔ اسی صاف گوئی کی بدولت بارہا نقصان اٹھاتے رہتے ہیں کیونکہ فی زماننا راست بازی سے بہت کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ الحق مُرٌّ ولو کان ڈِڈ۔ پولیٹیکل چال جو مہذب چال بازی ہے مولٰنا اُس کوچے سے بالکل آشنا نہیں ہیں۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ مولٰنا کا مزاج اُنس پذیر ہے مگر یہ نہیں کہ ہر ایک سے محبت جوڑ بیٹھتے ہوں۔ جس کسی سے محبت ہے دلی محبت ہے دکھاوے کی غرض سے نہیں۔ اگر بگاڑ ہے تو کھلا بگاڑ ہے کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ غرض جو کچھ ہے منھ پر ہے دل میں کینہ نہیں بغض نہیں حسد نہیں۔ جس سے محبت ہے صادق اور بے ریا۔

حب الوطن اور اہلِ وطن سے سلوک وطن کی محبت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بجنور چھوڑ مولٰنا نے دہلی اپنا وطن قرار دیا ہے دیہات کو بہت ہی بُرا جانتے ہیں۔ میاں بشیر نے ایک مرتبہ بجنور جانے کی اجازت چاہی تو اُن کو لکھ دیا سہ دہ مرو دہ مرد را احمق کند ٭ عقل را بے نور و بے رونق کند ٭ دیہاتی عموماً کم عقل ہوتے ہیں اُن کے خیالات ادنیٰ اور تاریک اس وجہ سے دیہاتیوں کو پسند نہیں کرتے اور فی الواقع شہری اور دیہاتیوں کا کیا مقابلہ۔ مولٰنا زمانِ صغر سنی سے دہلی میں رہے۔ بجنور سے کوئی تعلق باقی نہیں رکھا۔ رہنا سہنا۔ شادی بیاہ۔ مکان جائداد املاک اور تمام دنیا کے بکھیڑے دہلی ہی میں پیدا کیے ملازمت ہی کے زمانے سے دہلی میں جائداد خرید کرنی شروع کر دی تھی۔ اگرچہ بجنور میں جدّی مکان موجود تھا لیکن وہ مولٰنا کے بڑے بھائی کے قبضے میں رہا اُنھوں نے بجنور نہیں چھوڑا۔ اُن کے تعلقات زیادہ تر بجنور ہی میں تھے۔ ہمارے مولٰنا بھی اپنے بڑے بھائی کی خاطر کبھی کبھار بجنور چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن بطور مہمان۔ بھائی

کے انتقال کے بعد آج تک وہ بجنور نہیں گئے۔ غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مولنٰنا کو دیہاتی زندگی پسند نہیں اور صرف اسی وجہ سے یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اُن کو اپنے وطن سے اُنس نہیں ورنہ سلوک کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اہلِ بجنور کے ساتھ مولنٰنا نے حتی المقدور سلوک کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ نوکریاں اُن کو دلوائیں مالی امداد اُن کو دی۔ اور اسی طرح دہلی والوں کے ساتھ بھی برابر سلوک کرتے رہے۔ خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب اپنے برادر نسبتی کو جب کہ مولنٰنا اوری ضلع جالون میں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر تھے نوکر رکھوایا۔ جو بڑھتے بڑھتے نشش صدی ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ بجنور والوں میں سے منشی رفیع الدین صاحب اپنے بہنوئی کو بندوبست کا سرشتہ دار کرا دیا۔ دوسرے بہنوئی پیرجی صادق علی صاحب کو نقل نویسی اور اُجرت کے کام پر لگا دیا کہ وہ متوکل سے آدمی تھے مستقل نوکری کا اُن میں مادہ نہیں تھا۔ بندوبست کا محکمہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اُس میں اپنے شناساؤں اور متعارفین کو اکثر کھپایا۔ کیمپسن صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالکِ مغربی کے ذریعے سے اپنے بڑے بھائی کو بریلی کالج کی پروفیسری دلوائی جب کالج ٹوٹ گیا تو کوشش کر کے اُن کو سب انسپکٹر مدارس مقرر کرا دیا۔ ضمیر احمد صاحب چھوٹے بھائی کو پولیس کا سب انسپکٹر کرا دیا۔ مگر وہ لااُبالی مزاج کے آدمی تھے نوکری کے سنبھالنے کا سلیقہ اُن میں نہ تھا چھوڑ چھاڑ الگ ہو گئے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں مولوی حاجی حافظ سیّد احمد حسن صاحب اپنے بڑے داماد کو چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر اپنا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کیا اور مولوی حافظ عبد الواحد صاحب مرحوم اپنے بڑے برادر نسبتی کو دو سو کا مددگار بندوبست مقرر کیا۔ اِس کے بعد مولوی سیّد احمد حسن صاحب بڑھتے بڑھتے ضلع کے کلکٹر ہو گئے اور چار سو کی جگہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پانے لگے مولنٰنا نے اپنے چھوٹے داماد مولوی شرف الحق صاحب کو بھی مددگار بندوبست مقرر کرایا جن کو آگے چل کر برٹش گورنمنٹ نے "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ یہ صاحب اب چھ سو کے مددگار بندوبست ہیں۔ سر سالار جنگ مرحوم کے زمانے میں مولنٰنا نے اپنے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو ماصہ ماہوار کا وظیفہ کار آموزی مقرر کرایا پھر تین سو روپیہ کی سوم تعلقہ داری دلوادی یہ صاحب اب پانسو روپیہ ماہوار کے درجۂ اول کے دوم تعلقہ دار یعنی فرسٹ اسسٹنٹ کلکٹر ہیں۔ اِس طرح چھوٹی بڑی نوکریاں اپنے خاندان والوں کو دلوائیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں اپنے کنبے قبیلے کے ساتھ کچھ زیادہ محبت یا شیفتگی نہیں ہے اہلِ بجنور سے قطعی طور پر متنفر نظر آتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ اُن کی حالت از روئے علم بہت زبوں ہے۔ تعزز ولیاقت کا پتا نہیں یا یہ وجہ ہو کہ وہ لوگ ...... اپنے مطالبات سے مولنٰنا کو بہت تنگ کیا کرتے ہیں اور اپنی زار و نگوں حالت سے کسی قدر ذلت پہنچاتے ہیں۔ مولنٰنا ان لوگوں کو بُرا تو نہیں سمجھتے مگر ان لوگوں پر کیا منحصر ہے وہ اپنے کنبے قبیلے کے سوا جس مسلمان کو نالائق اور گرے ہوئے درجے میں دیکھتے ہیں اُس سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے کنبے سے اور بھی کہ ان میں شاذ و نادر ہی کوئی علم و فضل کے لحاظ سے صاحبِ عزت ہے۔

کہتے ہیں جب کوئی شخص سر برآوردہ ہو جاتا ہے تو لوگ اُسکو ہر طرح دق کیا کرتے ہیں۔ ؎ ہر کجا چشمۂ بود شیریں + مردم و مرغ و مور گرد آیند + مولنٰنا اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پانچوں اُنگلیاں بالمناسبۃ چھوٹی بڑی بنائی ہیں لیکن اگر اس میں کوئی اُنگلی فٹ بھر بڑی ہو جائے تو عذابِ جان ہو جائے۔ وہی حالت میری ہے کہ سب لوگ مجھ پر اپنے حقوق جتلاتے ہیں اور باوجودے کہ مولنٰنا علیٰ قدرِ مراتب سب سے سلوک کرتے رہتے ہیں تاہم کوئی بھی خوش

نہیں کیوں کہ وہ اپنی غلط توقّع کے مطابق نہیں پاتے نتیجہ یہ کہ ناراض رہتے ہیں۔ یہ ناراضی ایک قسم کے ناز پر بھی محمول کی جا سکتی ہے

نوکروں کے ساتھ برتاو

اگرچہ مولانا ہمیشہ اپنے خدمت گاروں سے تنگ رہے یہاں تک کہ زبانی شکایتوں سے گزر کر تحریری شکایتیں بھی ہونے لگی تھیں۔ چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "وہ میرے ساتھ وہی گور نمک ہیں اب میری تکلیفیں انتہا کو پہنچ گئیں۔ تمتعاتِ دنیوی میں بس ایک کھانا تھا اُس کا یہ حال ہے کہ کوئی ہفتہ فاقے سے خالی نہیں ع بس جی چکے بہت ہم اب کیا کریں گے جی کے"۔ ایک اَور خط میں فرماتے ہیں کہ "اس میں کچھ شک نہیں کہ من حیث القرابۃ امامی کو کچھ استحقاق نہیں لیکن استحقاقِ تعارف ہے اِنَّ المَعَارِفَ فِیْ اَھْلِ النُّھٰی ذِمَمٌ دہلی کے لوگوں سے اُس اطاعت اور وفاداری کی توقّع رکھنا جو یہاں (حیدرآباد) کے نوکر کرتے ہیں ایک توقّعِ بے جا ہے۔ خصوصاً ہرجائی وہربابی جیسے امامی اَور زیب النساء۔ کہ یہ لوگ اپنی چرب زبانی سے شکم پروری کرتے ہیں اور کسی کے پابند نہیں۔ چاپلوسی اور خوشامد سے جہاں موقع ملا کام نکال لیا اگر اُن کا یہ شیوہ پیشِ نظر رکھو تو پھر اُن کی کوئی حرکت ناگوارِ طبع نہ گزرے"۔

بہرحال مولانا اگرچہ اپنے ملازموں سے تنگ رہا کرتے تھے۔ لیکن کسی کے ساتھ کبھی دُرشتی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ بھی اِس طرح ملے جلے رہتے تھے کہ گویا ایک ہی خاندان کے ممبر ہیں۔ چناں چہ دو ملازم خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

وقتِ قیامِ جالون مولانا نے ایک سید کے لڑکے سید رمضان علی کو چھٹ پن سے نوکر رکھ لیا تھا۔ رمضان علی ایسا وفادار نکلا کہ اُس نے ساری عمر مولانا کی خدمت میں گزار دی مولانا نے اُس کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ اور آخر میں مولانا نے اُس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ سنٹرل جیل حیدرآباد کا داروغہ مقرر کرا دیا وہاں اُس کو پچاس روپے ماہوار ملتے تھے۔ اُس کا انتقال ہو گیا۔

چاند خاں نامی ضلع جالون کا باشندہ ایک اَور مولانا کا ملازم تھا۔ وہ اگرچہ پڑھ لکھ نہ سکا تاہم جان نثاری اور خیرخواہی کا مادّہ بہت تھا۔ یہ چاند خاں مولوی چاند خاں کے نام سے مشہور تھا کیوں کہ اسی نام کا ایک شخص اَور مولانا کے پاس ملازم تھا یہ بڑا لڑاکا اور تُند خو تھا بے دھڑک لوگوں سے مارپیٹ کیا کرتا تھا ان دونوں میں تفریق ہی کرنے کے لیے اُس کو مولوی چاند خاں کہتے تھے اور اِس کو خونی چاند خاں۔ بہرحال مولوی چاند خاں صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ ڈاڑھی بھی لمبی تھی اور نیک بھی تھا۔ اسی وجہ سے اِن کو مولوی کا خطاب دیا گیا تھا۔ ورنہ ؎ منزلتِ کارِ دیں گر بہ محاسن بُدے ٭ کوس لاانبت نشے کبش طویل اللحی ٭ غرض یہ مولوی چاند خاں صدرِ تعلقہ داری کے جمعدار بنا دیئے گئے زندہ تو اب تک ہیں مگر بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔

اب عمر کے ساتھ ساتھ مولانا کا غصّہ بھی بڑھ گیا ہے اور بعض ملازم بھی سرکش ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ شرارت کی وجہ سے آقا کے مزاج میں التہاب پیدا کر دیتے ہیں۔ سنا ہے کہ بعض وقت غصے کے عالم میں ملازموں کو مار بھی بیٹھتے ہیں اور جب مارنے اُٹھتے ہیں تو پھر اُنھیں کچھ ہوش نہیں رہتا کہ کس عضو پر ہاتھ پڑی جو چیز مل جاتی ہے اُس سے خبر لینی شروع کر دیتے ہیں۔ ایک نوکر کو جوتے سے اس قدر ٹھونکا کہ چندیا گنجی ہو گئی۔ نوکروں کو بعض اوقات نکال بھی دیتے ہیں لیکن خود اُس کی معذرت یا کسی کی سعی سفارش پر رکھ بھی لیتے ہیں ٭

مولانا کے مزاج میں غصہ معمول سے زیادہ ہوگیا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جتنے لوگ کھرے اور صاف ہوتے ہیں اُن میں غصہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔ غرض غصہ اپنی حدِ مقرر تو پہنچ گیا ہے لیکن مغلوب الغضب نہیں ہیں۔ غصہ بھی دیر پا نہیں ہے ادھر گرجے اُدھر برسے اِدھر اُبال آیا اُدھر بیٹھ گیا۔ دِل غبار اور کدورت اور کینہ اور بغض اور حسد سے پاک ہے۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ظاہر و باطن یکساں۔ کسی کی کوئی بات ناپسند ہوئی معاً چہرے اور طرزِ کلام سے انقباضِ خاطر ظاہر ہوگیا جب وہ بات گئی گزری ہوئی غصہ بھی ساتھ ہی فرو ہوگیا۔ کسی بات کو دل میں رکھ کر میل کا بیل بنانے کی عادت نہیں۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ مولانا کی عادت نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جس کی بات ہوتی ہے اس کے مونھ پر بلا خوف و خطر رکھ دیتے ہیں چاہے اِس میں کوئی ناراض ہو کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ نہ کسی کی خوشامد یا جھوٹی تعریف کرتے ہیں حتیٰ کہ حکام اور اپنے افسروں کے سامنے بھی وہ بے دھڑک کہہ بیٹھتے تھے۔

جود و سخا اور فراخ حوصلگی

مولانا حاتم نہیں کہ اپنی کمائی کو بے موقع اور بے محل لُٹا بیٹھیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہم اُن کو کافرِ نعمت کہتے کیونکہ نعمت کی قدر نہ کرنا عین کفرانِ نعمت ہے۔ اُن کا روپیہ تن آسانی یا رسم و رواجِ نامشروع کی پابندی یا نام و نمود اور شیخی میں خرچ نہیں ہوتا نہ وہ ایسے لوگوں کو دیتے ہیں جو نااہل ہوں جن کا کھایا پاپ نہ پُن۔ وہ اپنی ذات پر بھی عالی حوصلگی سے خرچ نہیں کرتے لیکن یہ نہیں کہ تنگی سے بسر کرتے ہوں۔ نہ پُرانے فیشن کا زرّیں لباس پہنتے ہیں نہ نئے فیشن کے سوٹ بوٹ میں رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ اُن کو مُمسک اور بخیل کہا کرتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے کا مولانا کو بُرا نہیں ماننا چاہیے اس لیے کہ اس زمانے کے لوگوں نے بخل اور اسراف کے صحیح مفہوم ہی کو آج تک نہیں سمجھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں مولانا کی جو قیمتی رائے ہے وہ ناظرین کے سمجھانے کے لیے لکھ دی جائے تاکہ ہمارا خیال بخوبی اُن کے ذہن نشین ہوجائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

"اسراف اور بخل کا ٹھیک حسا تو خدا کے ہاں چل کر ہوگا اِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ مگر کوئی شخص اپنے طور پر اپنے خرچ کا احتساب کرنا چاہے تو جانچ کا گُر یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے میں مضایقہ کرنا بخل ہے اور واضح ہو کہ عباد میں سے ایک عبد یہ خود بھی ہے۔ اِس کے نفس کے بھی حقوق ہیں وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا + كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ اول خویش بعدہ درویش۔ یہ بات ہم نے اِس سے جتائی کہ بعضے کنجوس مکھی چوس ہوتے سا تے آپ بھی تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ بھلا اِس خصلت کے آدمی دوسروں کو کیا دیں۔ اِن سے بڑھ کر وہ ہیں کہ کسی کا دینا نہ دیکھ سکیں۔ تقاضائے وقت تو یہ ہے کہ مسلمان بہ نسبت بخل کے اسراف کے بارے میں نصیحت کے زیادہ محتاج ہیں وَبَعْضُ الشَّرِّ أَهْوَنُ مِنْ بَعْضٍ مگر پھر بھی بخل ہے تو خصلت مذموم۔ تو دیکھنا چاہیئے کہ بخل طبیعت میں کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔ بخل پیدا ہوتا ہے دون ہمتی سے۔ نااُمیدی سے۔ یعنی بخیل آدمی آیندہ کی خوش حالی اور فارغ البالی کی طرف سے ناامید ہو کر

اُس کے لیئے ذخیرہ کرتا ہی اور بجائے اِس کے کہ آیندہ کے لیئے کوشش اور تدبیر کرے ہمت ہار بیٹھتا ہی حال آنکہ نقد را بہ نسیہ گزاشتن کار خردمنداں نیست ع مزن فالِ بد کاورد حالِ بد ۔ مبادا کسی کو زند فالِ بد ۔ ایک عالم اس خبط میں مبتلا ہی کہ اولاد کے لیئے اندوختہ کرتے ہیں ۔ یہ نادان دوست درحقیقت ۔۔۔۔۔۔۔ اِن کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اولاد کے لیئے بہترین ذخیرہ جو آدمی کر سکتا ہی یہ ہی کہ اولاد کو لائق بنائے ۔ اُن کو کوشش کرنا سکھائے ہم جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھتے ہیں امیروں کے خاندانوں کو پاتے ہیں کہ تباہ ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ وجہ کیا کہ دولت کا کمانا تو درکنار اولاد کو دولت کی روک تھام کا سلیقہ تک نہیں سکھایا جاتا ۔"

اِس مضمون کو سمجھنے کے بعد اب اِس امر کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ مولنٰا کو جو لوگوں نے بدنام کر رکھا ہی تو اُن کا بدنام کرنا کہاں تک صحیح ہی ۔ مولنٰا اپنی آل اولاد اور کنبے والوں سے فراخ حوصلگی کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتے رہے ایک طرف وہ کنجوس مشہور ہیں یعنی بیہودہ اور لغو رسوم میں روپیہ برباد نہیں کرتے دوسری طرف اُن کے جود و سخا اور فراخ حوصلگی اور سلوک کی یہ حالت ہی کہ ہزارہا روپیہ اُنھوں نے علی گڑھ کالج اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں باوقاتِ مختلف بطور چندہ دے دیا ۔ یعنی اپنی پونجی کے مطابق وہ رفاہِ عام اور قومی کاموں میں فراخ حوصلہ ہیں جس کو ضرورت مند دیکھتے ہیں ظاہر اور پوشیدہ دونوں طرح کی مدد سے دریغ نہیں کرتے مگر پیٹ بھروں کو اور جن کو ضرورت نہیں ہی محض نمایش اور اُن کے خوش کرنے کو البتہ نہیں دیتے ۔ خواہ اس میں کوئی حاکم ہو یا اپنا کوئی عزیز قریب ہو یا دوست ہو یا کوئی ہو ۔

اپنی والدہ ۔ بھائی ۔ بہنوں ۔ بیٹے بیٹیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا ۔ نہ اتنا دیا کہ وہ لوگ احدی ہو کر بے فکر ہو جائیں نہ ایسا ہاتھ کھینچا کہ اُن کو ضرورت ہو اور وہ تکلیف اُٹھائیں بہرحال جس کو جیسی ضرورت ہوئی اُس کی کاربراری ضرور کر دی مگر چادر سے کبھی پاؤں باہر نہیں نکالے اور اس طرح کنبے قبیلے اور دوست احباب میں سے کوئی فردِ بشر اُن کے فیضِ کرم اور مالی امداد سے محروم نہیں رہا قومی ہمدردی کی مثالیں اُوپر لکھی جا چکی ہیں کنبے قبیلے کی مثالیں اَور سُنیئے ۔

مولنٰا کی چھوٹی لڑکی یعنی خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ جب وہ حیدرآباد میں تھیں تو اُن کے زیور کا صندوقچہ کا صندوقچہ جس میں سات آٹھ ہزار روپیہ کا زیور تھا چوری گیا ۔ مولنٰا اپنی بیٹی کو اس صدمے سے مغموم نہ دیکھ سکے اور اُن کا کل زیور بنوا دیا ۔ اِنھیں مولوی شرف الحق صاحب کے دونوں لڑکے بغرضِ حصولِ تعلیم ڈاکٹری ولایت چلے گئے اِن میں اتنا سکت کہاں دھرا تھا کہ دونوں لڑکوں کی تعلیم کا خرچ دے سکیں ۔ مولنٰا اُن کی عسرت دیکھ نہ سکے اور ایک لڑکے کی تعلیم کا کل بار اپنے ذمّے لے لیا ۔ اِسی طرح متعدد مواقع پر بہت کشادہ دلی سے مدد کی ہی جو ممسک سے محال ہی ۔ ممسک کی صحیح تعریف یہ ہی کہ "نہ خود خورد نہ بکس دہد ۔ گندہ کند بہ سگ دہد" مولنٰا کا شمار عقلمند منتظمین میں ہی جن کا اُصول ہی "چیزے بخور چیزے بدہ ۔ چیزے بنہ" نہ مالِ مفت دلِ بے رحم ۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت ۔

بہرکیف مولنٰا میں انتظام ہی تو موقع کا انتظام ہی ۔ دل کھول کر بھی بعض اوقات وہ صرف کرتے ہیں ۔ مگر شادی بیاہ کی فضول رسموں میں روپیہ لٹانا اُنھیں پسند نہیں اور ظاہری ٹیم ٹام اور نام پر مرنے والے ایسے موقعوں پر مولنٰا کو کنجوس کہتے ہیں ۔ مولنٰا نے جب اپنی بیٹیوں کی شادی کی تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اُنھوں نے کاٹ کباڑا اور فضول چیز پر روپیہ

نہیں لگا یا نہ اُنھوں نے بے ضرورت برتن دیئے نہ سینکڑوں جوڑے بلکہ اس کی جگہ نقد روپیہ دیا۔ زیور دیا۔ جایداد دی۔ اور یہ ایسا مستقل سلوک ہے کہ اُس کی آمدنی سے آج تک اُن کی لڑکیاں فائدہ اُٹھارہی ہیں۔ لیکن مولنا کے سمدھیانے والے سُنا ہے کہ ابھی تک مولنا کے اس سلوک سے خوش نہیں ہیں۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ کاٹ کباڑ کیوں نہیں دیا بھاری بھر کم جہیز کیوں نہیں دیا اور اسی وجہ سے اُنھوں نے یہ پھبتی اُڑائی کہ "ڈپٹی صاحب کے دل میں پل بند ہو گیا۔" مگر اُن کے نا عاقبت اندیش سمدھیانے والوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اُن کی لڑکیاں بجائے خود جواہر پارے ہیں۔ ان کے قدم سے گھر منور ہو گیا اب کوئی اُن سے پوچھے کہ یہ جواہر پارے اچھے ہیں یا وہ کاٹ کباڑ۔ لڑکیوں کے لئے سلیقہ شعاری سے بڑھ کر اور کیا جہیز ہو سکتا ہے۔

اِسی طرح نواسیوں کے بیاہ برات میں بھی اِنھوں نے وقت پر تو دمڑی نہ دی جس کی وجہ سے ساری برادری میں نکو بنے۔ اُنگلیاں اُٹھوائیں۔ لیکن آگے چل کر دو دو تین تین ہزار روپیہ ہر نواسی کو چپکے سے نقد دیا اور اسی طرح ہمیشہ مدد کرتے رہتے ہیں۔ کبھی زیور بنوا دیتے ہیں کبھی ہلکے گہنے کو بھاری کرا دیتے ہیں۔ مولنا کو اس بات کی کچھ پروا نہیں کہ کوئی کیا کہے گا وہ جب مدد کا موقع دیکھتے ہیں تو ضرور مدد کرتے ہیں اور اچھی مدد کرتے ہیں۔ ؎

مسرف نہ بنیں اپنے حق میں کانٹے بوئیں | نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل ہے لوگ اُن کے نہیں بہتر ہے | اِس سے کہ فضولیوں سے اُن کی روئیں
بر احوالِ آں کس بباید گریست | کہ دخلش بود نوزدہ خرج بیست

مادۂ انتقام بظاہر لوگوں کو معلوم ہوتا ہو گا کہ مولنا میں انتقام کا خیال قوی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اُن کا سینہ کدورت کے کینے سے پاک ہے انتقام کا خیال اُن کے دل میں مطلق نہیں لوگوں کو غالباً مولنا کے اُس غصہ آمیز ارشاد سے دھوکا ہوا ہو گا جو اُنھوں نے ایک مرتبہ لاہور کے کسی لکچر میں فرمایا تھا۔ کہ

"یہی (لاہور) وہ جگہ ہے جہاں میں توحید کے بارے میں ہر سال کچھ نہ کچھ کہہ جاتا ہوں اور یہی وہ مضمون ہے جس کے صلے میں تمھارے اِسی شہر سے مجکو "نیچری بھانڈ" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ یاد ہے یا نہیں۔ وقت نہیں ہے۔ ورنہ اُسی مضمون کو میں اور شدّ و مدّ کے ساتھ پھر بیان کرتا۔ اور پھر تم سے کوئی اَور پھڑکتا ہوا سا خطاب لیتا۔ اور عدالت میں مقدمہ دائر کر کے اُس کی رجسٹری کراتا۔ میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں اور جب تک مقدّمہ دائر کرنے کے لئے میری جیب میں پیسے ہیں نہیں بلکہ جب تک زندہ ہوں کہا کروں گا کہ ہم مسلمانوں کی ہم نبی موحّد کا کلمہ بھرنے والوں کی توحید بھی ویسی ہی ہے اور اُسی کے قریب قریب منزّل ہے جیسی اہل کتاب کی اور جیسی اُن لوگوں کی جن کو ہم مشرک اور بُت پرست بتاتے ہیں"

یا مثلاً اسی طرح ایک اَور مقام پر فرمایا ہے۔

"بات یہ ہے کہ کانفرنس میں آنے اور بات کرنے کو بھی طبیعت مضایقہ کرتی ہے کیا فائدہ ہے بیہودہ بکواس کرنے سے جب کہ شروع سے آج تک کسی ریزولیشن کی پوری پوری تعمیل نہیں ہوئی۔ مسلمان کسی صلاح پر کاربند نہیں ہوئے ورنہ میرے دل میں تھا کہ زیادہ نہیں تو اخباروں کے بارے میں میں بھی ایک ریزولیشن پیش کرتا کہ یہ تعلیمی کانفرنس ہے

اور اخبار بھی تعلیم کا ایک قوی ذریعہ ہے تو کیوں کانفرنس اُن کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اخباروں کی جیسی ردّی حالت ہے وہ ظاہر و آشکارا ہے اور میں نے اِس کے شواہد بھی جمع کیے تھے مگر ان دنوں میرے پاس فنڈ کی کوتاہی ہے۔ شواہد پیش کروں تو اخبار والے ضرور گالیاں دیں جیسی اُن کی عادت ہے اور گالیاں دیں تو میں ضرور انتقام لوں جیسی میری طبیعت ہے"۔

لیکن مولانا کے یہ سب مقولے برائے گفت ہیں ایک بھی ان میں برائے کرد نہیں۔ ؎ کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن ٭ آئینِ ماست سینہ چو آئینہ داشتن ٭ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ کبھی کبھی غصہ بھڑک اٹھتا ہے وہ بھی ناحق اور ناروا باتوں پر مگر اس قسم کے غصے کا سلسلہ دیرپا نہیں ہے۔ فوراً عفو و درگزر آگے بڑھ کر غصے کی آگ پر پانی ڈال دیتا ہے۔ اور غصہ فوراً ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ اور یہ جو ایک مرتبہ منشی محرم علی صاحب[1] چشتی سے مقدمہ چھڑ گیا حقیقت میں یہ کوئی انتقام نہ تھا۔ بلکہ لوگوں کی درشتی بدزبانی اور اذیتِ ناحق کا سدِ باب تھا۔ اگر فی الواقع یہ انتقام ہوتا تو مولانا دس ہزار روپیہ خرچ کر کے اور تکلیف مالا یطاق برداشت کر کے دو ایک دوستوں[2] کے کہنے سننے سے منشی صاحب کو معافی نہ دیتے۔ منشی محرم علی صاحب چشتی نے اپنے معافی نامے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ ہمارے دعوے کا بیّن ثبوت ہے اور اسی وجہ سے ہم اُس کو بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں۔٭

معافی نامہ

میں محرم علی چشتی نہایت عاجزانہ طور پر سچے دل سے مولوی نذیر احمد صاحب سے معافی کا ملتجی ہوں۔ مجھے نہایت ہی رنج ہے کہ میں نے اپنی تحریرات میں اُن کی نسبت متعدد سخت الفاظ اور بلا موقع اور نا ملائم اور بے جا فقرے اور گالیاں لکھیں جس کی وجہ سے اُن کو رنج اور تکلیف ہوئی۔ اِن سب کی تلافی جو کچھ مجھ سے ممکن ہے میں سچے دل سے اور نہایت انکسار سے بذریعہ اس تحریر کے کرتا ہوں اور یقین واثق دلاتا ہوں کہ آیندہ کسی قسم کی بے جا تحریر اُن کی نسبت شائع نہ کروں گا اور نیز صفحۂ اول **رفیق ہند** میں اِس تحریر کو چھاپنے کے علاوہ اخبارات پنجاب میں جن کی تفصیل ۱۹ ؍ اپریل ۱۸۹۳ء کے رفیق ہند میں ہے اور جنھوں نے مولوی صاحب کے برخلاف لکھا ہے ایک ایک بار معافی کو مشتہر ہونے کے لیے بھیجدوں گا۔ نیز یہ اقرار ہے کہ میری طرف سے جس قدر استغاثے مولوی صاحب پر دائر ہوئے ہیں اُن سب میں بازدعوی داخل کردوں گا۔ میں نہایت افسوس اُن بے جا دلائل اور لاطائل الفاظ کی نسبت کرتا ہوں جو میں نے اپنی تحریرات میں استعمال کیے۔ مولوی صاحب نے مقدمہ کا خرچہ معاف کر دیا ہے۔ راقم محرم علی چشتی ۱۹ ؍ جون ۱۸۹۳ء۔ مقامِ لاہور۔

دستخط انگریزی رام ناتھ مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

---

[1] منشی محرم علی صاحب چشتی اڈیٹر رفیق ہند۔ پنجاب میں ایک مشہور ادیب ہیں۔ اُن کے قلم میں بڑا زور ہے۔ لیکن افسوس بعض اوقات وہ زور بدزبانی تک پہنچ جاتا ہے ؎ گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر ٭ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی ٭ مولانا نے ایک سال لاہور میں "فطرۃ اللہ" ایک لکچر دیا تھا یہی وہ لکچر ہے جس پر منشی صاحب نے ناواجب اعتراض کرتے ہوئے مولانا کو گالیاں دینی شروع کیں۔ تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ منشی صاحب ایک بزرگ ہیں پیر پرست۔ لکچر میں چوں کہ توحید پر زیادہ زور دیا گیا ہے ان کو ناگوار ہوا۔ اور اپنے اخبار میں حرمت شکن الفاظ لکچرار کی نسبت لکھے اور مشتہر کیے۔ اِس پر مولانا نے صلاح و مشورہ کر کے اُن پر مقدمہ دائر کیا۔ آخر منشی صاحب نے جب دیکھا کہ بساط اُلٹی چاہتی ہے اور اُلٹی پھانسی گلے میں پڑنے والی ہے تو مولانا کے دوستوں کی خوشامد شروع کی تاکہ مولانا معاف کر دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۲

[2] خان بہادر برکت علی خان صاحب مرحوم اور مولانا کے دوسرے ذی وجاہت احباب درمیان میں پڑ گئے۔ مولانا تو سہارا ڈھونڈتے ہی تھے ان لوگوں کے کہنے سے منشی صاحب کا قصور معاف کر دیا ۱۲

باصافِ دل مجادلہ باخویش دشمنی است   ہر کس کشد بر آئینہ خنجر بخود کشد
سینہ صافاں را تمسخر مے کنی ہشیار باش   خندہ بر آئینہ کردن ریش خند خود بود

بہر حال اِس معافی نامے کے دیکھنے کے بعد یہ راز بالکل منکشف ہو جاتا ہے کہ اگر درحقیقت مولٰنا میں مادۂ انتقام ہے تو کہاں کی معافی اور کہاں کے خان بہادر برکت علی خاں مرحوم۔ جس شخص نے دس ہزار روپیہ اس مقدمے میں صرف کیا ہو وہ اُس سہل طریقے سے ایک سخت گستاخی کی معافی دیدے اور ایک پیسہ خرچے اور ہرجے کا نہ لے۔ پس ہمارے نزدیک مولٰنا پر یہ ایک قسم کا اتہام ہے کہ اُن میں عنصرِ انتقام زیادہ ہے۔ ہاں اتنی بات بے شک ہے کہ ناواجب ناروا اور ناحق اغراض کی برداشت بالکل نہیں۔ فوراً طبیعت میں غصے کا ایک اُبال اُٹھتا ہے اور جب سخت سُست الفاظ سے دل کا بخار نکل جاتا ہے تو بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ مولٰنا ہی کے سینہ کو سینۂ بے کینہ کہہ سکتے ہیں ہم کو سیکڑوں ایسے واقعات معلوم ہیں کہ لوگوں نے ان کو مالی نقصان پہنچائے ہیں اور اب بھی برابر پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ صرف مالی نقصان پہنچائے ہیں بلکہ درپئے آبرو بھی ہوئے ہیں۔ رفیقِ ہند کے بعد ایک اَور اخبار میں اشاعتِ ترجمۃ القرآن کے وقت مولٰنا کو کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن مولٰنا صبر و سکون کے ساتھ بیٹھے رہے اور کہتے رہے کہ ع درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست +

مولٰنا کے ملنے والوں میں ایک شخص ہیں جن کی نسبت مولٰنا کا مقولہ ہے کہ "یہ شخص مجموعۂ تعزیرات ہند کی کل دفعات کا مجموعہ ہے" یعنی یہ صاحب بڑے بدمعاش اور شراب خوار۔ اور جواری اور کیا اور کیا ہیں۔ باوجودے کہ یہ شخص مولٰنا کا ہزاروں روپیہ کھا چکا ہے مگر اب بھی مولٰنا کو دھوکا دے دے کر روپیہ لے جاتا ہے پھر نہیں معلوم مولٰنا کو کیا پٹی پڑھا دیتا ہے کہ اُن کا دل فوراً صاف ہو جاتا ہے۔ ان واقعات کے معلوم ہونے کے بعد کون شخص ہے جو مولٰنا کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ اُن میں انتقام کا عنصر غالب ہے +

حبِّ جاہ یہ تو ہم کیوں کر کہیں کہ مولٰنا میں حبِ جاہ نہیں۔ دنیا میں کوئی بندہ لبشر البیانہ ہوگا جس میں حبِ جاہ نہ ہو انسان میں حبِ جاہ کا ہونا لازمۂ انسانیت ہے اگر انسان میں یہ صفت نہ ہو تو ہم اس کو ناقص الخلقت کہیں گے۔ کون شخص چاہتا ہے کہ ہمارا رتبہ بلند نہ ہو۔ مگر ہاں بلند نظری عالی حوصلگی اور خودداری کے ساتھ حبِ جاہ ہے۔ جھوٹی خوشامد اور گھس بیٹھ سے اُنھوں نے حبِ جاہ کا کبھی خیال نہیں کیا بلکہ وہ ضرورت سے زیادہ اَلگ تھلگ رہتے ہیں۔ جب ملازم تھے تو اپنے بالادستوں سے بہت کم ملتے تھے۔ بعض نافہم ان کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ اپنی لیاقت پر گھمنڈ ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کوئی پاکیزہ خیال آدمی ذلیل طور پر کسی کی خوشامد نہیں کرے گا۔ ہر شخص کو سلف رسپکٹ کا خیال رکھنا چاہیئے مولٰنا کی زندگی پر ہم اول سے آخر تک نظر ڈالتے ہیں تو کہیں بھی ہم کو شائبہ خوشامد نہیں ملتا۔ مولٰنا نے حیدرآباد کی ملازمت کے لیے کوئی دوا دوش نہیں کی جیسی فی زمانا لوگ کیا کرتے ہیں۔ وہ خود بخود وہاں بلائے گئے اور گئے تو کس مضایقے اور خودداری کے ساتھ وہاں بھی وہ سب سے اَلگ تھلگ رہے نہ پولٹیکل سازشوں میں شریک تھے نہ اور کسی قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے تھے جب وہاں سے چلے تو کس بے پروائی سے چلے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ملازمت پر لات مار کر چلے آئے۔ شمس العلماء کھر

گھر بیٹھے بن گئے کبھی کسی کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر یا لفٹننٹ گورنر سے مل کر سفارش نہیں کرائی نہ دوڑ دوڑ کے صاحب بہادر کی کوٹھی پر گئے۔ نہ کبھی اُنھوں نے ڈالیاں نذریں گذرانیں مدتوں انھیں دہلی کے حکام نے جانا بھی نہیں کہ یہ کون ہیں نہ وہ گئے۔ نہ آپ جانتے ہیں۔ لوگوں نے پنشن لینے کے بعد بہتیرا اُبھارا کہ آپ بے کاری میں کیوں کر زندگی بسر کریں گے۔ شہر کی آنریری مجسٹریٹی کر لیجئے۔ اِس کے جواب میں فرمایا کہ میں حقیقی مجسٹریٹی چھوڑ کر بیگاری آنریری مجسٹریٹی کیا کروں گا علیٰ ہذا اڈنبرا یونیورسٹی کا خطاب ایل ایل ڈی بھی گھر بیٹھے بلا طلب مل گیا۔ مولنا نے اِس کے لئے ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ سر ولیم میور سابق لفٹننٹ گورنر جنھوں نے متعدد کتابوں پر مولنا کو انعام دیا وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے پرنسپل تھے اور مولنا کی لیاقت سے بخوبی واقف تھے اُنھیں کی تحریک پر مولنا کو یہ خطاب ملا پس مولنا میں حبّ جاہ تو ہی مگر چاپلوسی اور خوشامد نام کو نہیں ÷

دیانت داری

مولنا جب تک برٹش گورمنٹ کے سروس میں رہے ایک اعلیٰ درجے کے دیانت دار عہدہ دار مشہور تھے۔ حیدرآباد کی ریاست میں جہاں مشہور ہی کہ مُنہ برستی ہی وہاں بھی اُن کی دیانت داری کا عام طور پر شہرہ ہی اور ہم کو اچھی طرح علم ہی کہ وہاں بھی وہ جادۂ استقامت سے نہیں ڈگمگائے گو بعض لوگ اس رائے کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ دکن میں کبھی کبھار رشوت لی ہی اور اس طرح چار لاکھ روپیہ یہاں سے لے گئے۔ لوگوں نے ایک یہ بھی غلط روایت مشہور کر رکھی ہی کہ حیدرآباد میں اپنے ایک دوست سے وہ کہتے تھے کہ بھئی میری رشوت خواری کی نسبت لوگ بہت کچھ کہتے ہیں مگر اُس کی حقیقت صرف اتنی ہی کہ پکّی عمارت میں کہیں کہیں دس بیس کچّی اینٹیں بھی لگ گئی ہیں۔ لیکن یہ سب روایتیں بے بنیاد ہیں۔ اصل یہ ہی کہ حیدرآباد کی ریاست میں دیانت کی کچھ قدر نہیں اور بد دیانتی کا بازار بہت گرم مشہور ہی حتیٰ کہ بڑے بڑے یوروپین عہدہ دار بھی لوگوں کی بدگمانی کی چھپیٹ میں آ گئے ہیں۔ وہاں کی ملازمت ایک کالک بھری کوٹھری ہی جو شخص گھسا وہ کالا ہوا اُس کو ضرور کالک لگے گی مثل مشہور ہی کہ "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" بڑے بڑے ٹکسالی دیانت دار جیسے نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین صاحب بھی لوگوں کی بدگمانیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مَا نَجَا اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ مَعًا ۔ مِنْ لِسَانِ الْوَرٰی فَکَیْفَ اَنَا

غرض لوگوں کی عجب حالت ہی کہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکتے ہیں۔ حال آنکہ حیدرآباد میں اس وقت بھی بعض ٹکسالی ایسے دیانت دار ہیں کہ جن کا جواب نہیں۔ مثلاً نواب مقتدر الدولہ بہادر صوبہ دار۔ سید سراج الحسن صاحب۔ امیر نواز جنگ بہادر صوبہ دار وغیرہ وغیرہ اسی طرح ہمارے مولنا بھی دیانت دار رہے۔ البتہ اُن کے بعض عزیزوں نے بے عنوانیاں ضرور کیں جس کی وجہ سے کچھ شک و شبہہ بعض لوگوں کو پیدا ہو گیا۔ لیکن ہم نے جہاں تک تحقیقات کی ہم کو تو یہی معلوم ہوا کہ مولنا بہت راست باز اور ہاتھ کے سچے رہے کبھی اُن کے دامانِ دیانت پر رشوت کا داغ نہیں لگا۔ اِس کھرّے مزاج کا آدمی بد دیانت ہو نہیں سکتا۔ بھلا بد دیانت شخص کہیں ایسا جری اور مُونھ پھٹ ہو سکتا ہی جو کسی کی لگی لپٹی نہ رکھے بلکہ وہ بزدل شخص ہر کس و ناکس سے دب کر ملنے والا اور خائف ہوگا ÷

جو حکّام رشوت ستانی کرتے ہیں اُن کا سلسلہ دستِ غیب چپراسیوں اور ندکوریوں تک پوہنچتا ہی۔ ایسے نالائق حاکم اپنے افسرانِ اعلیٰ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اپنے ایک دنی چپراسی سے کیونکہ وہ چپراسی سرشتی کے کرتوتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہی لیکن ہمارے مولٰنا کی کیا حالت تھی کہ نہ اُنھوں نے خود کبھی رشوت لی اور نہ اپنے ماتحت افسروں اور عملوں کو بلکہ چپراسیوں تک کو لینے دی ÷

رشوت تو بڑی چیز ہی مولٰنا تو اس بارے میں یہاں تک سخت تھے کہ ایک دن کہیں اتّفاق سے اپنے دورے کے زمانے میں اُن کو یہ معلوم ہوگیا کہ حکّام ماتحت نے اور حکّام ماتحت کے متفرق عملوں نے بطور انعام مولٰنا کے عملے کو حسب قاعدہ مروّجہ انعام میں کچھ زرِ نقد دیا ہی۔ مولٰنا کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو لینے اور دینے والوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے وہ ذیل کے ایک حکم سے معلوم ہوگا۔

برائے اطلاع تمامی عہدہ داراں وعمالِ اضلاعِ سمتِ شمالی۔

ایں صدر تعلّقہ دار بہ کمال تاسف دریافت کردہ است کہ حوالیان وخدمت گاراں کہ در دورہ ہمراہ من بودند از اکثر عہدہ داران وعمالِ مفصل بطریقِ انعام مبلغے بہ قدر مقدور ہریک گرفتہ اند ایں معنی دلیل بد دیانتی گیرندگان وضعف دہندگان ست وایں گونہ انعام نیست مگر داخلِ رشوت وہر کہ داد و دہش بے جا مضایقہ نفرماید البتہ در اخذ وجر نار واہم تامّل نہ نماید۔ آیندہ اگر امثالِ ایں واقعہ مسموع شد از گیرندہ و دہندہ ہر دو مواخذہ رشوت کردہ خواہد شد۔ ایں حکم را بتمامی ملازماں ابلاغ می باید کرد۔ سلخ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ (دستخط نذیر احمد)

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا شیریں سخنی سے شہدِ فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل بے نفاق آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

بے تعصّبی وانصاف

میرے خیال میں مولٰنا کے مزاج میں تعصب کا پتہ مطلق نہیں مولٰنا کا مقولہ ہی کہ "مذہب ایک معاملہ ہی خدا اور بندے کے درمیان۔ کسی دوسرے کو کیا حق ہی کہ اس میں دست اندازی کرے"۔ اس لیے وہ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ شیعہ۔ سنّی۔ سب سے یکساں برتاؤ کرتے رہے۔ مذہبی بے تعصّبی کا ذکر حصۂ ششم میں تفصیل سے آئے گا جہاں اُن کے مذہب پر شرح و بسط سے بحث کی جائے گی۔ یہاں دوسرے قسم کی بے تعصّبی اور انصاف کا اختصار کے ساتھ حال درج کیا جاتا ہی۔ خلاصہ یہ کہ مولٰنا کے مزاج میں رعایت مروّت اور جھوٹی تعریف نہ کبھی تھی نہ اب ہی۔ اُن کے فیصلے انصاف کا نمونہ ہیں ہٹ دھرمی یا ضد یا اپنی بات کی پچ اُن میں نام کو نہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہی کہ مولوی سلطان محی الدین صاحب تعلّقہ دار آندور جو پُرانی وضع کے بزرگ تھے اور کام میں بہت سُست تھے اِن کی نسبت سالانہ رپورٹ میں صاف لکھ دیا کہ "تعلّقہ دار اندور بدیر می گویند لیکن خوب می گویند" مولٰنا کی سفارش اور شکایت بے لوث ہوتی تھی یہ نہیں کہ کسی کی اگر ایک مرتبہ شکایت کی تو پھر سفارش سے پرہیز کیا ہو۔ چناں چہ انھیں کی سستی کام کی شکایت کی اور ان کا تنزل کرا دیا۔ چند ہی دن کے بعد پھر ان کی سفارش کی جس پر مولٰنا کے مخالفین نے اعتراض کیا اور بڑے معترض دستور رنن جی صاحب معتمد مال گزاری تھے یہ معاملہ

شدہ شدہ سر سالار جنگ کے کان تک پونہچا۔ اُنھوں نے مولٰنا سے پوچھا۔ مولٰنا نے عرض کیا کہ دونوں باتیں صحیح ہیں پہلے فی الواقع وہ ایسے ہی کاہل اور سست تھے مگر اب جو میں نے بحالتِ دورہ اُن کا کام دیکھا تو پہلے اور اب میں آسمان و زمین کا فرق پایا۔ پس صرف اس خیال سے کہ میں اُن کی شکایت کر چکا تھا اگر اُن کے کام کی واجبی تعریف نہ کروں تو انصاف کا خون کرنا ہی لہٰذا میں نے اُن کی تکمیل تنخواہ کی سفارش کر دی اور جو سفارش کی ہو وہ درست ہو۔ چنانچہ سر سالار جنگ نے اِس توجیہ کو پسند کیا اور سلطان محی الدین صاحب کی تکمیل تنخواہ کی منظوری دے دی۔

علیٰ ہذا ایک مرتبہ کا ذکر ہی کہ گر بھیم راؤ جیو صاحب اول تعلقہ دار ضلع ایلگندل نے کچھ موقّت حسابات بروقت نہ بھیجے تھے۔ مولٰنا نے نہایت سختی سے حکم دیا کہ جب تک وہ تختہ جات نہ آئیں صاحب ضلع اپنی تنخواہ نہ اُٹھائیں۔ ملکِ دکن میں جہاں رعایت اور مروت اور سفارش کی بھرمار ہو وہاں ایسی سختی سے کس کے کان آشنا تھے مولٰنا نے اس خیال سے کہ کلکٹر ضلع کی تنخواہ روک دی گئی ہی یہ بات نامناسب ہوگی کہ وہ تنخواہ نہ لیں اور میں لوں اخلاقاً خود بھی تنخواہ نہ لی۔ یا اور تعلقہ دار پر تازیانہ ہوا کہ صدر تعلّقہ دار نے میرے سبب سے خود بھی تنخواہ نہ لی۔ غرض وہ کاغذات آگئے بات رفت گزشت ہوئی۔ العرض انصاف کے سامنے وہ کسی کی رتّی بھر بھی پروا نہیں کرتے تھے۔

نواب محسن الملک بہادر مرحوم نے اپنے ایک عزیز کو مولٰنا کی مددگاری میں دیا۔ جب کہ مولٰنا بورڈ کے ممبر تھے نواب صاحب کے عزیز دائم المرض تھے اور لیاقت بھی معمولی تھی۔ مولٰنا نے کچھ دن لشتم پشتم اُن کو چلایا مگر وہ چل نہ سکے اُنھوں نے نواب محسن الملک سے شکایت کی۔ مولٰنا نے بھی صاف کہہ دیا کہ میری مددگاری میں ایسے نااہل کو کیوں دیا۔ نتیجہ اِس کا یہ ہوا کہ نواب محسن الملک بھی کبیدہ خاطر ہو گئے اور اُنھوں نے اِس کا معاوضہ یوں نکالا کہ مولوی شرف الحق صاحب اور مولوی عبد الواحد صاحب دونوں کو ایک ساتھ تخفیف میں ڈال دیا۔ اور یہی بنا بگاڑ اور حیدرآباد سے قطع تعلق کی ہوئی

اِسی طرح ایک مرتبہ مولٰنا نے ایک عہدہ دار کی نسبت لکھا "سرے دار و بے دماغ"۔ غرض جس کی جو حالت تھی بلا رو رعایت لکھ دیتے تھے اور جب کہنے پر آتے تو کوئی شخص اُن کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔

وفاداری گورنمنٹ ہمارے خیال میں مولٰنا گورنمنٹ برطانیہ کے اعلیٰ درجے کے وفادار اور خیر خواہ ہیں سلطنت انگریزی سے بہتر وہ دنیا میں کسی سلطنت کو نہیں جانتے اسلامی سلطنتوں کا مذکور تو الگ رہا وہ ولایتی سلطنتوں میں بھی کسی کو برطانیہ سلطنت کے مقابلے شمار نہیں کرتے اس سے بڑھ کر اَور کیا وفاداری ہو گی۔ مس لیبن کا واقعہ ناظرین پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب ہم ذیل میں مولٰنا کے چند خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت لکھتے ہیں اُمید کہ ناظرین مولٰنا کے اِن خیالات سے صحیح صحیح نتیجہ ہی نکالیں گے کہ دنیا میں وہ کسی سلطنت کو برٹش گورنمنٹ پر ترجیح نہیں دیتے۔ قبل اس کے کہ مولٰنا کے نمبروار خیالات لکھے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ایک فقرہ نقل کر دیا جائے تاکہ اس امر کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے کہ برٹش گورنمنٹ کی نسبت جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہی وہ خوشامدانہ نہیں ہی بلکہ بالکل آزادانہ ہی۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "بارہ برس ہوئے کہ مجھکو برٹش گورنمنٹ سے ایک بے تعلقی سی ہی مگر مجھ پر برٹش گورنمنٹ کے حقوق ہیں۔ برٹش گورنمنٹ نے مجھکو بڑھایا عزت دی۔ نوکری ہی میں اس کی بدولت ہوا۔ امن و آسایش اور آزادی سے علی وجہ الکمال متمتع۔ بایں ہمہ برٹش گورنمنٹ کا بھاٹ نہ کبھی تھا نہ اب ہوں۔ میں

جانتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں"۔ اب مولانا کے چند خیالات ملاحظہ ہوں۔

(۱) "ہندوستان کی عافیت اسی میں ہے کہ کوئی اجنبی حاکم اس پر مسلط رہے جو نہ ہندو ہو اور نہ مسلمان۔ پس ہو نہ ہو کوئی سلاطین یورپ میں سے ہو۔ سلاطین یورپ میں سے کون ہے جس نے سلطنت ہندوستان کی طمع نہیں کی۔ فرنچ۔ پورچگیز۔ ڈچ اپنی اپنی جگہ سب نے زور آزمائیاں کیں۔ حضرت شہنشاہ روس کے خاندان میں تو پیٹر دی گریٹ کے وقت سے یہ مرض نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آتا ہے کہ جس طرح بن پڑے ہندوستان پر قبضہ کیجیے۔ مگر خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے"۔

(۲) رعایائے ہندوستان میں ہم مسلمانوں سے بھی بڑھ کر کسی قوم کو سلطنت کے پھر حاصل کرنے کی خواہش ہو سکتی ہے۔ ہم سے سلطنت چھنے ہوئے بہت سے بہت تین چار پشتیں ہوئی ہوں گی۔ جب کہ دوسری قوموں کی بیس بیس پچیس پچیس پشتیں غلامی میں گل گئیں۔ ہماری سلطنت کے آثار مدہم پڑ گئے ہیں مگر مٹے نہیں۔ اس کا وہ غل نہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ مگر بھنبھناہٹ سی اب بھی ہے۔ جب کہ دوسری قوموں کے پاس شاہنامے کا ایک افسانہ ہے اور بس۔ مسلمان سلطنت کو اس طرح یاد کرتا ہے جیسے ایک سال کا دودھ چھوٹا ہوا بچہ دودھ کو۔ اس کے مقابلے میں دوسری قوم کا بڈھا پھونس ہے اور اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اس نے بچپن میں دودھ پیا تھا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ با ایں ہمہ ہم میں جن سمجھ دار ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جن دنوں ہم کو حکومت حاصل تھی۔ حاصل تھی باستحقاق۔ اب اگر چھن گئی ہے تو چھن بھی گئی ہے باستحقاق۔ اب زمانے کا وہ اگلا ساز رنگ نہیں رہا۔ دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ ہم میں سلطنت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں کہ اس کی آرزو کریں۔ زوال سلطنت کچھ بچوں کا کھیل نہیں۔ کہ تھی تھی۔ نہیں تو نہیں سہی۔ سلطنت کے مٹ جانے سے قومیں مٹ گئی ہیں۔ گویا سلطنت قومی زندگی تھی۔ شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عمل داری میں ہم کو اپنی سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے۔ اب اگر ہم مٹے ہیں اور مٹنے میں باقی ہی کیا ہے تو اپنی کاہلی اور نااہلی سے"۔

(۳) "ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عمل داری میں آنکھ کھولی ہے خدا اس کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔ پچھلی عملداریوں کی مصیبتیں۔ روز کی لوٹ مار ڈاکے۔ بے اطمینانی۔ بدامنی۔ حاکموں کے ڈنڈ چٹی۔ بیگار۔ ہنگامے۔ خانہ جنگیاں۔ قحط مری دیکھی نہیں۔ اور خدا دکھائے بھی نہیں تو کسی قدر بزرگوں سے سنیں اور بہت کچھ کتابوں میں پڑھیں مجھ کو تو حیرت ہوا کرتی ہے کہ ایسی بدعملیوں میں نسلِ آدم منقطع کیوں نہیں ہو گئی۔ اب چشم بد دور ایک عمل داری یہ ہے کہ شیر بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا۔ ایک شاعری خیال تھا یہاں ہر جگہ اور ہمہ وقت یہی ہو رہا ہے۔ جیسا کلکتہ۔ مدراس بمبئی۔ یا دوسرے بلاد میں جو گورنمنٹ سیٹ ویسا ہی پہاڑ کی کھوہوں میں جنگلوں میں شہروں میں قصبوں میں۔ گاؤں میں آبادی میں۔ ویرانے میں۔ ریل تار برقی۔ ڈاک۔ مدرسے شفاخانے۔ نہریں۔ کلیں۔ انواع و اقسام کے ساز و سامان زندگی۔ ہر طور کے انتظام۔ ہر طرح کے بندوبست۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بہتر اور کیا عمل داری ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھتے رہے۔ اترسوں سے پرسوں بہتر تھا۔ پرسوں سے کل کل سے آج۔ اور آج سے ان شاء اللہ آنے والا کل ضرور بہتر ہو گا۔ اور کل سے پرسوں۔ پرسوں سے اترسوں اور اسی طرح

سے یہ شخص شاہانِ روس میں سب سے بڑا نامور شخص ہے ۱۲ ۔ کہ دار السلطنت گورنمنٹ ۱۲

برسوں برسوں"۔ (۴) ہم انگریزوں کے ستائے ہیں اور اُن کی عمل داری میں ہم کو ہر طرح کا امن ہے۔ ہر طرح کی آسایش ہے اور جہاں تک رعایا کو آزادی ہو سکتی ہے آزادی بھی ہے۔ اور مَنۡ لَمۡ یَشۡکُرِ النَّاسَ لَمۡ یَشۡکُرِ اللّٰہَ کی رُو سے اِن کی خیر مناتے رہنا بھی ہمارا فرضِ اسلامی ہے"۔

برٹش گورنمنٹ کے انتظامات پر اعتراضات

ممکن ہے کہ ناظرین میں سے کوئی شخص ان وفادارانہ خیالات کو دیکھ کر مولٰنا کو گورنمنٹ کا بھاٹ اور خوشامدی قرار دے۔ لیکن مندرجۂ ذیل خیالات اِس مرضِ وہم کی کافی دوا ہیں۔ اِن خیالات میں برٹش گورنمنٹ کے انتظام پر اعتراضات ہیں۔ اُس کے مقرر کردہ حکّام پر اعتراضات ہیں مگر سب کے سب نیک نیتی اور صلاح و مشورے کے طور پر نہ کہ باغیانہ اور ہیکڑی اور زبردستی کے جیسے ہمارے ملک کے نادان یارانِ وطن اہلِ کانگرس اعتراض کیا کرتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ لڑتے ہیں۔ قبل اِس کے کہ ہم اعتراضات کو نمبروار لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا کا ایک فقرہ طریقۂ اعتراضات اور نکتہ چینی کے متعلق لکھ دیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "برٹش گورنمنٹ انسانی گورنمنٹ ہے اور کون انسان ہے جس سے بھول چوک نہیں ہوتی۔ گورنمنٹ کی نکتہ چینی داخلِ بدخواہی نہیں مگر نکتہ چینی کے بھی طریقے ہیں...... مگر یہ نیشنل کانگریس کا نیا طریقہ تو کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گورنمنٹ کی مخالفت میں ایک گوہار جمع ہو۔ سوتی بھڑیں جگائی جائیں جو لوگ امن چین سے اپنے اپنے کام دھندوں میں لگے ہیں سُن کر چونک پڑیں کہ ایسی کیا آفت نازل ہوئی جس کی وجہ سے یہ تمام کھلبلی مچ رہی ہے"۔ اب نکتہ چینیاں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ سرکار کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں جن میں سے ایک بڑا ضروری انتظام لیاقت کے اسٹینڈرڈ کا ٹھیرانا ہے۔ انگریزوں نے اپنی ولایت پر قیاس کر کے صرف یونیورسٹی کی ڈگری کا معیارِ لیاقت ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ ہماری سوسائٹی کو زیر و زبر کر رکھا ہے۔

(۲) میں گورنمنٹ کے کسی انتظام کو اتنا ناقص و قابلِ اعتراض نہیں پاتا جتنا انتظامِ تعلیم کو۔ تمام تعلیم کو گورنمنٹ نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے اور جب رعایا کو آپ اپنی تعلیم کے سنبھالنے کا سلیقہ نہ ہو تو بلاشبہہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا انتظام کرے۔ لیکن گورنمنٹ نے جو کچھ اب تک کیا ہے اُس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ نوکریاں پا گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ خوش بھی ہیں اور اکثر بے معاش پڑے پھرتے ہیں نوکری ملتی نہیں اور سوائے نوکری کے نہ اُن سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ اُن کو کوئی کام آتا ہے یہ لوگ تعلیم کے بڑے خطرناک نتیجے ہیں۔

(۳) آدمیوں کی طبیعتیں اس قدر مختلف واقع ہوئی ہیں کہ سب کو ایک طرح کی تعلیم دینے سے فائدے کے عوض اُلٹا نقصان ہوتا ہے اور جو حال دنیاوی تعلیم کا ہے وہی دینی تعلیم کا بھی ہے۔ ہمارا سررشتۂ تعلیم کیا غلطی کر رہا ہے۔ یہی کہ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتا ہے جس کا ثمر پیش رس ہے نیشنل کانگرس۔

(۴) انگریزی عمل داری میں سب خوبیاں ہیں مگر رعایا کے اندرونی حالات سے حکّامِ انگریزی کا ناواقف ہونا بڑا غضب ہے۔ بے شک اس کا انتظام مشکل ہے مگر ایسی ہی مشکلات پر غالب آنے کا معاوضہ ہے سلطنت۔ اور یوں ٹوٹا پھوٹا انتظام کیا پہلے نہ تھا یا اب ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ حکّام کو رعایا کے ساتھ اختلاط کا موقع دو۔ اِن کو جلد

جلد جلد ست بدلو۔ واقفیت کو لیاقت کا اسٹینڈرڈ بناؤ اور اس کو مدارِ ترقی ٹھیراؤ۔ پھر خانہ جنگیاں اور ہنگامے ہوں تو میرا ذمّہ

(۵) گورنمنٹ کے مدرسوں میں کہ وہاں دین و مذہب سے بحث نہیں۔ تربیت کی طرف مطلق توجہ نہیں اور تعلیم بے تربیت ایسی ہی نامفید ہے جیسے آرمی و دآوٹ ڈسپلن یعنی بے قواعد کی فوج۔ اور کانگرس نے گورنمنٹ کو تعلیم بے تربیت کے نتیجے دکھا بھی دیئے۔ تعلیم بے تربیت گورنمنٹ کی غلطی تھی اور اُس کو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

غرض برٹش گورنمنٹ کے انتظامات پر مولانا نے جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ بظاہر طریقہ تعلیم اور نتیجہ تعلیم پر کی ہیں ممکن ہے کہ بعض حضرات فرمائیں کہ طریقہ تعلیم پر اعتراض کرنا کوئی اعتراض کرنا نہیں ہے یہ تو مکتب کے لونڈے بھی کر سکتے ہیں۔ ہاں مولانا کو نمک کا محصول گھٹنے کے بارے میں کوئی لکچر دینا چاہیئے تھا۔ ہتھیار باندھنے کی عام اجازت پر کوئی اسپیچ دینی چاہیئے تھی۔ ہندوستانیوں کو والنیٹر بنانے کی غرض سے کوئی عرض داشت پیش کرنی چاہیئے تھی۔ انکم ٹیکس کی موقوفی پر کوئی مضمون لکھا ہوتا اور آخر میں ہندوستانیوں کو کلکٹر۔ کمشنر۔ لفٹنٹ گورنر۔ اور گورنر جنرل بننے کی ترغیب دے کر کسی پلیٹ فارم پر جمع کر کے علمِ بغاوت بلند کرنا چاہیئے تھا جب یہ بھی ہو جاتا تو کھڑے کھڑے برٹش گورنمنٹ کا کان پکڑ کے ہندوستان سے باہر سمندر پار اُتر جانے کا مشورہ ہوتا اور مشورہ کیا ہوتا بلکہ علیٰ رؤس الاشہاد کہہ دیا جاتا کہ آپ لوگ اپنی ولایت کو تشریف لے جایئے یا دنیا میں کوئی غیر مہذب اور ناتعلیم یافتہ ملک تلاش کیجئے اور وہاں جا کر حکومت کیجئے یہاں آپ کا اب کوئی کام نہیں۔ اگر اس پر برٹش گورنمنٹ باز نہ آتی تو معاذ اللہ بمب شل چھوڑے جاتے لیکن یہ طریقہ نہایت نالائق ہے۔ ہندوستان کے تمام ہندوؤں اور مخصوص بنگالی ہندوؤں سے ہماری یہی استدعا ہے کہ وہ اپنی اس قسم کی ناروا اور ناجائز حرکتوں کو چھوڑیں اور آدمیت اور انسانیت سے اپنی حق طلبی کریں ورنہ ؎ ترسم نرسی

بکعبہ اے اعرابی ٭ کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست ٭

بہرحال ہمارے نزدیک بھی یہ غل غباڑہ ایک بیہودہ اور لغو و لاحاصل ہے۔ ہماری تو یہ رائے ہے کہ صرف تعلیم مفید پر زور دیا جائے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے جو طالبِ علم نکلتے ہیں وہ ملک اور قوم اور خود برٹش گورنمنٹ کے لیئے نامفید ثابت ہوتے ہیں۔ ہماری تو یہ رائے ہے کہ گورنمنٹ کو ایسی تعلیم دینی چاہیئے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو اور بی اے اور ایم اے کی جگہ یا اس کی جگہ بھی نہ سہی بے اے۔ ایم اے کے بعد۔ انجینیری۔ ڈاکٹری اگریکلچر۔ باٹنی۔ میکینکس۔ طبعیات۔ جیالوجی۔ جن کے ذریعے سے صنعت اور دست کاری اور ایجاد کی قدرت حاصل ہوتی ہے سکھائی جائے۔ ہندوستان میں یورپ کی طرح صنعت و حرفت کے اسکول کھول دیئے جائیں اور جتنی ضرورت کی اشیا باہر سے آتی ہیں وہ ہمارے ہی ملک میں تیار ہوں تو یہ رات دن کی تُو تُو مَیں مَیں کیوں ہو۔ امن چین سے زندگی بسر ہو۔ ہندوستانی تاجِ برطانیہ کی وفادار رعایا ہوں تاجِ برطانیہ اپنی وفادار رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرے اور ہر دم ایسے مشغلوں میں اس کو مصروف رکھے جس میں ملک کی بہبودی اور ترقی کے آثار نمایاں ہوں۔ یعنی دن عید اور رات شب برات ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا اور تعلیم کا بھی یہی طریقہ رہا جو آج کل ہے تو سمجھ لینا

چاہیئے کہ نااہل ہندوستانی گورنمنٹ کو بدنام کریں گے اور خود پھانسیاں پائیں گے یا کالے پانی جائیں گے جیسا کہ دیکھا جارہا ہے آیندہ اختیار بدستِ مختار ہے ع رموز مملکتِ خویش خسروان دانند +

قرآن مجید کی ایک آیت سے گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت کا ثبوت

ہم نے بعض سربرآوردہ مسلمانوں کے خیالات کو بغور دیکھا ہے کہ جب کبھی وہ قرآنِ مجید سے برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کی آیت استشہاس کریں گے تو اُسی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ سے[1] لیکن مولنا اس بارے میں اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس آیت سے مسلمان اُولِی الْاَمْر مراد ہیں نہ غیر مسلم اُولی الامر۔ چنانچہ اس کے متعلّق نہایت ہی دل چسپ بحث کی ہے اور وہ یہ ہے "یوں تو سارے حقوق چاہے وہ حق اللہ ہوں یا حق العبد ہوں اور اُن کے مقابلے کے فرائض اپنی اپنی جگہ سب ہی ضروری ہیں مگر ضرورت ضرورت میں بھی فرق ہے۔ ایک ضرورت تنفّس کی ہے۔ ایک بھوک کی ایک پیاس کی۔ یہی حال حقوق و فرائض کا ہے۔ تو جس وقت تک حقوقِ والدین پیشِ نظر تھے ہم نے یہی سمجھا کہ بس حقوق العباد میں ان سے بڑھ کر کوئی حق مہتم بالشان نہیں۔ اب جو حقوق حاکم سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ حقوقِ حاکم مہتمّ بالشان ہونے میں حقوقِ والدین سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ والدین بھی ایک طرح کے حاکم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی حکومت محدود ہوتی ہے اور محدود ہونے کے علاوہ مبنی ہوتی ہے شفقت۔ اور محبت پر اور حاکم کی حکومت وسیع ہوتی ہے اور مبنی ہوتی ہے غلبے اور قوت پر تو اس اعتبار سے والدین اور حاکم کی حکومت میں خاص عام یا جزو کل کی نسبت ہوئی۔ ہم اس سے پہلے کسی مقام پر لکھ چکے ہیں کہ دنیا میں حکومت کا دستور کیوں کر چلا اور کس غرض سے چلا۔ مختصراً یہ ہے کہ آدمی اس طرح کا مخلوق ہے کہ وہ اکیلا ساز و سامانِ زندگی بہم نہیں پونہچا سکتا۔ ناچار اس کو اپنے جیسے آدمیوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا ہے اور چونکہ طبیعتیں اور ضرورتیں سب کی قریب قریب یکساں ہیں خود غرضی لوگوں میں لڑائیاں ٹٹلواتی اور طرح طرح کے فساد کراتی رہتی ہے۔ بس تو حاکم اتنے ہی کام کا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق میں دست اندازی نہ کریں آپس میں لڑیں جھگڑیں نہیں یعنی امن و امان سے اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔ پس لوگوں کا امن و عافیت کے ساتھ زندگی کرنا موقوف ہے اسلوب حکومت کے ٹھیک بیٹھنے پر اور اسلوبِ حکومت کا ٹھیک بیٹھنا موقوف ہے حاکم کے منصف مزاج۔ خدا ترس۔ خیر خواہِ خلائق اور ان صفتوں کے ساتھ باشوکت ہونے پر کہ اپنے احکام کے نافذ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ اور رہا رعایا کے مطیع و منقاد ہونے پر بھی۔ غرض مصلحت انتظام نصب حاکم کی متقاضی ہوئی کہ ایک شخص جماعت کا سر دھرا بن کر لوگوں کو اپنے ربط و ضبط میں رکھے۔ حکومت نے کیسے کیسے رنگ بدلے ہیں یہ مقام اس کی تفصیل کا نہیں اتنی سمجھ بھی لوگوں کو کہیں مدّتوں میں جا کر آئی ہوگی کہ کثرت بے وحدت کے منتظم نہیں ہو سکتی مگر اب تو حکومت کے ہر ایک صیغے میں اس قاعدے پر عمل کیا جارہا ہے۔ مثلاً کاشت کاروبار

[1] مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں اُن کا بھی ۱۲۔

زمین داری۔ زمین داروں پر نمبردار ہے۔ نمبرداروں پر ضلع دار۔ پھر تحصیل دار۔ پھر ڈپٹی کمشنر۔ پھر کمشنر۔ پھر فنانشل کمشنر۔ پھر لفٹنٹ گورنر۔ پھر گورنر جنرل۔ پھر بادشاہ۔ دیکھو کثرت سمٹتے سمٹتے کس طرح بادشاہ کی ذات میں جاکر جمع ہوجاتی ہے۔ یہی قاعدہ ہم کو خدا کی وحدانیت کے عقیدے کی طرف کو بھی رہبری کرتا ہے۔ خدا نہ ہو۔ یا ہو اور ایک نہ ہو کئی خدا ہوں تو دنیا کا انتظام ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔

اب سمجھیے کہ حاکم کیا چیز ہے اور کیوں اُس کا ہونا ضرور ہے۔ حاکم کی جبری اطاعت تو چار وناچار کرنی ہی پڑتی ہے۔ اِس لیے کہ اُس کے پاس فوج ہے۔ پولیس ہے۔ خزانہ ہے۔ جیل خانہ ہے۔ مگر نہیں ہم مسلمانوں کو خدا رسول نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ اطاعتِ حاکم کا حکم دیا ہے۔ پس اگر ہم مسلمان حاکمِ وقت یعنی انگریزوں کی اطاعت سچی اطاعت نہ کریں تو دنیا کے علاوہ اپنا دین بھی کھو بیٹھیں خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ لیکن انگریزوں کی اطاعت کے بارے میں حکمِ خدا اور رسول کا نشان دینا ذرا غور طلب ہے۔ قرآن میں ڈھونڈنے بیٹھو تو فوراً يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ پر جاکر نظر جم جاتی ہے کہ بس اس سے زیادہ صریح حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کے اولو الامر ہونے میں تو کچھ کلام نہیں۔ کلام اگر ہے تو مِنْكُمْ میں ہے کہ سیاق وسباق کی رو سے آیت کے مخاطب مسلمان ہیں تو مِنْكُمْ نے حاکم کو خاص کر دیا کہ وہ بھی مسلمان ہو۔ ایک تعلیم کے نہ ہونے نے جس کی اس عمل داری میں سخت ضرورت ہے مسلمانوں سے عقلِ معاش اور عقلِ معاد دونوں عقلیں سلب کرلی ہیں اور اسی وجہ سے وہ بے دولت ہیں۔ ذلیل ہیں خوار ہیں اور پنچوں میں مُونھ دکھانے کے قابل نہیں رہے مگر اتنے بھی احمق نہیں ہوگئے کہ دن کو رات کہنے لگیں۔ اور انگریزی عمل داری کی برکتوں اور آسایشوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ قسم کھانے کی بات ہے کہ سارے ہندستان میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک مسلمان بھی الیسا نہ پاؤ گے جو انگریزی عمل داری کو دل سے عزیز نہ رکھتا ہو۔ مگر مذہب کی بات مذہب کے ساتھ ہے۔ سرکار بھی کسی مذہب میں دست اندازی نہیں کرتی۔ ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو خدا اور رسول نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ اطاعتِ حاکم کا حکم دیا ہے تو ہم کو چاہیے کہ اس دعوے کے ثبوت میں خدا اور رسول کا فرمودہ پیش کریں۔ سو أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ سے تو مِنْكُمْ نے مدعا ثابت نہ ہونے دیا اب رہی حدیث تو اُس میں ایسے احکام کثرت سے ملیں گے کہ حاکم کی اطاعت کرو گو وہ تمھاری نظر میں حکومت کا اہل نہ ہو۔ اور ایسا ہوا ہے کہ جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی مصلحتِ خاص سے کسی کم وقعت صحابی کو امیر الجیش بنا دیا ہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابیوں کو اُس کی اطاعت کرنی پڑی ہے۔ اور اُنھوں نے کی ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر قرآن کے مِنْكُمْ کا

ا۵ اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اَور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہوگئے ہوتے ۱۲

۵۲ اس نے دنیا (بھی) کھوئی اور آخرۃ (بھی) صریح گھاٹا ہے (کھلا ٹوٹا ہے) ۱۲-

۵۳ مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں صاحبِ حکومت ہیں اُن کا بھی ۱۲-

جواب نہیں۔ جہاں کہیں بھی ہی مسلمان افسر، مسلمان حاکم کی اطاعت کا حکم ہی۔ ہماری حالت کے مناسب کہ ہم
نصاریٰ کے محکوم ہیں نہ قرآن میں صراحت ہی اور نہ حدیث میں اور کیوں ہونے لگی تھی۔ جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ
وسلّم کی زندگی میں کہ اسی کے ساتھ قرآن وحدیث دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ اسلام نے
جزیرۂ عرب کے خاص خاص مقامات میں رواج پایا تھا۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ جو غیر مذہب والوں کے نرغے میں مذہب کی وجہ
سے تکلیف پاتا ہو ہجرت کر کے دار السلام مدینے میں چلا آئے۔ پھر خلفاء رضوان اللہ علیہم کے عہد میں اسلامی سلطنت
کَزَرْعٍ[۱] اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ہو کر بڑھی اور پھولی پھلی اور اُسی زمانے میں فقہ مدوّن ہوئی۔ غرض مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں قرآن سے
لے کر فقہی کتابوں تک ہم مسلمانانِ ہند کے مناسب حال اطاعتِ حکّامِ وقت کے بارے میں احکام نہیں پائے
جاتے۔ نہیں پائے جاتے اِس لیے کہ لکھّے نہیں گئے۔ لکھّے نہیں گئے اِس لیے کہ ضرورت نہیں پڑی۔ جب
اسلامی سلطنت تنزل کے پھیر میں آئی تِلْكَ[۲] الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ اور اُس کے علاقوں پر غیر مذہب
والے قبضہ کرتے گئے تو جو مسلمان ان مقبوضہ علاقوں میں سکونت پذیر تھے اُن کو اپنے مذہب کی خیر منانی پڑی اور لوگ
مسائلِ دار الحرب و ربٰو اور اطاعتِ حکامِ وقت کی طرف متوجہ ہوئے ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست۔ کسی نے اطاعتِ
حکامِ وقت کے بارے میں اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ سے سند پکڑی اور
اُسی مِنْكُمْ نے اُسے روک دیا۔ اور کسی نے اپنے تئیں مستامن بنایا۔ حال آں کہ جن مستامنوں کا قرآن یا حدیث
یا فقہ میں مذکور ہی وہ غیر مذہب والے ہیں جو مسلمانوں کی عمل داری میں پناہ گزیں ہوں ہم نے بھی اپنی جگہ
اِعمالِ فکر کیا تو اس رستے کو چھوڑ دینا ہی مناسب معلوم ہوا۔ اب حکّامِ وقت کی اطاعت کو ایفاءِ عہد[۳] اور نہی
عَنِ الفسادِ فی الارض پر مبنی کرتے ہیں اور اسی لیے ہم نے عنوان اطاعتِ حاکم کے ذیل میں ایسی آیتیں
جمع کر دی ہیں جو ایفاءِ عہد اور نہی عن الفسادِ فی الارض سے متعلق ہیں۔ اُن کے پڑھنے سے تم کو
معلوم ہو جائے گا کہ کیسے زوردار لفظوں میں ایفاءِ عہد کی تاکید اور فساد کی مناہی ہی۔ تمام جھگڑے تمام خرخشے
جو آئے دن لوگوں میں ہوتے رہتے ہیں داخلِ فساد ہیں۔ دنیا کبھی فساد سے خالی نہیں رہی اور خالی رہے گی بھی نہیں۔
آدمی ہی تو آدمی کے ساتھ فسادات بھی ہیں اس لیے کہ آدمی تو فساد کی جڑ ہی اور اسی فساد کی روک تھام کے لیے دنیا میں
دین و مذہب چلا تو حکمِ حاکم کو نہ ماننا فساد کی بھڑوں کا جگانا۔ دنیا سے امن وعافیت کا اُٹھا دینا اور خدا کے مقدس

۱؎ جیسے کھیتی کہ اس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس نے (غذائے نباتی کو ہوا اور مٹی سے جذب کر کے اپنی (اس سوئی) کو قوی کیا
چناں چہ وہ (رفتہ رفتہ موٹی ہوئی (یہاں تک کہ آخر کار کھیتی) اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی (اور اپنی سرسبزی سے) لگی کسانوں کو خوش
کرنے (خدا نے) اُن کو روز افزوں ترقی اس لیے (دی ہی) کہ ان (کی ترقی) سے (ترسا ترسا کر) کافروں کو جلائے ۱۲۔

۲؎ یہ اتفاقات وقت ہیں جو ہمارے حکم سے نوبت بہ نوبت (سب) لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں ۱۲

منشاء کی مخالفت کرنا ہے۔ اب رہا عہد تو عہد کی دو قسمیں ہیں۔ عہدِ قولی اور عہدِ فعلی۔ عہدِ قولی تو زبانی قول و قرار ہے۔ عہدِ فعلی یہ ہے کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر طریقِ عمل سے پایا جاتا ہے کہ فریقین میں ایک طرح کا ذہنی قرارداد ضرور ہے۔ مثلاً زید نے ہندہ سے نکاح کیا۔ ایجاب و قبول کے وقت اکثر مہر کی صراحت تو کر لی جاتی ہے اور زید ادائے رقم کا عہد کرتا ہے مگر نان نفقے کی نسبت کسی طرح کا تذکرہ درمیان میں نہیں آتا۔ اب زید بیوی کو اپنے گھر لے جا کر رکھے تو اس کو دستور کے مطابق ہندہ کا نان و نفقہ دینا آئے گا۔ اور گھر میں لے جا کر رکھنے سے سمجھا جائے گا کہ زید نے ہندہ کے نان و نفقے کا عہد کر لیا ہے۔ اسی طرح کا معاہدہ ہم میں اور انگریزوں میں ہے۔ جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر مسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کر اُن کے ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے اُن کی اطاعت۔ انگریز فوج اور پولیس اور عدالت کے ذریعے سے مہما امکن ہمارے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں تو ہم مہما امکن ان کی اطاعت کیوں نہ کریں۔ حکامِ وقت کی اطاعت پر ایک بڑا ضروری مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ملک کے انتظام اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لیے آپ قوانین وضع کیے ہیں اور چوں کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور انگریزوں کو مساوات کے ساتھ سب ہی کے حقوق کی حفاظت کرنی پڑتی ہے جیسے رعایا ہندو ویسے مسلمان ویسے پارسی ویسے عیسائی۔ ناچار اُنھوں نے وضعِ قوانین میں محض انصاف کو مدِ نظر رکھا اور کسی فرقے کے مذہب کا خیال نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مذہب کا بھی۔ اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے سے کوئی شریعت اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہی۔ از آں جملہ اسلامی شریعت کے بھی بہت سے احکام معطل ہو گئے۔ کارروائی کا طریقہ بدل گیا اور شریعت کے اعتبار سے ایک نئی طرح کا اسلام چلا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس حالت میں بھی مسلمان ہیں یا نہیں؟۔ جواب یہ ہے کہ پورے پکے اور شریعتِ اسلامی کے جو احکام معطل ہیں خدا نے حکامِ وقت کی اطاعت فرض کر کے ان احکام کو ہمارے حق میں خود معطل فرما دیا ہے اور ہمارے لیے انگریزی قانون ہی اسلامی قانون ہے اور ایسا نہ ہو تو ہندوستان دار الحرب قرار پا کر ہر مسلمان پر ترکِ وطن یعنی ہجرت فرض ہو جائے اور علمائے اسلام میں سے شیعہ ہوں یا سنّی مقلد ہوں یا غیر مقلد۔ صوفی ہوں یا اہلِ حدیث کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ علاوہ بریں احکامِ شریعت سے مقصودِ اصلی ہے اقامتِ امن اور وہ قانون انگریزی سے بھی حاصل ہے۔ صرف تدابیر کا فرق ہے۔ ایک قاتل کو قتل کرتا ہے ایک پھانسی دیتا ہے۔ ایک چور کا ہاتھ کاٹتا ہے۔ ایک قید اور بید اور جرمانے کی سزا دیتا ہے۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ رعایا ہونے کی حالت میں قانونِ انگریزی کی اطاعت ایک امرِ اضطراری ہے اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کی رو سے خدا نے ہماری مجبوریوں پر نظر کر کے ہمارے حق میں توسیع کر دی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

قومی و ملکی ہمدردی

قومی ہمدردی کا اندازہ مولانا کے لکچروں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ علی گڑھ کالج کے در و دیوار، انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ لکچر قومی ہمدردیوں کی مستحکم یادگاریں موجود ہیں۔ علی گڑھ کالج میں متعدد بورڈنگ ہاؤس بنوائے جن میں کم سے کم بیس پچیس ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ چندے دیئے جن کی تعداد دس بارہ ہزار روپیہ ہوگی

انجمنِ حمایتِ اسلام میں بھی بارہا چندے دیئے۔ چندے کے علاوہ کلام مجید کی پانسو جلدیں بھی دیں۔ تعلیمی وظائف بھی دیئے علاوہ اِس کے مولٰنا کے لکچروں نے قوم کی جیبیں قوم ہی کے لیئے ہمیشہ خالی کرائیں۔ اس کو بھی ہم مولٰنا کا دنیا ہی سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ایک موقع پر خود مولٰنا نے بھی اشارہ فرمایا ہی۔ [۱]

میں تم میں آ کھڑا ہوتا ہوں جب مجبور کرتے ہو ۔۔۔ کہ گر تشریف لاؤ مہربانی ہو عنایت ہو
تم آجاؤ اور آکر اپنا لکچر دو تو جلسے میں ۔۔۔ ہجوم و ازدحامِ خلق ہو لوگوں کی کثرت ہو
کوئی بھاری سے معتد بہ رقم چندے کی آجائے ۔۔۔ ہماری انجمن کو مفخر و استحکام و قوت ہو
کما لیتے ہیں کتنے آدمی میرے ذریعے سے ۔۔۔ تمھیں ہو اجران کو فائدہ مجھکو مسترت ہو
اگر اپنے لیئے چاہوں تو کتنا کچھ محاصل ہو ۔۔۔ بہت کچھ ہو گدائی کی اگر میرے تئیں لت ہو
یہ دلوانا بھی دینے ہی میں داخل ہی اگر سمجھو ۔۔۔ کہ مثلِ خیر ہی گر خیر کے اُوپر دلالت ہو

غرض مولٰنا نے اپنی جیبِ خاص سے بھی چندے دیئے ہیں اور دوسروں سے دلوائے بھی ہیں۔ یہ کس لیئے۔ یہ انھیں انجمنوں کے لیئے انھیں کالجوں کے لیئے وہ معمولی طریقے کے سوا اَور مختلف طریقوں سے بھی خوشی و غمی میں وظائف سے امداد کرتے رہے ہیں اور اب بھی اس قسم کی امداد کی سوت جاری ہی۔ کبھی کبھی قومی گداگری بھی کی ہی۔ باوجودے کہ سرسیّد کے بعض عقائدِ مذہبی سے اختلاف تھا۔ تاہم قومی ہمدردی ہی مولٰنا کو کشاں کشاں لے گئی۔ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں وہ ہمیشہ مدعو کیئے گئے اور ہمیشہ ان دونوں انجمنوں کی خدمت کی۔ سرسیّد کے بعد نواب محسن الملک بہادر ہمیشہ ان کو گھسیٹ بلاتے تھے۔ علیٰ ہذا لاہور سے مولوی شمس الدین صاحب آکر ڈھئی دیتے تھے اور اس طرح مجبور ہو کر مولٰنا کو جانا پڑتا تھا۔ لکھنؤ کی کانفرنس جو دسمبر ۱۹۰۷ء میں منعقد ہوئی اُس کے بعد سے تمام انجمنوں میں جانا چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ شہر کے مشہور مدرسۂ طبّیہ کے جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کی کانفرنس میں مولٰنا کے بعض دوستوں نے کفر کے ایک فتوے پر ریمارک کرنے کو کہا۔ اِس کا قصّہ یوں ہی کہ جس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن پر ہمارے

---

[۱] سرسیّد مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم ہمیشہ مجبور کر کے کانفرنس میں مولٰنا کو بُلایا کرتے تھے یہ انھیں دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ ہی ۱۲

[۲] اکثر ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مولٰنا کے لکچروں کی وجہ سے کالج کے لیئے چندے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہی۔ کہ ہز ہائی نس سر آغا خان اور جسٹس سید بدر الدین طیب جی یہ دونوں پیچھے بعد دیگرے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پریزیڈنٹ قرار دیئے گئے ہز ہائی نس دہلی دربار کے زمانے میں اور جسٹس صاحب بمبئی کانفرنس میں دونوں نے پردے کے مخالف اپنا خیال ظاہر کیا۔ بمبئی کے لوگ جسٹس صاحب کی تقریر پر برہم ہوئے۔ مولٰنا تو اپنی ڈیوٹی ادا کر کے بمبئی سے تہم چلے گئے بمبئی میں ایک بڑا معزز خاندان ناخدا محمد علی روگے کا ہی۔ ناخدا صاحب تو علیل ہیں مگر اُن کے خاندان کی عظمت قائم ہی۔ قال قال پردے کی بحث ناخدا صاحب کی حرم محترم میں پونہچی۔ اور اُنھوں نے اپنے داماد نواب نصر اللہ خاں صاحب کو دوڑایا یہ صاحب مولٰنا کو تہم سے واپس لے گئے۔ مولٰنا نے ناخدا صاحب کی بی بی کے فرمانے سے پردے پر لکچر دیا۔ کوئی سَو سے زیادہ لیڈیاں پردے کے اندر بیٹھی مولٰنا کا لکچر سُن رہی تھیں۔ اور مولٰنا پردے کے پاس مردوں میں لکچر دے رہے تھے۔ لکچر کے تمام ہونے پر ناخدا صاحب کی بی بی نے ایک ہزار۔ ناخدا صاحب کی بہن نے ایک ہزار۔ ناخدا صاحب کی صاحبزادی نے پانسو کل ڈھائی ہزار روپے کے نوٹ مولٰنا کے حوالے کیئے۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ دیئے تو مجکو مگر نواب محسن الملک گھات میں لگے ہوئے تھے اُنھوں نے اُچک لیئے اُس روپے سے کالج میں چند شاندار کمرے تیار کرا دیئے گئے ۱۲

مولٰنا۔ نواب محسن الملک اور مسٹر موریسن وغیرہ اُترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص مسافروں کو اشتہار تقسیم کر رہا ہے ایک اشتہار ہمارے مولٰنا کو بھی دیا۔ اسی طرح نواب محسن الملک بہادر مرحوم اور اَور لوگوں کو بھی۔ یہ اشتہار ایک کفر کا فتوےٰ تھا جو علی گڑھ پارٹی کی نسبت وہاں کے بعض متعصب مولویوں نے دیا تھا۔ فتوے میں ایک مولوی صاحب کی مہر بھی یا معمولی طور پر مع کنیت کے نام تھا یعنی "ابو الغنا مولوی فلاں" مولٰنا نے یہ دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ جب یہ لوگ جائے قیام پر پہنچے تو نواب محسن الملک بہادر نے بعض احباب کی معرفت وہ فتویٰ مولٰنا کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ میں اس لیئے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں کہ آپ اس فتوے پر کچھ ریمارک کریں۔ چناں چہ مولٰنا جب لکچر دینے کھڑے ہوئے تو حسب عادت ایک لطیفہ اس فتوے کے متعلق یہ بیان کیا کہ ہمارے ہاں کے علماء کی اَب یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ شرعی پاس لحاظ بھی اُٹھ گیا ہے چناں چہ ایک مولوی صاحب نے اپنی کنیت ابو الغنا رکھی ہے جیسے میں اپنی کنیت ابو الہار مونیم رکھ لوں۔ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ چناں چہ اس لطیفے پر لوگ ہنس پڑے۔ لیکن نواب محسن الملک بہادر مرحوم یا دو ایک اَور مخصوصوں نے جو ہمارے مولٰنا کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے بری طرح سے بر سر اسٹیج روکا۔ مولٰنا کو یہ ناگوار ہوا اور اُس تاریخ سے انجمنوں اور جلسوں میں شریک ہونا ترک کر دیا۔ کچھ بڑھاپے کا بھی قصور ہے کہ اُٹھنے بیٹھنے میں حارج ہوتا ہے۔

ملکی ہمدردی کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ چندے کی نہ سہی۔ مشورے ہی کی سہی۔ قاعدے کی بات ہے کہ کوئی روپے سے مدد کرتا ہے کوئی عقل سے۔ خالی روپے سے کام نہیں چلتا۔ اگر عقل کی مدد نہ ہو اور کوئی نیک صلاح بتانے والا نہ ہو۔ ناظرین کو شاید معلوم نہیں کہ آج کل جو سودیشی سودیشی کی آوازیں چاروں طرف ہندوستان میں گونج رہی ہیں یہ ہمارے مولٰنا کا بہت پرانا خیال ہے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر اطاعت و فرماں برداری سے اس نیک صلاح پر اگر ہندوستانی کاربند ہوں تو ہندوستان پھر جنت نشان ہو سکتا ہے اور صرف یہی ایک ایسی چیز ہے کہ ہندوستانی اگر اپنے ملک کی پیداوار کو ترقی دیں۔ تو غیر ملک والے ہندوستان کا روپیہ گھسیٹ کر نہیں لے جا سکتے۔ اور یہ مفلسی اور فلاکت کی گھٹا ٹوپ اندھیری جو اُن پر چھائی ہوئی ہے اُس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے چناں چہ مولٰنا فرماتے ہیں۔

"(۱) خدائے تعالیٰ نے ہر ایک مخلوق کی حالت کے مطابق نہ صرف مایحتاج زندگی بلکہ آسایش کے سامان مہیا فرما دیئے ہیں۔ انتظام الٰہی کے خلاف ہے کہ ہم رہیں ہندوستان میں اور حفظِ صحت کے محتاج ہوں اُن چیزوں کے جو یورپ اور امریکہ میں میسر آتی ہیں۔ مگر یوں کہو کہ ہم غور نہیں کرتے اور خواہ مخواہ پتلون کے شکنجے میں اپنی ٹانگیں پھنسانی چاہتے ہیں ڈاکٹروں کی طبابت کے بڑے معتقد اکثر وہی لوگ ہیں جن کے سروں میں حسب تقاضائے وقت آزادی کے خیال بڑے اُبل رہے ہیں۔ لیکن اگر آزادی اسی کا نام ہے کہ ادبدا کر اپنی ہر پرانی چیز کو ترک کیا جائے تو جہاں تک یہ آزادی طبابت سے متعلق ہے ہمارے نزدیک ان لوگوں کی وہی کہاوت ہے کہ گڑھے سے نکلے اور کوئیں میں گرے۔ سلطنت۔ حکومت۔ دولت۔ دست کاری تجارت سب کچھ جا کر ایک جان بچی تھی وہ بھی دوسروں کے بس میں کر دی۔ تو حقیقت میں دنیا سے آزاد ہوئے۔ ؎

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل　　　کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

جو دوائیں اطبائے یونانی تجویز کرتے ہیں سب ہمارے ملک کی پیداوار ہیں اگر یہ دوائیں دوا کے طور پر کام میں نہ لائی جائیں تو دوسرے کسی مصرف کی نہیں۔ پس ملکی خیر خواہی کب جائز رکھ سکتی ہے کہ اتنی ملکی دولت کو ضائع ہونے دیا جائے خصوصاً اس صورت میں کہ ہم ملکی خیر خواہی کا بھی دم بھرتے ہیں۔

(۲) جدھر دیکھو تعلیم تعلیم کا غل ہو رہا ہے اور میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ جس قدر تعلیم اس وقت تک ہو چکی ہے وہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک میرے نزدیک تعلیم کے اصول ہی ٹھیک نہیں ہوئے۔ کچھ اس طرح کا خلطِ مبحث ہو رہا ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس وقت ساری تعلیم کا ماحصل ہے نوکری۔ دیکھتا ہوں کہ ایک عالم نوکری کے خبط میں گرفتار ہے۔ جن کا پیشہ نوکری ہے وہ اور جن کا پیشہ نوکری نہیں وہ۔ جن کو ضرورت ہے وہ اور جن کو ضرورت نہیں وہ اور جو اہلِ قلم کے خاندان سے ہیں وہ اور جو اہلِ قلم کے خاندان سے نہیں وہ۔ جو سوسائٹی میں شریف سمجھے جاتے ہیں وہ اور جو شریف نہیں سمجھے جاتے وہ جسکو دیکھو نوکری کے لیئے تیار ہو رہا ہے۔ الٰہی کیا نوکریاں آسمان سے برسیں گی یا زمین سے اُبلیں گی اور نہیں برسیں گی اور نہیں اُبلیں گی تو یہ اتنی ساری مخلوقات جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اسی ارادے میں صرف کر دیا کیا کر کے کھائے گی۔ پس میرے نزدیک تعلیم کی رفتار حد سے زیادہ تیز ہو گئی ہے اس کو ذرا مدّہم کیا جائے جو لوگ دوسرے دوسرے پیشوں سے معاش پیدا کر سکتے ہیں اُن کو تعلیم کی ترغیب دینا ہرگز قرینِ مصلحت نہیں۔ پھر اس تعلیم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ بس یہی ہے وہ چیز جو ہم کو درکار ہے بڑی مکروہ غلطی ہے۔ انگریزی عملداری میں ایک سخت مشکل درپیش ہے کہ ہم کو بھی چار و ناچار ہاتھیوں کے ساتھ گنّے کھانے پڑتے ہیں۔ اہل یورپ کی ہنرمندی اور صنّاعی اور ایجاد ہم کو پنپنے نہیں دیتی۔ معاش کے جتنے کسب ہم کو یاد تھے مٹ گئے اور رہے سہے مٹتے چلے جاتے ہیں۔ بس امید میں اتنی جان باقی ہے کہ اہل یورپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کو اُٹھا کر ولایت نہیں لے جا سکتے۔ ان کے ساتھ کمپیٹ (مقابلہ) کرنا تو محالِ عقل ہے۔ اتنا بھی ہو جائے کہ ہم اُن کی نقل و تقلید کرنے لگیں تو جانو سب پا یا۔ یہ ہونی چاہیئے غرض و غایت تعلیم کی۔ تعلیم مروّجہ سے تو یہ نتیجہ نہ حاصل ہوا ہے نہ حاصل ہو گا۔ اس کے لیئے خاص گروہ لوگ منتخب ہونے چاہیئیں جن کی طبیعتوں میں اُن علوم و فنون کے اخذ کرنے کی مناسبت پائی جائے۔ لیکن بہت باتیں بنانے سے کام نہیں نکلتا۔ منصوبے سوچنے والے تو میری طرح سیکڑوں ہیں کوئی کرنے والا بھی ہے؟ جانتے ہو کہ کرنا کیا چیز ہے۔ کرنے کے معنی ہیں کچھ دینا۔ فنڈ ہوں تو سب کچھ ہو۔ ولایت سے اُستاد بلواؤ۔ کلیں منگواؤ۔ ہونہار نوجوانوں کو ولایت چلتا کرو کہ وہاں سے طرح طرح کے کام سیکھ کر آئیں اور یہاں آکر اُن کاموں کو پھیلائیں تب جاننا کہ قوم کے کچھ دن پھرے۔

(۳) سلطنت کے جاتے رہنے کی میں اتنی بھی تو پروا نہیں کرتا جتنی ایک مٹّی کے گلھڑے کے ٹوٹ جانے کی ہوتی ہے۔ جو حلوائی دودھ دہی کے ساتھ مفت دے دیا کرتے ہیں۔ سلطنت کے ساتھ اقتدار ہے تو ویسے ہی اُس کے ساتھ بکھیڑے بھی ہیں۔ دنیا اور دین کی عافیت تو اسی میں ہے کہ نہ سلطنت کے جاتے رہنے کا افسوس ہو نہ اُس کے حاصل ہونے کی آرزو۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ سلطنت خوشی کا صرف ذریعہ نہ تھی تو بڑا ذریعہ ضرور تھی۔ اب علم و ہنر کا دور دورہ ہے۔ اسی کی سلطنت ہے اُسی کی حکومت۔ اُسی کی دولت۔ اُسی کی خوش حالی۔ اُسی کی عزت و آب رو۔ غرض اُسی کی دنیا اور دین

ٹُکارے کہتا ہوں کہ اُسی کا دین - اب سلطنت بھی بے علم و ہنر کے نہیں چل سکتی - اور نہ صرف سلطنت بلکہ سچ پوچھو تو بے علم و ہنر زندگی حرام ہے - اور جیسی زندگی ہم لوگ کر رہے ہیں کہ سوئی اور ہیچک اور دیا سلائی یعنی ضرورت کی کل چیزوں کے لیئے یورپ کے دست نگر ہیں میں تو اس کو زندگی نہیں سمجھتا - جن کو جینے کا سلیقہ نہیں ایسے نا اہلوں کو اوّل تو سلطنت ملنے ہی کیوں لگی ہے ع دولت ندہد خدا کسے را بگزاف - اور بالفرض محال مل بھی جائے تو جانو کہ ملک کے حصے کی قیامت آگئی -

(۴) یہ جو یورپ کی صنّاعیاں ہندوستان کی صنعتوں کو ملیامیٹ کرتی چلی جارہی ہیں یہ اُسی تعلیم کے تو نتیجے ہیں تو جب یہیں کے تعلیم یافتہ اُن کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے یورپ آپ سے آپ دُم دبا کر بھاگے گا ینیلا کے چُھرٹ - سوت - موٹا کپڑا - ان سب چیزوں کا دارومدار بھی یورپ پر تھا - جب سے ہندوستانیوں نے ان کا بنانا شروع کیا یورپ نے ہاتھ کھینچ لیا -

مولانا کی ملکی خیر خواہی کے ہم نے یہ چند نمونے دکھائے ہیں ورنہ اگر تلاش کرنے بیٹھئے تو سیکڑوں ایسے مفید مشورے اُن کی کتابوں اور لکچروں میں ملیں گے جن پر عمل کرنے سے ہندوستانیوں کے دن پھر سکتے ہیں قاعدہ ہے کہ رائے دینے والے رائے دیتے ہیں اور کام کرنے والے کام کرتے ہیں -

دوستوں کی فہرست اور اُن کے ساتھ راہ و رسم

مولانا کے شناساؤں کی فہرست تو بہت وسیع ہے - کیوں کہ ہندوستان میں کون ہے جو بلحاظ علم و فضل اور ایک بے نظیر مصنف اور لکچرار ہونے کے اُن کو نہیں جانتا - لیکن دوستوں کی فہرست کا حلقہ البتہ تنگ ہے - پُرانے دوستوں میں شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب خان بہادر ہیں - ان سے مراسم دوستی ابھی تک چلے جاتے ہیں - یہاں تک کہ اکثر لکچروں میں بھی ان کا ذکر خیر آجاتا ہے - مولوی محمد کریم بخش صاحب اُن کے ایک اور دوست تھے جن کا انتقال ہو گیا - یہ صاحب پنیل کوڈ کے ترجمے میں شریک تھے - ڈپٹی کلکٹر رہنے کی وجہ سے کم و بیش اُس زمانے کے جملہ ہم رتبہ عہدہ داروں سے روابط تھے جن میں سے اکثر کو موت نے سمیٹ لیا جو دو چار باقی رہ گئے ہیں وہ بھی پا بر کاب ہیں - تہذیبی دنیا کے ساتھ سر سید سے دوستی پیدا ہوئی مگر یہ بزرگ دوست تھے - مولانا اُن کا بہت ہی ادب کیا کرتے تھے - مگر مذاق سے باز نہیں آتے تھے - سرسید کے مرثیے بھی لکھے ہیں اُن کے ماتم میں اسپیچیں بھی دی ہیں - ایک مرثیے کے چند شعر یہ ہیں -

کیا کہیں مشغلہ لکچر کا اجی چھوٹ گیا — ہم سے اِک یار چُھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا

صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر — تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا

نہ سہی پَر تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز — گر قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

خان بہادر سید زین العابدین نواب محسن الملک مرحوم سے بھی خاص قسم کے مراسم تھے جو آج کل کے دوستوں کو نصیب نہیں نواب وقار الملک بہادر سے بھی پُرانی ملاقات ہے مگر اس کی تجدید حیدر آباد میں ہوئی - جب اورئی ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو سید آغا صاحب سے بہت خلط ملط تھا آغا صاحب کلکٹری کے سررشتہ دار تھے ان دونوں صاحبوں کے مکانات بھی قریب قریب تھے - گورکھپور میں منشی عبد الستار صاحب وکیل سے بھی خاص محبت تھی بلکہ انھیں کے مکان میں مولانا رہا کرتے تھے ان سے بالکل یگانگت

کا برتاؤ تھا۔ وکیل صاحب کے بچے مولنا کو چچا چچا پکارتے تھے اور میاں بشیر بھی وکیل صاحب کو چچا کہتے تھے یہی کیفیت مولوی کریم بخش صاحب سے تھی ان کو بھی میاں بشیر چچا کہتے تھے۔ اعظم گڑھ میں خواجہ احسن اللہ خاں صاحب رئیس سے بہت ربط وضبط تھا اکثر ان کے ہاں آمد و رفت تھی۔ ڈپٹی نثار علی صاحب ساکن آگرہ سے بھی دوستانہ تھا۔ خان بہادر منشی غلام غوث صاحب میر منشی لفٹننٹی۔ ذوالقدر میر ناصر علی خان صاحب ڈپٹی کلکٹر اور منشی عظمۃ اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر۔ اور خان بہادر برکت علی خاں صاحب مرحوم بزرگ دوستوں میں تھے۔ شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی۔ اور شمس العلماء مولنا شبلی صاحب نعمانی اور سیکڑوں اور معززین اور قومی بزرگوں بزرگوں سے بہت ربط وضبط ہی۔

اِن کے سوا ایک اور قسم کے بھی دوست ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہو کہ "وہ مطلب کے یار" اِن کا حلقہ بہت وسیع ہی اور ایسے دوست اکثر مولنا کو گھیرے رہتے ہیں۔ فان القرض مقراض المحبۃ کا صحیح ترجمہ یہی لوگ ہیں۔

از صحبتِ دوستانِ ایں دور طلاف رمزے گویم اگر نگیری بگزاف

چوں شیشۂ ساعت اند پیوستہ بہم دلہا ہمہ پر غبار و روہا ہمہ صاف

یتیموں کے ساتھ سلوک یتیموں کے ساتھ بڑی ہمدردی ہی وہ ان کی شکستہ حالی نہیں دیکھ سکتے وہ ان انجمنوں سے بہت خوش نظر آتے ہیں جو یتیموں کے لیئے قایم کی گئی ہیں۔ ہم نے ان کی سپیچوں میں اکثر مقامات پر پڑھا ہی کہ یتیموں کے ساتھ اس سے بڑھ کر کوئی اور سلوک نہیں کہ ان کو مناسبِ حال اس قابل کر دیا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور اگر ان کی تعلیم و تربیت ہو جائے تو یہ سب سے بہتر سلوک ہی۔

اعظم گڑھ کی طرف سے دو قحط زدہ یتیم چھوکریاں اور دکن سے کئی یتیم چھوکرے اور چھوکریاں مولنا کے ہاں آئیں ان کے ساتھ کبھی لونڈی غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ بلکہ اپنے بچوں کی طرح محبت و شفقت سے پالا پرورش کیا۔ یہاں تک کہ شادی بیاہ بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔ بیوی صاحبہ[1] نے کبھی کسی کو انگلی لگائی نہ کسی دوسرے کو لگانے دی ان میں سے صرف اب ایک چھوکرا باقی رہ گیا ہی اس کا نام نثار ہی اس کی عمر چار برس کی تھی کہ بیوی صاحبہ نے پالا تھا۔ یہ اعظم گڑھ کا رہنے والا ہی۔ اب ڈاڑھی مونچھوں والا ہو گیا ہی اور میاں بشیر کی خدمت میں رہتا ہی۔ وہ اسے اپنے دوسرے ملازموں کی طرح رکھتے ہیں۔ حق پرورش کا احسان نہیں جتاتے اس کو بھی تنخواہ دی جاتی ہی۔ چوں کہ میاں بشیر کی والدہ کا پالا ہوا ہی اس لیئے مزید عنایت کیا کرتے ہیں اور اس کے جورو بچوں کی بھی خبر گیری رکھتے ہیں۔

تموّل اور جائداد مولنا نے ایک مقام پر لکھا ہی کہ "تمھارے کان بھی ضرور اس مصرع سے آشنا ہوں گے "دو خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" طول اور وضع اور تعداد انامل کے اختلاف سے انگلیوں کو اعانت اور استعانت کا عمدہ موقع دیا گیا ہی۔ یعنی انگلیوں کی اختلاف حالت نے ہاتھ کو زیادہ قوی اور بکار آمد بنا رکھا ہی۔ مگر اس اختلاف کی بھی ایک حد ہی معیّن جن میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں۔ یہی حال ہی ایک خاندان کے لوگوں کا اگر ان کی حالتیں ایک اندازہ مناسب تک متفاوت ہیں تو یہ اختلاف

[1] بیوی صاحبہ ہمارے مولنا کی اہلیہ کا خطاب تھا۔ ہر شخص چھوٹا بڑا یہاں تک کہ خود مولنا اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ ہماری قلم سے بھی اسی باعث بیوی صاحبہ نکل گیا ۱۲۔

منفرداً اس کے اور مجتمعاً سارے خاندان کے حق میں مفید ہو گا۔ لیکن فرض کرو کہ کسی کے ہاتھ کی ایک انگلی بے موقع بڑھ کر گز بھر کی ہو جائے تو وہ لمبوتری انگلی عذاب ہو گی اپنے حق میں اور دوسری انگلیوں کے حق میں اور سارے ہاتھ کے حق میں۔ متموّل کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ہاتھ میں وہ لمبوتری انگلی میں ہوں نہ آپ خوش رہ سکتا ہوں۔ اور نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہوں۔" مولنا کے اس خط سے لوگوں کو معلوم ہوا ہو گا کہ سارے خاندان میں کوئی متموّل نہیں ہے۔ صاحب المال اگر ہوئے تو مولنا لیکن ہمارے نزدیک مسلمانوں میں فی زمانہ متموّل نام کو نہیں جو بظاہر رئیس ہیں اُن کا بھی بال بال قرض میں گھرا ہوا ہے بلکہ اب تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قرض مسلمانوں کا تمغہ ہو گیا ہے۔ اب امیر اُس کو کہنا چاہیے کہ جو معمولی طور پر خوش گزران ہو اور کھاتا پیتا ہو اور چار کو کھلا سکے۔ تو اس تعریف میں مولنا اچھی طرح آتے ہیں کروڑپتی تو نہیں مگر لکھ پتی ضرور ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ہو۔ کیونکہ ہم نے اپنی معرفت والوں کی سنی سنائی باتوں پر یہ اٹکل پچو جمع خرچ لگایا ہے۔ بہرحال وہ لکھ پتی ہوں یا کروڑپتی۔ خدا کا شکر ہے کہ خوش حال ہیں۔ چناں چہ اپنے تموّل کی نسبت نظم میں بھی کچھ ارشاد فرمایا ہے۔

خدا کا شکر ہے میں حال میں اپنے بہت خوش ہوں — نہیں ہے یہ کہ مجکو خاص کر کوئی شکایت ہو
مجھے پوری سبکدوشی ہے افکار معیشت سے — بڑی دولت ہے جب جس حال میں جس کو قناعت ہو
میں اپنی نیند سوتا ہوں مزے سے پاؤں پھیلا کر — اگرچہ سر پہ میرے شور و غوغائے قیامت ہو
نہ گردن میں مری طوق غلامی ہے کسی شہ کا — نہ حاکم ہوں کہ مجکو فکر بہبود رعیت ہو
نمک خوار نظام حیدرآباد دکن ہوں میں — جب ایسے کا توسّل ہے تو مجکو کیوں نہ ثروت ہو
مجھے ملتا ہے گھر بیٹھے جو یاں پر مل نہیں سکتا — اگرچہ نوکری میں عمر ساری صرف زحمت ہو

شعر تو یہ کہا ہے۔

یہ سن کر حاسد بد نفس مر جائے تو مر جائے — کہ ہم سب کو بھی اطمینان ہو اُس کو بھی راحت ہو

غرض مولنا کے پاس جو کچھ بھی دولت ہے وہ اُن کی قوتِ بازو کی کمائی ہے۔ مولنا "سلف میڈ مین" کی زندہ مثال ہیں اور وہ اس بارے میں میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کے زیادہ احسان مند ہیں کہ اُنھوں نے مولنا کو بہ اسیری نوٹوں کی چاٹ پر لگا کر سمجھا دیا کہ انسان کو کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کرنا چاہیے۔ پس مولنا نے قطرہ قطرہ جمع کیا تو دریا آپ ہوا چاہیے۔ بعض لوگ اس دریا کو سمندر بتاتے ہیں مگر مولنا کی طبیعت اس قسم کی نہیں کہ وہ اپنے سرمائے کو چھپا کر رکھیں اُن کا کل سرمایہ بنک میں جمع ہے اور اُس کی تعداد اُن کے اعزّہ کو معلوم ہے اور بعض ملازموں کو بھی۔ اب رہی جائداد۔ اُس کی حالت یہ ہے کہ مولنا جب تک ملازم رہے اُس وقت تک مکانات اور دکانات کے سوا تجارت میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ اِس کی تصدیق ہم کو بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھتے ہیں "تم اپنی والدہ سے کہدو کہ بڑے مکان کی فکر سے غفلت نہ کریں اور جیسی دکان . . . . . بیگم کی ہے ویسی ملے تو دو ایک اور ٹھہرائیں سات روپیہ مہینہ برابر ملے چلا جائے تو نوٹ سے بہتر ہے۔ حلال صریح اور منفعت بھی خاطر خواہ۔" یا مثلاً ایک دوسرے خط

میں لکھتے ہیں "مرزا حسین بخش کو جواب دو کہ اپنا معاملہ جہاں چاہیں کرلیں۔ چھ ہزار کا لین دین۔ میرا اطمینان ہونا مشکل ہے اور خصوصاً شاہزادوں کے معاملات پیچیدہ اور خطرناک ہیں اور دور بیٹھے کافی تحقیقات کون کرے" یا ایک جگہ اَور لکھتے ہیں "بیوی صاحب نے کئی مکان لیئے۔ لیکن سب جائداد میں دُکان مجکو پسند ہے۔ باقی محل اور حویلیاں سب آخور کی بھرتی ہیں غضب ہے کاظم علی والا مکان تیرہ سو کا ہے اور تین روپیہ کرایہ۔ نوٹ کے حساب سے اُس کا کرایہ للعہ ہونا چاہیئے مگر کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم نے مکان مفت نہیں پایا۔ گٹھری بھر روپیہ دیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم کو پورا نفع نہ ملے۔ مولوی صاحب کے مزاج میں رحم۔ بیوی صاحب کو خیال نہیں۔ تم کو لیاقت نہیں۔ مولوی دعاگو کو قابلیت اور فرصت دونوں نہیں۔ مکان لاوارث سا پڑا ہے اگر کرایہ داروں کو یہ حال معلوم ہو تو دو تین روپے بھی نہ دیں۔ بڑی حویلی ہمیشہ خسارہ دیتی ہے مگر اعمالِ بد کی طرح بارِ دوش ہے خدا ہی ہے کہ اُس کا بوجھ سر سے ٹلے جب تجربہ کرلیا کہ دہلی اور بجنور دونوں میں کوئی انتظام کرنے والا نہیں تو عاجز آکر نوٹ کا پہلو اختیار کیا ورنہ کوئی کرنے والا ہوتا تو حلال طور پر ایک ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ کماتا اور اصل محفوظ" ایک اَور خط میں لکھتے ہیں "مکان کو چھٹاؤ۔ مجکو بہت آخور کی بھرتی پسند نہیں۔ مکان لو تو بھلا مولوی . . . . . کا سا لو کہ دنیا میں بہشت یاد آئے۔ واہیات جھونپڑے جو تم نے لے رکھے ہیں نہ رہنے کے نہ بہنے کے۔ اب پانچ چھ ہزار سے کم کے مکان پر نظر مت ڈالو ایک عمدہ نفیس مکان مل جائے تو بس کافی ہے"

یہ عام قاعدہ ہے کہ نوکری سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہے۔ بے کاری ستاتی ہے۔ کام کا آدمی بے کار نہیں رہ سکتا۔ لوگوں نے یہی سوچ سمجھ کر مولانا کو صلاح دی کہ آنریری مجسٹریٹی کرلی جائے شہر کے شہر میں حکومت رہے گی۔ لیکن مولانا جو ساری عمر حقیقی مجسٹریٹی کو بھی بارِ گراں سمجھتے رہے اور خدا خدا کر کے اس اہم ذمہ داری سے چھوٹے وہ اس کرایہ کے ٹٹو کو لے کر کیا کرتے۔ غرض پنجابی کٹرے کے چند دوستوں کا داؤ چل گیا اور رقم ھونے ننانوے کے پھیر میں ڈال کر تجارت کے گورکھ دھندے میں پھانس لیا ہے اور ہرگز امید نہیں کہ مرتے دم تک اُس سے چھٹکارا نصیب ہو۔ مولانا اپنی تجارت کا حال ایک نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اگرچہ سازو سامانِ تکبر جمع ہیں سارے ۔۔۔ مگر حاشا کہ مجھ سے بھول کر ایسی حماقت ہو
پر استغنا و خودداری کے ہوتے کیا تعجب ہے ۔۔۔ کسی نادان کو مجھ پر گمانِ عُجب و نخوت ہو
فقط اک مشغلے کے طور پر تھوڑی تجارت ہے ۔۔۔ اب اس میں آگے چل کر فائدہ ہو یا خسارت ہو
اگر کچھ فائدہ ہونا ہی ہوگا لاجرم ہوگا ۔۔۔ حسد ہو کس لیئے اور کیوں کسی کو رشک و غبطت ہو
پونہچتا ہے ہر اک کو جس قدر جس کا مقدر ہے ۔۔۔ موافق چاہیئے تقدیر۔ ہو تدبیر یا مت ہو
وگر نقصاں خدا ناخواستہ قسمت میں لکھا ہے ۔۔۔ اُسے برداشت کرنے کی الٰہی مجکو ہمت ہو
ولیکن یہ نہ ہو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں ۔۔۔ مجھے آجائے مرگِ ناگہاں گر ایسی نوبت ہو
مسلمانوں کو بھی توفیق دے یارب کہ گھر گھر میں ۔۔۔ تجارت ہو تجارت ہو تجارت ہو تجارت ہو

لیکن نقصان دیکھ کر تجارت کی دلدل میں سے نکلنے کی جتنی کوشش کرتے تھے اور باہر آنے کے لیئے جتنے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اُتنے ہی اندر کو اُترتے چلے جاتے تھے۔ تجارت کے تعلق سے مولانا کی داد وستد کا معاملہ عرصہ دراز تک ایک رازِ سربستہ رہا یہاں تک کہ اُن کے عزیزوں کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ مگر جب آئے دن کے خسارے معلوم ہوئے تو سارا حال کھل پڑا تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک لاکھ کا اس طرح نقصان اُٹھایا ہی اور اب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے سے زیادہ معرضِ خطر میں ہی۔

اصل حقیقت یہ ہی کہ تجارت ایک جداگانہ فن ہی۔ ادیب، فاضل و لکچرار و لیڈر ہونا اَور بات ہی اور لوگوں کے پھندوں میں نہ پھنسنا اَور بات ہی ع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ پنجابیوں کے لونڈے جن کی گھٹّی میں تجارت پڑی ہوئی ہی آج دیکھیے تو دہلی کے چاندنی چوک میں "وہ کبس ہی دیا سلائی کا ایک پیسے کو" پکارتے پھرتے ہیں۔ کل بساطی کی چھوٹی سی دکان لیئے بیٹھے ہیں اور برس دو برس نہیں گزرنے پائے کہ پر پرزے جھاڑ کر درست ہوگئے۔ اب دیکھیے تو ایک عالی شان دُکان ہی دکان میں ولایتی سامان بھرا پڑا ہی اور ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا ہی جس پر موٹے موٹے حرفوں سے لکھا ہی حاجی فلاں اینڈ فلاں اینڈ کو الغرض خود غرض دوستوں نے مولانا کو خوب خوب سبز باغ دکھا کر تجارت کی آڑ میں خوب لوٹا۔ اور وہ اس طرح کہ ایک صاحب تشریف لائے اور مولانا سے ربط ضبط بڑھایا۔ تھوڑے دنوں کے بعد تجارت کے نام سے کچھ روپیہ لیا اور اُس کا منافعِ تجارت دو دو چار چار روپیہ روزانہ لاکر دینا شروع کیا مولانا سمجھے کہ چند سیکڑے پر روزانہ اتنا منافع کہاں مل سکتا ہی۔ اسی لالچ میں ایک شخص کو پچاس ہزار روپیہ دیدیا۔ لینے والے نے کچھ دنوں تک تو منافع کی رقم دی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ٹاٹ اُلٹ دیا اب نالش کرتے پھریئے۔ پکڑوایئے۔ جیل خانے بھجوایئے۔ زر دادن و دردِ سر خریدن۔ یکے نقصان مایہ و دیگرے شماتتِ ہمسایہ اسی کا نام ہی۔ ناچار عدالت میں جانا پڑا اور ڈگری کرائی۔ لیکن یہ رقم وصول کیوں کر ہو۔ اپنی کل جائداد تو ٹاٹ اُلٹنے سے پیشتر اپنے اعزہ کے نام لکھوا چکا ہی۔ جب ڈگری کی میعاد گزر گئی تو پھر اُنھیں کو دیکھیے کہ سرِ بازار کیچلی بدل کر دُکان لگائے بیٹھے ہیں۔ باوجود ان نقصانات کے تجارت کا سلسلہ ابھی تک چلا جا رہا ہی۔ ایک دُکان سیونگ مشین کی ہی جس کی آڑھتیں جا بجا بڑے بڑے ضلعوں میں ہیں۔ آثار کہتے ہیں کہ اس میں بھی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

تجارت کے ضمن میں ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہی کہ مولٰنا نے شمسی پریس قائم کیا ہی جس میں صرف اُنھیں کی مصنفہ کتابیں طبع ہوتی ہیں اور اگر ایک آدھ اَور کسی کی کتاب آگئی تو وہ بھی سہی۔ تو اس سے ہماری غرض یہ ہی کہ مولانا اپنے تجارت کے کاروبار کو سمیٹ لیں اور صرف علمی تجارت میں مشغول رہیں۔ ہر کارے و ہر مردے۔ مولٰنا سے اور تجارت سے کچھ سروکار نہیں ہی جو کچھ روپیہ تجارت میں پھیلا پڑا ہی اُس کو سمیٹ کر بینک میں روپیہ جمع کر دیں ورنہ خوف ہی کہ کہیں بقیہ رقم بھی ضائع نہ جائے۔

ایک مرتبہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میاں بشیر کے بچوں کی تعلیم کے لیئے تیس ہزار روپیہ دینے کا ارادہ ہی میں نے عرض کیا ضرور دیجئے اس سے بڑھ کر اَور کوئی مصرفِ خیر نہیں۔ اسی ضمن میں اٹاوہ کے ایک دوسرے البشیر کا ذکر آگیا تو فرمانے لگے کہ مجھے اُس کے غریب سکول کا بھی خیال ہی اور میرا ارادہ ہی کہ میں اُس کو کچھ دوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصّہ پنجم

تصنیف و تالیف و ترجمہ و لکچرز وغیرہ

اس حصّے میں مولٰنا ممدوح کی اُن مصنّفات و مؤلّفات اور تراجم کا مذکور ہو جن کو جناب ممدوح نے اپنی ذاتی خواہش سے بغیر کسی کی فرمایش کے زیب قلم فرمایا ہو۔ حصّۂ دوم میں بعض قانونی تراجم کا حال درج کیا گیا ہو لیکن وہ ترجمے چوں کہ فرمائشی تھے اِس لیے اُن کو حصۂ ہذا میں شامِل نہیں کیا گیا۔

مولٰنا کی تصنیف کی بنیاد سب سے اول اُس وقت پڑی جس وقت وہ ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولٰنا کی اولاد اُس وقت اِس قابل ہوگئی تھی کہ تعلیم کے مکتب میں بٹھائی جائے اور تربیت کے سبق ان کو دیئے جائیں۔ اگر مولٰنا سررشتۂ تعلیم کی ڈپٹی انسپکٹری نہ کئے ہوتے اور ہمارے پُرانے مکتبوں کے بے ترتیب اور بے سر وپا اور بے قاعدہ نصاب کا حال معلوم نہ ہوتا تو تعجب نہیں کہ مولٰنا عام لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو بھی مغلق اور غیر ضروری رسائل کے ڈھرّے پر لگا دیتے۔ جن کے سمجھنے کی قابلیّت بچّوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اپنے بیٹے کو پُرانے نصاب کی جگہ مروجہ اسکولوں کی کتابیں جو تھوڑی بہت باقاعدہ بنائی گئی ہیں پڑھاتے۔ لیکن مولٰنا کا یہ خیال تھا کہ ان سب سے الگ مگر دلچسپ اور مفید اور شگفتہ کتابیں تیار کی جائیں۔ جن سے بچّوں کو نفرت کی جگہ اُلفت اور وحشت کی جگہ دلچسپی پیدا ہو اور کتاب کو شوق سے پڑھیں۔ اس قسم کی کتابوں کو پُرانے مکتبوں میں ڈھونڈا اور موجودہ سرکاری اسکولوں میں تلاش کیا مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ چناں چہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

"اب میرے سب بچے دو بیٹیاں جن میں سے بڑی[1] کے جواں مرگ مرنے کا میرے دل پر داغ ہو اور بیٹا[2] خدا اُس کی

---

[1] اِس لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ مولوی سید احمد حسن صاحب سے منسوب تھیں۔ عین عالمِ شباب میں بمقام لنگسور ملکِ دکن میں ۳۰ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا ۱۲

[2] میاں بشیر یعنی مولوی بشیر الدین احمد صاحب ۱۲۔

عمر دراز کرے اِس قابل ہوئے کہ اُن کو پڑھنا شروع کرایا جائے - بیٹے کے بارے میں تو ابھی وہ طفل رضیع ہی تھا تبھی سے
مَیں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح سے مَیں نے اپنے باپ سے پڑھنا شروع کیا تھا میں اس کو پڑھاؤں گا - رہیں بیٹیاں اُن کے
لیئے قرآن - ترجمۂ قرآن اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل راہ نجات وغیرہ کے سوائے کوئی کتاب ہی نہ تھی - اور
بیٹے کے لیئے بھی سرکاری اسکولوں کی کتابیں تو خاصی تھیں مگر مَیں اُن سے زیادہ شگفتہ کتابیں چاہتا تھا - کہ لڑکے کو پڑھنے
سے وحشت نہ ہو اور اُن کو چاؤ سے پڑھے - ڈھونڈا تلاش کیا کہیں پتہ نہ لگا - ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالت
آپ کتابیں بنانی شروع کیں "

مرأۃ العروس ابھی مولانا نے کسی تصنیف پر قلم نہیں اُٹھایا تھا - البتہ تراجم کرنے کے اتفاقات پے در پے بڑے نام
و نمود کے ساتھ پیش آئے کہ چار دانگ ہندوستان میں شہرت کا ڈنکا پٹ گیا اور جو درحقیقت تصنیف سے زیادہ مشکل اور
دماغ سوز کام تھا - لیکن اب ضرورت ہوئی اپنے بچّوں کی تعلیم کی اور اس طرح کہ شریف خاندانوں کے دستور کے مطابق مولانا
کی لڑکیوں نے بھی قرآن مجید اور اس کے معنی اور اُردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے - گھر
میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا - مولانا دیکھتے تھے کہ مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص
رغبت ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچّوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین اُن کے
پیش نظر رہتے ہیں اُن سے اُن کے دل افسردہ اُن کی طبیعتیں منقبض اور اُن کے ذہن کند ہوتے ہیں یہ دیکھ کر مولانا کو
ایسی کتابوں کی حسبتہً وجہ ہوئی جو اخلاق و نصائح سے لبریز ہوں اور عورتوں کو جو اپنی زندگی میں معاملات پیش آتے ہیں -
اُن کی اصلاح کے قابل کتاب تیار ہو - اُن کے دماغ میں جو توہمات اور جہالت کے خیالات جمے بیٹھے ہیں اُن کے دُور کرنے
کے لیئے کوئی کتاب بنائی جائے تا کہ ان میں تہذیب اور سنجیدگی پیدا ہو کتاب کی طرز بیان دل چسپ ہو اُن کا دل نہ اُکتائے -
اُن کی طبیعت نہ گھبرائے - اِس لیئے مولانا نے اِن سب باتوں کا خیال کر کے مرأۃ العروس تصنیف فرمائی - تصنیف کا سلسلہ
مسلسل نہ تھا کہ از بائے بسم اللہ تا تائے تمت ختم کر کے کتاب حوالے کی گئی ہو - بلکہ سبقاً سبقاً یہ کتاب تصنیف کی جاتی تھی - یعنی
جس وقت ضرورت ہوئی فوراً اپنی بڑی لڑکی کے لیئے آگے کو سبق تصنیف کر دیا گیا - وہ بھی قلم برداشتہ جس وقت یہ سبق ختم
ہو جاتے تو پھر اسی طرح دو دو چار چار صفحے آگے لکھ دیتے - اِن کتابوں کی اُردو ئے معلّٰی ایسی نہ تھی کہ بچوں کو نہ بھاتی اور آب
حیات کا کام نہ دیتی - مولانا فرماتے ہیں " وہ کتابیں بچّوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے
صفحے کے لیئے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لیئے مستعجل تھا - جب دیکھو ایک نہ ایک تقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ
گیا ہے - مَیں اُسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا "

غرض مرأۃ العروس اپنی بڑی لڑکی کے لیئے اس طرح تمام کی اور جب اس لڑکی کی شادی ہوئی تو یہی کتاب اُس کے
جہیز میں دی - اب ہندوستان میں شاید ہی کوئی شریف گھر ایسا ہو گا جہاں لڑکیاں یہ کتاب نہ پڑھتی ہوں - گویا آج تک تمام
لڑکیاں ہمارے مولانا کی بڑی لڑکی کے جہیز سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں -

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب (مرأۃ العروس) " اصغری اکبری " کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ

اِس قصّے میں مفروضہ واقعات درج ہیں لیکن وہ اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ واقعات اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصغری اکبری فرضی نام ہیں۔ ورنہ اصل میں مولانا نے اپنی لڑکیوں کا قصہ لکھا ہے۔ بعض لوگ دہلی میں اصغری اکبری کا مکان ڈھونڈتے ہوئے آ نکلتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ سچ مچ کوئی اصغری اکبری ہو گزری ہیں۔ تمام شریف خاندانوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے لاکھوں کی تعداد میں اِس کے نسخے چھپ چکے ہیں اور برابر چھپتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا خوب بات ہے کہ عورتوں میں مولوی نذیر احمد کی جگہ ہمارے مولانا اکثر "اکبری اصغری والے" پکارے جاتے ہیں۔ یہ خطاب مولانا کو مرآۃ العروس کی وجہ سے ملا ہے۔ ناظرین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اکثر عورتیں مولانا کے نام سے نہیں پہچانتیں۔ اور اگر "اصغری اکبری والے" کہو تو فوراً سمجھ جاتی ہیں کہ مولانا سے مطلب ہے۔

مرآۃ العروس کیوں کر گورنمنٹ تک پہنچی

مولانا ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ دو تین برس ہوئے جب میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلم بند کیا۔ لڑکیوں کو تو اس کا وظیفہ ہو گیا اور ہر روز ختم کتاب کا تقاضا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ برس بعد اصغری کا حال بھی لکھا گیا۔ ہوتے ہوتے اِس کتاب کا چرچا محلے میں ہوا اور چند عورتیں اس کے سُننے کو آئیں جن نے سُنا ریجھ گئی اُونچے اونچے گھروں میں یہ کتاب منگوائی گئی نقل[1] کے ارادے ہوئے۔ جب میں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے اور خوب دل لگا کر پڑھتی ہیں۔ اور جو نہیں پڑھ سکتیں وہ سنتی ہیں تب اس کتاب کو ڈائرکٹر صاحب کے ذریعے سے سرکار میں پیش کیا۔" مصنف کے شان گمان میں بھی نہ تھا کہ مرآۃ العروس ایک عجیب واقعے سے آسمان قدردانی میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گی۔ اور اُس پر ایک ہزار نجوم نچھاور کیے جائیں گے۔ اِس واقعے کی حکایت نہایت دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے۔

کمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع جالون کے ہیڈ کوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ میاں بشیر ٹانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے اُدھر سے نکلے صاحب کو دیکھ کر ٹانگن پر سے اُترے صاحب کو سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو؟

میاں بشیر:- چند پند۔

صاحب:- یہ نام تو ہم نے نہیں سُنا۔

میاں بشیر:- یہ کتاب میرے والد نے میرے لیے بنا دی ہے۔

صاحب:- کتاب کا مضمون کیا ہے؟

میاں بشیر:- بڑی اچھی اچھی نصیحتیں ہیں۔

صاحب:- مجکو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

میاں بشیر:- میں ابھی گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

[1] کہاں جھانسی کہاں مارہرہ لیکن مرآۃ العروس کی مقبولیت کو دیکھئے کہ چھپنے سے قبل بھی اُس کی نقلیں کہاں کہاں تک پہنچیں ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ایک نسخہ میرے کتاب خانے میں بھی موجود ہے۔ یہ کتاب اُس وقت تک گورنمنٹ کے ہاتھوں میں بھی نہیں پہنچی تھی۔ مگر لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی تھی ۱۲۔

تھوڑی دور سے پلٹ کر۔

میاں بشیر! میں بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں۔ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں بڑے مزے مزے کی باتیں ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

میاں بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لاکر صاحب کے حوالے کیا۔ شام کو مولنا جو کچہری سے گھر آئے تو بہن بھائی آپس میں لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ مولنا نے سن کر کہا کیا مضایقہ ہو میں اُن سے بہتر کتابیں بنا دوں گا اگلے دن جو مولنا مکپسن صاحب سے ملے تو شاید انھوں نے ان کتابوں کو کچھ دیکھ بھال لیا ہو گا۔ کہا کہ ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کالپی کو پہنچا دو۔ یہاں مولنا کے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اجیر تھے خوش خط اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ مولنا نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آ گئے۔ چلتی ہوئی جلدیں بندھوا کر صاحب تو پرسوں کو کہہ گئے تھے۔ مولنا نے اگلے ہی دن کتابیں کو پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے مکپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنی طرز مقبول میں پہلی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے۔ اور اس غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ لفٹنٹ گورنر تھے وہی سر ولیم میور جن کی فرمایش سے مولنا نے انکم ٹکس کا ترجمہ کیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے مراۃ العروس کو اَور آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ کی طرف سے بسر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی کیبرج کلاک پر مولنا کا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے۔ اس انعام کے لیئے اول تو مولنا اٹاوے بُلائے گئے تھے لیکن بعد کو اطلاع دی کہ آگرے کے دربار میں انعام عطا ہو گا۔ یہ دربار ۲۶ جنوری ۱۸۶۹ء کو منعقد ہوا تھا۔ بڑے بڑے عہدہ دار ملکی اور فوجی اور بڑے بڑے رئیس بُلائے گئے تھے۔ مراۃ العروس اور اُس کے مصنف کی نسبت دربار میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ یہ تھا۔

"....... مگر ایک اور بڑی مشکل کی بات یہ ہے کہ اردو اَور ہندی زبان میں کتابیں بہت کم ہیں اور بغیر اس کے ممکن نہیں کہ رعایا میں تعلیم و تہذیب اخلاق کا رواج ہو سکے۔ خصوصاً تعلیم نسواں کہ اس کی زیادہ تر حاجت ہے۔ میں ہندوستان کی ترقی اور تہذیب کی طرف سے اس وقت تک نا امید ہوں جب تک کہ اس ملک کی مستورات میں تعلیم نہ ہو۔ پردہ سسٹم کی وجہ سے جہاں اس ملک کی مستورات میں تعلیم کی دقتیں ہیں۔ وہاں ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہندوستانی زبان میں اچھی اچھی کتابیں مطلق نہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے جو کتابیں تصنیف کی جاتی ہیں میں اُن کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ اور اس واسطے میں نے آپ لوگوں کو شہزادے ڈیوک آف اڈنبرا کے تشریف لے جانے کے بعد ٹھیرا رکھا ہے کہ اس دربار میں اس قسم کی تصانیف پر جو قابل انعام ہیں اُن کی عزت اور قدر و منزلت بڑھائی جائے اور اُن پر انعام دیا جائے۔ لیکن ضرور ہے کہ اس امرِ اہم میں اُس بادشاہِ اعظم سے جو علم کا سرچشمہ اور دانائی کا بخشنے والا ہے اعانت چاہی جائے۔ اُس کے نزدیک دشوار آسان اور محال ممکن ہے اور اُس کے حکم سے جو دنیا تاریکی میں ہیں منور ہو جائیں اور جو قومیں جہالت میں پھنسی ہیں علم و نور کی روشنی حاصل کریں جب وہ مدد کرے تو

کچھ اندیشہ نہیں"

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی اِس تقریر کے بعد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے مولنا مولوی نذیر احمد صاحب کو پیش کیا اور جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے پھر یوں خطاب فرمایا۔

"اِس شخص (مولنا نذیر احمد صاحب) کے لئے ایک ہزار روپیہ کا انعام تجویز ہوا ہے کہ اس نے ایک کتاب مرآۃ العروس کے نام سے تصنیف کی جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی راہ و رسم خانہ داری کا ایک بہت خوب قصہ ہے۔ اِس کا لطف یہ ہے کہ دل چسپ ہے اور اُس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو باعصمت اور صاحبِ حیا مستورات کے پڑھنے کے لائق نہ ہو۔ اُس کے ہر صفحہ سے عقل و دانش کی اصلاح اور تہذیب اخلاق اور حسنِ معاشرت کی نصیحت نکلتی ہے۔ محمد نذیر احمد! مجھے نہایت ہی خوشی ہے کہ یہ انعام ہزار روپے کا تمھیں دوں اور اس واسطے کہ تمھاری قدر زیادہ ہو میں اپنی جیبِ خاص سے ایک گھڑی[1] دیتا ہوں جس پر یہ عبارت کندہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری تصنیف کی بابت میری کیا رائے ہے"

کمپسن صاحب نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کتاب کو مفید سمجھ کر گورنمنٹ میں انعام کے لئے پیش کیا۔ بلکہ لاٹ صاحب کے ریویو کے ساتھ اپنا ریویو بھی گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔ ہم اِن دونوں قدردان اور علم دوست حکام کے ریویو درج کیے دیتے ہیں اس سے ہمارا یہ مطلب بھی ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے بالغ نظری سے دیکھا بھی تھا یا نہیں۔

کمپسن صاحب بہادر کا ریویو "مجھکو اس کتاب کے موصول ہونے سے بہت خوشی حاصل ہوئی اس لیے کہ سرکار کے ایک ذی لیاقت اور عالم باستعداد ملازم کی تصنیف ہے مشارٌ الیہ اُن تین ہندوستانی اشخاص میں سے ہے جن کو سر جارج ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر سابق نے چند سال ہوئے اُردو زبان میں انڈین پنل کوڈ کا ترجمہ کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے اِس خدمت کے جلدو میں خلعت حاصل کیا اور اُس وقت سے سررشتۂ مال میں عمدہ عہدوں پر مامور رہے۔

یہ کتاب نہایت دل چسپ اور اس ملک کے باشندوں کے مناسبِ حال ہے۔ آج تک اس قسم کی کتاب کوئی نہیں ہوئی۔ عبارت اور طرزِ بیان کے لحاظ سے زبانِ اردو کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ کتاب مذکور اس باب میں میرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے اور فی الواقع الف لیلہ اور بدرالدین خان دہلوی کی بوستانِ خیال کی اُردو کے ہم پلہ ہے۔ نذیر احمد کی یہ تصنیف روزمرّہ کے پڑھنے کے لائق اور عام فہم ہے اور اس کا مطلب صاف اور عمل کرنے کے قابل ہے۔ اس میں مضامینِ عاشقانہ اور نازک خیالات جن کو اس ملک کے مصنف اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں نہیں ہیں۔ اور مجھکو امید ہے کہ اَور بہت لوگ اس

---

[1] اس کیرج کلاک پر یہ عبارت کندہ تھی

Presented to Mohammad Nazir Ahmad for Sir William Mewar K.C.S.I. L.L.D. Lieutenant Governor N.W.P. 1869 as a private token of approval for his work Mirat-ul-arus.

(ترجمہ) یہ گھڑی ۱۸۶۹ء میں من جانب سر ولیم میور کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی۔ محمد نذیر احمد کو خاص طور پر اُن کی قابلِ پسند تصنیف مرآۃ العروس پر دی گئی" یہ گھڑی بذریعہ ریلوے پارسل بھیجی گئی تھی۔ ریل میں غائب ہو گئی ۱۲۔

اِس مصنّف کی تقلید کرینگے۔ یہ کتاب ظاہرا عورتوں کے فائدے کے لیئے تالیف کی گئی ہے۔ اور اس میں اہل اسلام کے ایک شریف خاندان کا ایک فرضی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کل قصہ شرفا کی زبان روزمرّہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہی اس ملک کی اصل اُردو ہے نہ وہ جس میں نمایش کے لیئے بڑے بڑے الفاظ اور مضامینِ رنگین بھر دیئے جائیں۔ حالات واقعی ایسے لکھے ہیں جو ہر ایک عورت کو سسرال میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اور زنان خانے کے وہ طور وطریق بیان کیئے ہیں کہ جو اہل یورپ اس کو پڑھے گا وہ سب سے اول ہندوستان کی عورتوں کے روزمرّہ کے حالات اس کتاب سے حاصل کریگا۔ عورتوں کی زبان اور اُن کی رغبت اور نفرت اور بچّوں کا لاڈ پیار اور اُمور خانہ داری میں عورتوں کا اختیار اور اُن کی جہالت محض اور حسد اور مکر و فریب یہ سب اِس کتاب سے بخوبی عیاں ہوتے ہیں اور بیان سے کوئی علامت مبالغے کی نہیں پائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے اصلِ حقیقت بیان کی ہے اور قصے کی نصیحت نفس قصے سے نکلتی ہے۔ مشارٌ الیہ کی لیاقتِ علمی مشہور و معروف ہے لیکن اُس نے اِس کتاب میں اُس کے اظہار کا قصد نہیں کیا اور جا بجا جو خیالات اُس نے لکھے ہیں اُن سے صداقت اور طبیعت کی راستی پائی جاتی ہے۔ جن اشخاص کا اِس قصے میں مذکور ہے وہ پڑھنے والے کو ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا اُن کی نقل ہو رہی ہے۔ جہاں تک مَیں جانتا ہوں کسی ہندوستانی مصنف نے اِس سے پہلے بجائے لفّاظی اور مدّاحی کے بات چیت اور گفت و شنید سے اصلِ حقیقت کو ایسا ادا نہیں کیا۔ جس وقت یہ کتاب مشہور ہوئی سیکڑوں آدمی اس کو شوق سے پڑھیں گے اور ممکن نہیں کہ تعلیمِ نسواں کے لیئے فائدہ مند نہو۔"

جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کا ریویو بجانب پرائیوٹ سکرٹری

"جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے کتاب مرآۃ العروس کو ملاحظہ فرمایا اور بہت خوش ہوئے یہ کتاب اس رُتبے کی ہے کہ نواب ممدوح کے نزدیک اُردو میں کوئی کتاب اس کی ثانی نہیں ہے جو تقریظ ڈاکٹر نے لکھی ہے واقع میں یہ کتاب اُس کے لائق ہے حالات بعینہ مثل سرگزشت واقعی کے ہیں اور زبان سلیس اور بلا تصنع ہے۔ اور ہندوستانیوں کی خانہ داری کے معاملات راست راست مطابقِ حقیقت بیان کیئے گئے ہیں اور جن اشخاص کا مذکور اس میں ہے اُن میں سے ہر ایک کی طینت کا حال اس سے جدا جدا ظاہر ہوتا ہے۔ اور جا بجا بلا تصنع دل پر موثر ہونا اور گداز طبیعت پیدا کرنا بھی اس سے پایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک واقعے سے تہذیبِ اخلاق یا حسنِ معاشرت کی ایک نصیحت نکلتی ہے اور یہ بات بھی اِس سے بخوبی روشن ہوتی ہے کہ ہندوستان میں مستورات کو معاملاتِ خانہ داری میں بہت سا دخل ہے اور جب کہ ذہانت اور نیک ذاتی پر اثرِ تعلیم مستزاد ہو تو وہ اختیار نہایت عمدہ نتیجوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ اور یہ ہرگز خیال میں نہیں آتا کہ ہندوستانیوں میں سے کوئی مرد شریف اس کتاب کا مطالعہ کرے اور مستورات کی تعلیم سے جو فوائد بے شمار ہوتے ہیں وہ اس کے دل پر کالنقش فی الحجر نہ ہو جائیں علاوہ بریں اس کتاب میں ایک عجیب وصف یہ ہے کہ ہندوستان کی مستورات کے پڑھنے کے واسطے بہت مناسب ہے۔ ممکن نہیں کہ اُن کو مرغوبِ خاطر نہ ہو اور اُن کی عقل و دانش کی اصلاح نہ کرے اور کسی شریف ہندوستانی کو اپنے خاندان میں اس کتاب کو پڑھانے میں تامّل نکرنا چاہیئے۔ بلکہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اس میں ان کا دل بھی لگے گا اور فائدۂ علمی بھی حاصل ہوگا۔ تمام کتاب میں کوئی مضمون ایسا نہیں جو پاکیزہ اور پیرایۂ تہذیب نہ ہو یا جس سے کسی ایسے قاعدے اور اصول کی تعلیم نہ ہوتی ہو جو خاص کر اہل اسلام کے نزدیک عیب سے بری اور نیکی سے مملو ہے۔ محمد نذیر احمد کی بڑی تعریف اس بات کی ہے کہ اُس نے راستی کی

ل مولانا کی تصانیف پر لفٹنٹ گورنروں یا ڈائرکٹروں کے جتنے ریویو درج ہوئے ہیں وہ اُنھی کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ جن الفاظ اور ترتیب سے اُس کو دستیاب ہوئے بجنسہٖ نقل کر دیئے گئے ہیں۔

جانب ایک نئی راہ نکالی ہے اور سادہ و سلیس عبارت میں تصنیف مفید اور دلچسپ کا نمونہ دوسروں کے واسطے پیدا کردیا ہے۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کو یقین ہے کہ بہت لوگ جلد اس طرز کی تقلید کریں گے۔ جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو ایک نوع خاص کی خوشنودی محمد نذیر احمد کو پورے ایک ہزار روپے کے انعام کے عطا کرنے میں بلکہ از راہ قدر دانی خود اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی جس پر الفاظ مناسب کندہ ہوں گے عطا فرمائیں گے۔ اور امید رکھتے ہیں کہ یہ صلہ محمد نذیر احمد کو کسی مقام پر جو مشارٌ الیہ کے لیئے سہولت کی جگہ ہو یعنی شاید اٹاوہ۔ جب کہ نواب محتشم الیہم کا لشکر اس مقام سے ہو کر گزرے سر دربار عنایت فرمائیں۔

حکم دیا جائے کہ سرکار کے واسطے دو ہزار جلدیں پتھر کے چھاپے کی نہایت پسندیدہ طرز کی جلد مطبوع ہوں۔ اور محمد نذیر احمد کو اجازت ہے کہ اس کتاب کا حق تصنیف حاصل کرے اور اپنی طرف سے اس کو چھپوانے کے لیئے بھی تدابیر مناسب عمل میں لائے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت شہرت پکڑے گی گو اس کی عبارت سادہ و سلیس دیسی زبانوں کے پڑھنے والوں کی نظر میں اولاً بے زینت اور نہی نئی معلوم ہو۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کی دانست میں مناسب ہے کہ اس کتاب کے لیئے صاحبان بورڈ ممتحن کی خدمت میں سفارش کی جائے کہ امتحان میں داخل کرنے کے لائق ہے۔ اس ملک کی عام مروجہ حکایاتِ بے لطف کے مقابل ہیں کہ وہ اکثر قابلِ اعتراض بھی ہیں اس کتاب کے نہایت عمدہ مضامین پڑھنے والوں کو نہ صرف یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ سلیس اور فصیح زبان روزمرہ سے واقفیت حاصل ہو بلکہ امورِ خانہ داری میں بھی بہت واقفیت پیدا ہوگی اور ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو بوجہ اپنے مناصب کے لوگوں سے کام پڑتا ہے اُن کے لیئے پیچیدہ معاملات میں بکار آمد نہ ہو۔"

دونوں صاحبوں کے ریویو کی تنقید

اگرچہ ایک مصنف کی تصنیف پر ایسے بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں کے ریویو ضرور قابلِ فخر ہو سکتے ہیں خاص کر اس صورت میں کہ ایک (لفٹنٹ گورنر بہادر) اُن میں عربی کے بڑے عالم و فاضل اور ادیب ہونے کے علاوہ اُردو بھی جانتے تھے۔ مسلمانوں کے خیالات اور راہ و رسم سے بھی واقف تھے اور دوسرے (ڈائرکٹر صاحب) خیر عربی تو نہیں مگر فارسی اور اُردو میں اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی تقلید و نقل کرتے تھے۔ اِن دونوں صاحبوں نے مرآۃ العروس کو چھپنے کے قبل نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا بھی تھا۔ اور جا بجا دونوں نے نیلی پنسل سے حاشیۂ کتاب پر کچھ یادداشتیں بھی لکھی تھیں۔ جن لوگوں نے اِس عمیق نظر سے مرآۃ العروس کو دیکھا ہو اور اُس پر ریویو کیئے ہوں تو وہ ریویو ضرور قابلِ قدر ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی۔ مگر ڈائرکٹر صاحب بہادر کے ریویو کے ایک خیال نے ہمارے اُوپر یہ راز بالکل منکشف کردیا کہ مادری زبان کے سوا کسی اَور زبان کی بیوٹی یا حسن کی داد صحیح کوئی شخص نہیں دے سکتا۔ یہ بات ڈائرکٹر صاحب کے اس فقرے سے ہم کو معلوم ہوئی کہ "یہ عبارت اور طرز بیان کے لحاظ سے زبانِ اُردو کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ کتاب مذکور (مرآۃ العروس) اِس باب میں مرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے۔ اور فی الواقع الف لیلہ اور بدرالدین خاں دہلوی کی بوستانِ خیال کی اُردو کے ہم پلّہ ہے۔"

اگر ڈائرکٹر صاحب صرف اُردوئے معلّٰی کا ذکر کر کے چھوڑ دیتے تو بھی کچھ مضایقہ نہ تھا۔ مگر بوستانِ خیال یا الف لیلہ کو مرآۃ العروس کے لٹریچر کا ہم پلّہ بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ کمپسن صاحب اُردو کی صحیح بیوٹی کو نہیں سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے مقابلے کے لیئے غلط کتابیں منتخب کیں۔ اگر بوستانِ خیال اور الف لیلہ کے مصنف زندہ ہوتے تو ہم اُن سے

پوچھتے کہ کہئے کیمپسن صاحب کی رائے سے آپ کو اتفاق ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ وہ سنتے ہی برملا کہہ اُٹھتے کہ "وِد کیمپسن صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ ہماری کتابوں کو مولوی نذیر احمد صاحب کی مرأۃ العروس کے مقابلے میں لائے۔ یہ مانا کہ ہماری زبان بھی ٹکسالی ہے۔ وہ تمام خوبیاں جو ایک زبان میں ہونی چاہئیں وہ ہماری کتابوں میں سب موجود ہیں مگر زمانے اور وقت کا بھی آپ کو لحاظ و پاس کرنا چاہیئے تھا۔ ہمارے وقت کی اُردو اور تھی اور اب اُس کا پایہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کے زینے پر چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری کتابوں میں محاوروں اور تشبیہوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ مضامین کتاب بوجھل ہو گئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی اُردو بھی شل ہماری اُردو کے بامحاورہ ہے مگر اُن کی عبارت میں سادگی اور بے تکلفی بہت ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ دہلی کی چند شریف زادیاں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ آورد کا نام نہیں اور ہمارے ہاں اس کی کمی نہیں۔

اب رہے مرزا نوشہ اور اُن کی اُردوے معلّی۔ ہاں اگر لٹریچر کا کوئی کتاب مقابلہ کر سکتی ہے تو بس یہی ایک کتاب ہے مگر افسوس اس کا مقابلہ بھی مرأۃ العروس سے نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک تو اُردوے معلّی میں بھی آورد ہے۔ اور اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تحریر کے مرزا ہی موجد ہیں۔ موجد کو جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ اُن کو بھی آئیں۔ بعض خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی مرزا نے باتیں بنائی ہیں اور نہایت تکلف اور بناوٹ سے اُن باتوں کو قلم بند کیا ہے لیکن یہ داغ بیل انھیں کی ڈالی ہوئی ہے اور ہمارے مولٰنا اُسی داغ بیل پر لٹریچر کے شگوفے کھلا رہے ہیں۔ بہر کیف مرزا نوشہ بڑے اکھل کھرے مزاج کے آدمی تھے اگر وہ زندہ ہوتے اور اُن سے پوچھا جاتا تو بڑی لتاڑ بتاتے اور بڑے کرارے جواب دیتے اور کہتے کہ "تو کیا بتاتا ہے یہ دکھا کہ مجھ سے پہلے یہ روش کس نے اختیار کی۔ کس نے اس کی داغ بیل ڈالی۔" میں عرض کرتا "حضرت نے" وہ فرماتے "پھر میری اُردوئے معلّی سے مرأۃ العروس کا کیا مقابلہ کرتا ہے" میں عرض کرتا کہ "یہ گستاخی ہوئی معاف کیجیے۔ لیکن اِدبا اتنی عرض ہے کہ آپ نے ضرور داغ بیل ڈالی مگر اُس میں شگوفے مولٰنا نذیر احمد صاحب ہی نے کھلائے ہیں۔" وہ یہ سُن کر ذرا کے ذرا چُپ ہو جاتے اور پھر فرماتے۔ ع

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من ست

غرض ڈائرکٹر صاحب اگر مرأۃ العروس کا غلط مقابلہ بوستانِ خیال۔ الف لیلہ۔ اُردوئے معلّٰی سے نہ کرتے تو ہم اتنی اُورقلم فرسائی کیوں کرتے۔ ہمارے نزدیک تو خود مولٰنا نے بھی ڈائرکٹر صاحب کے اسی خیال پر اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ "میں صاحب تصنیف ہوں اگرچہ میں اسے قابلِ فخر نہیں سمجھتا۔ میری کتابوں کے ساتھ سر ولیم میور کی رائے لکھی ہوئی ہے۔ مجھے اِس سے کچھ خوشی نہیں۔ اگر کوئی ادنیٰ زباں داں مسلمان بھی میری کتابوں کو پسند کرے تو میں اُس سے زیادہ خوش ہوتا ہوں۔"

کیمپسن صاحب اور دوسرے لٹریری مین کی مزید قدر افزائی

غرض کیمپسن صاحب نے مرأۃ العروس کو گورنمنٹ میں پونہچایا۔ ایک ہزار روپیہ انعام میں دلوایا۔ دو ہزار جلدیں گورنمنٹ نے خریدیں۔ خود لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی مرحمت کی۔ مصنف کی بھرے دربار عزت افزائی فرمائی۔ یہ سب کیمپسن صاحب کی وجہ سے ہوا۔ لیکن صرف انھیں باتوں پر انھوں نے اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مولٰنا سے درخواست کی

کہ مراۃ العروس کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ مولٰنا نے جواب دیا۔ "میں بھی آپ کا مراۃ العروس بھی آپ کی اور شہرت بھی آپ ہی کی دی ہوئی۔ پھر مجھ سے طلب اجازت فضول۔ شوق سے ترجمہ کیجئے۔ آپ کو اجازت کی ضرورت! ترجمہ کیجئے اور شوق سے ترجمہ کیجئے"۔ بہر حال نہ صرف گورنمنٹ نے اور کیمپسن صاحب نے انعام دلوا کر اور انگریزی میں ترجمہ کر کے کتاب اور صاحب کتاب کی عزت افزائی کی۔ بلکہ انگریزی کے سوا اور لوگوں نے۔ بنگالی۔ گجراتی۔ بھاشا۔ پنجابی۔ کشمیری۔ زبانوں میں مولٰنا کی اجازت سے مراۃ العروس کے ترجمے کئے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ نے رومن میں چھپوایا۔ کیمپسن صاحب کے انتقال کے بعد پادری وارڈ صاحب ایم اے کیمبرج یونیورسٹی نے بھی اس کو رومن میں چھپوایا اور جس طرح کیمپسن صاحب نے توبۃ النصوح کی شرح لکھی تھی پادری صاحب نے بھی اُس کی شرح مع ترجمہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی۔

ترجمہ کرنا اور چھپوانا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ہر زبان کے انشا پردازوں نے مراۃ العروس کو پسند کیا اور اس کی ضرورت سمجھی۔ اس کے سوا مولٰنا نے اگرچہ مراۃ العروس کی باضابطہ رجسٹری کرا دی تھی مگر کتب فروشوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی بلکہ چوری سے بلا اجازتِ مصنف ہزار ہا جلدیں چھاپ ڈالیں اور ابھی تک چھاپتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس خیال سے مولٰنا خاموش رہے کہ شہرت بجائے خود صلۂ عظیم ہے۔

نواب محسن الملک بہادر مراۃ العروس کی ہنسی اڑاتے ہیں

ہنسی کی تو کوئی بات اس وقت تک سمجھ میں آئی نہیں۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مرحوم اس کتاب پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ ہندوستانی سوسائٹی بہت ہی پستی کی حالت میں دکھائی ہے۔ مثلاً زردے میں زعفران کی جگہ ہار سنگار کی ڈنڈیوں کا استعمال کرنا۔ لیکن یہ کوئی اعتراض میں اعتراض نہیں۔ ہر ملک میں ہر درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہمارے مولٰنا نے بھی انھیں لوگوں کو لیا ہے۔ ان کے لیئے اس سے بہتر نمونہ خوش سلیقگی ہو نہیں سکتا۔ اور اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ مراۃ العروس سے بہتر آج تک عورتوں کے متعلق ہندوستان میں کوئی کتاب نہیں تصنیف ہوئی۔ نواب صاحب کی ہنسی اڑانے کے متعلق مولٰنا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں وہ۔ "میں نے مولوی مہدی علی کو نو عمری صرف ایک بار آگرے میں دیکھا جن دنوں مجکو انعام مراۃ العروس کا اٹاوہ میں ملنے والا تھا۔ مولوی مہدی علی ڈیوک آف اڈنبرا سے ملنے کلکتے گئے۔ وہیں سے مجکو بلا تعارف بڑے تپاک کا خط لکھا اور بہت اصرار کیا کہ اٹاوے میں میرے مکان پر ٹھیرنا۔ چناں چہ میں ریل سے اترا۔ مولوی مہدی علی کے رشتہ دار مجکو کشاں کشاں اپنے گھر لے گئے اور بہت مدارات کی۔ مگر مولوی مہدی علی وہاں نہ تھے۔ لیکن نواب لفٹنٹ گورنر نے مجکو اٹاوے سے واپس کیا اور آگرے کے دربار میں بلایا۔ وہاں منشی غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹی کے ہاں میں نے مولوی مہدی علی کو دیکھا۔ ایک صبیح نوجوان طنبورچیوں کی سی پوشاک بے باک مراۃ العروس کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ جوں ہی میں خیمے میں پونہچا۔ منشی غلام غوث نے کہا۔ لیجئے حضرت مراۃ العروس کے مصنف صاحب بھی تشریف لائے۔ منشی غلام غوث کی تقریب سے ہم دونوں سے تو مولوی مہدی علی کشیدہ سے رہے۔ شاید مراۃ العروس کی ہنسی اڑانے سے جھینپے ہوں۔ مجکو حیرت ہوئی

۱؎ مراۃ العروس چھپنے کے نو برس بعد کیمپسن صاحب نے ترجمے کی خواہش کی تھی۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۷۷ء کو لندن سے انھوں نے مولٰنا کو ایک خط لکھا تھا کہ میں مراۃ العروس کا ترجمہ کر رہا ہوں اور میری میز پر مراۃ العروس۔ توبۃ النصوح۔ اور بنات النعش رکھی ہے ۱۲۔

یا الٰہ العالمین یہ وہی مہدی علی ہی جس نے مجکو کس تپاک سے اپنے گھر ٹھیرایا تھا - کہ اب بالمشافہہ میری کتاب کی مخاصمانہ تفضیح کر رہا ہی"

مولنٰا جب حیدرآباد تشریف لے گئے تو نواب مکرم الدولہ بہادر[2] کو بھی مراۃ العروس کی ایک جلد دی تھی - یہ صاحب صدر المہام مال گزاری تھے سر سالار جنگ مرحوم کے داماد اور بھانجے - انھوں نے بھی ایک اعتراض کیا تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کیسی بد مذاق اور مسرف ہی کہ چند جزوں کی کتاب پر ہزار ہا روپیہ دے ڈالا چاہئے شعر فہمی عالم بالا معلوم شد -

سر سیّد اور مراۃ العروس

شمس العلمار مولنٰا حالی "حیاۃ جاوید" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ "سر سیّد نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیئے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا - یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصوّر کیا اگرچہ ہمارے نزدیک اصلی سبب تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول تو جب سے ان کو مسلمانوں کی سوشل رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے - غدر سے چند روز بعد اُن کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا - اور وہلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی - اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھ کر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہی وہ صرف سُنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی دوسرے ان کے خاندان کی فیمیل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی - اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہی جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں - خود سر سیّد نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اِس خیال کی تردید کی ہی کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں - یہی وجہ تھی - کہ جب مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اُس کو دیکھ کر سر سیّد کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے"

سر سیّد نے مراۃ العروس کی نسبت جو خیال قائم کیا تھا اُس کے صحیح و غلط ہونے کے ثبوت میں ہم مولنٰا حالی کی عبارت کو بالکل کافی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں لکھ سکتے کہ عورتوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ بمقابلہ سر سیّد کے ہمارے مولنٰا کو بہت زیادہ تھا - اور اگر ہمارا یہ خیال غلط ہی تو ناظرین حیاۃ جاوید کا اقتباس مکرر غور سے پڑھ لیں اور بس لوگوں کی عادت ہی کہ کوئی نئی بات کی جائے تو ادبدا کر مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگتے ہیں - عورتوں کی تعلیم کے لیئے مراۃ العروس سے پہلے اِس ڈھنگ کی کوئی اَور دوسری کتاب نہ تھی - یہی وجہ

---

[1] نواب محسن الملک مرحوم کے مزاج میں مذاق تو بھرا تھا - تحقیقات سے معلوم ہوا ہی کہ عورتوں کی بولی کی نقل بنا بنا کر اعتراض کر رہے تھے ۱۲

[2] نواب مکرم الدولہ بہادر کی یہ ذاتی رائے ہوگی - ورنہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام خود بڑی فیاض اور قدردان علم ہی جس کی صدہا مثالیں موجود ہیں - شمس العلمار مولنٰا حالی - شمس العلمار مولنٰا شبلی کے علمی وظائف اسی گورنمنٹ سے جاری ہیں - اور اسی طرح اَور لوگوں کے بھی - خود ہمارے مولنٰا کو اُن رسالوں کی وجہ سے جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے واسطے لکھے تھے دو سو روپے ماہوار پنشن میں شامل ہو کر ملتے ہیں ۱۲ -

ہے کہ بعض لوگوں کو بعض باتیں ناگوار ہوئیں۔ ابھی دو تین برس ہوئے کہ "تہذیب نسواں" میں سلطانہ بیگم نے ایک مضمون دہلی سے لکھا تھا کہ دہلی مشن اسکول میں پردہ پارٹی دی گئی تھی جس میں مرآۃ العروس کا ایکٹ بھی کیا گیا تھا۔ ایک لڑکی اصغری جیسی سگھڑ بنی تھی اور دوسری اکبری جیسی پھوہڑ۔ اِس ایکٹ میں یہ بات ثابت کی گئی تھی کہ مرآۃ العروس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں خانہ داری کی بہت پست حالت ہے اور اُن کی خانہ داری کے اُصول تہذیب سے بہت زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ اور مرآۃ العروس میں بھی مسلمانوں کے گھروں کی ہجو کی گئی ہے۔ اور بہت کچھ خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ اُس میں مسلمانوں کے گھروں کا اس قدر بُرا نمونہ دکھایا گیا ہے جس سے غیر قوموں کی نظروں میں مسلمان عورتیں ذلیل اور حقیر دکھائی دیتی ہیں یہ اور دوسری قسم کے اعتراض سے چشم بد اندیش کہ برکندہ باد ﴿ عیب نماید ہنرش در نظر ﴾ کی قسم کے ہیں۔

اِس اعتراض پر جتنا غور کرو اُتنا ہی بودا اور پھسپھسا معلوم ہوتا ہے۔ جب تک نیک و بد کا مقابلہ نہ کیا جائے دونوں میں فرق کیوں کر معلوم ہوگا۔ کالے اور گورے۔ خوب صورت اور بد صورت۔ امیر اور غریب۔ عالم اور جاہل۔ نیک مزاج۔ اور بد مزاج سگھڑ اور پھوہڑ۔ جب تک اِن کو پہلو بہ پہلو نہ دکھایا جائے اور جب تک دونوں کی اصلی حالت نہ دکھائی جائے۔ دونوں کی بھلائی بُرائی میں کیوں کر تمیز ہو سکتی ہے۔ بُرائی کی بُرائی دکھا کر بھلائی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جب تک اکبری کی بدسلیقگی نہ دکھائی جاتی اصغری کا سگھڑ پنا کیوں کر قابلِ قدر ہوتا۔ مولانا نے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کی ہمیشہ اخلاقی نمونے اِسی پیرایے میں دکھائے جاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے گھرانوں کی ایسی ردی اور پست حالت دکھائی گئی ہے جس سے اُن کی ذلت ہے۔ اِس کا جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کون سی قوم ہے جس میں اچھے بُرے نہیں ہوتے۔ آخر اصغری جیسی سگھڑ بھی تو مسلمانوں ہی کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اگر ایک کو اعلیٰ درجے کا سلیقہ مند اور دوسری کو اُس کے خلاف نہ بنایا جاتا تو پھر قصے کا لطف ہی کیا باقی رہتا۔ اور مقصودِ نصیحت کس طرح حاصل ہوتا۔

مرآۃ العروس کے تتبع میں کتابوں کا لکھا جانا

اہلِ قلم کو جب مرآۃ العروس کے انعام کا حال معلوم ہوا۔ تو بہت کچھ قلم فرسائی کی گئی۔ لیکن اُس کی عزت اور منزلت کو کوئی کتاب نہیں پہنچی۔ مرآۃ النساء۔ مفید النساء۔ زینت العروس۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب مرآۃ العروس کے اتباع میں لکھی گئیں۔ مگر اُن کا حال کیا ہوا ہوگا۔ یہی نا کہ پہلا اڈیشن بھی ابھی تک پڑا سڑ رہا ہوگا اور مرآۃ العروس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ع "ایں ہمہ تمکین و فضیلت بگزشت از ہمہ چیز" باوجودے کہ مرآۃ العروس کی رجسٹری ہو چکی تھی مگر لوگوں نے بے پوچھے گچھے چھاپ چھاپ کر بیچنا شروع کیا۔ اور آج تک اس کی یہی حالت ہے کہ لوگ چھاپتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔

حیاۃ النذیر کی تالیف کے زمانے میں ہم نے ایک مثنوی دیکھی جس کا نام زینت العروس[1] تھا۔ مثنوی دیکھتے ہی ہم کو یہ بات کھٹکی تھی کہ مصنف مثنوی نے مرآۃ العروس کے جسم سے نثر کا لباس اُتار کر نظم کا زیور پہنایا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب ہوا کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم اڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اِس مثنوی پر اپنے اخبار میں ریویو کرتے ہوئے یہ بات ظاہر نہیں کی۔ منشی محمد عبد اللہ علم مصنف مثنوی نے مثنوی کے دیباچے میں اگرچہ یہ شعر لکھے ہیں۔

---

[1] اِس نام کی ایک کتاب اس سے بہت قبل خان بہادر مولوی عبد الحامد خاں صاحب کی چھپی ہوئی موجود ہے ۱۲

جناب نذیر احمد دہلوی ؒ ہیں تصنیف میں جن کی شہرت بڑی انھیں کا تھا یہ کام وہ کر چکے بصد حسن اتمام وہ کر چکے
ہیں ذرّے سے کم تر وہ ہیں آفتاب وہ ہیں نور اعلیٰ یہ بندہ حجاب وہ ہیں علم و فن کے لیئے افتخار میں ہوں علم و فن کے لیئے ننگ و عار
مجھے اُن سے کوئی بھی نسبت نہیں تصنّع کی بندے کو عادت نہیں کہی ہے یہ اک جوش میں مثنوی خدا جانے اچھی لکھی یا بُری

مثنوی زینت العروس کے دیباچے میں سے ہم نے یہ چند شعر اس لیئے نقل کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مرآۃ العروس کا اس میں کہیں نام نہیں لیا گیا۔ بلکہ ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرآۃ العروس سے اس مثنوی کو کوئی تعلق نہیں مثنوی میں جن خیالات کو نظم کیا گیا ہے وہ صاحب مثنوی کے ذاتی خیالات ہیں۔ مولٰنا نے ایک مقام پر بالکل سچ فرمایا ہے کہ لوگ لباس بدل بدل کر میری تصنیفات سے فائدہ اُٹھایا کرتے ہیں۔ اگر منشی محمد عبداللہ صاحب علم مولٰنا سے مرآۃ العروس کے نظم کرنے کی اجازت مانگتے تو مولٰنا کبھی انکار نہ فرماتے اور اس طرح ہونے سے زینت العروس کی اَور زینت بڑھ جاتی۔ اب ہم منشی محمد عبداللہ صاحب علم کو تو نہیں مگر منشی رحمت اللہ صاحب رعد کو مشورہ دیتے ہیں کہ مولٰنا کی اجازت سے مرآۃ العروس با تصویر چھاپیں۔ بشرطیکہ مصوّری وہ اپنے ہاتھ سے کریں ؎

نمونہ مرآۃ العروس

بہر حال ہم نے جتنے بھی اعتراض سُنے وہ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی گلستاں پر اعتراض کرے کہ ایسی لاجواب کتاب میں باب پنجم در عشق و جوانی کیسا۔ اور یہ اعتراض کر کے سعدی کی ہنسی اڑائے ناظرین کو اب ہم مرآۃ العروس کا نمونہ دکھاتے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ منتخب نہیں کیا گیا ہے بلکہ بطور فال کے کتاب کھولی گئی تو ذیل کا مضمون نکلا۔ جب راقم نے حیاۃ النذیر کا میٹیریل جمع کرنا شروع کیا تو یہ بات ذہن میں آئی تھی کہ مولٰنا کی کل تصانیف میں سے اُن کے ماسٹر پیس انتخاب کر کے کتاب میں درج کر دیئے جائیں۔ لیکن تمام تصانیف کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اُس میں کوئی خاص مضمون منتخب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کل تصنیف بجائے خود ایک انتخاب ہے۔ اس لیئے راقم نے فال کا طریقہ اختیار کیا آنکھ بند کر کے کتاب کو کھولا اور اس طرح جو مضمون نکلا وہ درج حیاۃ کر دیا گیا۔ مولٰنا کی اَور تصانیف کے نمونے بھی اگر ضرورت ہوئی تو دکھائے جائیں گے مگر اُن کا اقتباس بھی بطور فال کے ہوگا تاکہ لوگوں کو یہ شبہ جاتا رہے کہ خصوصیت کے ساتھ انتخاب کیئے ہوئے نمونے درج کیئے ہیں

بیاہی ہوئی لڑکیوں کے لیئے عمدہ نصیحت

اصغری کے نام شادی ہو جانے کے بعد دوراندیش خاں نے جو خط لکھا دیکھنے کے لائق ہے اتّفاق سے ہم کو اُس کی نقل ہاتھ آگئی تھی وہ خط یہ ہے۔

آرام دل و جانم برخوردار اصغری خانم سلمہا اللہ تعالیٰ۔ دعا اور اشتیاق و دیدہ بوسی کے بعد واضح ہو تمھارے بھائی خیر اندیش خاں کے لکھنے سے تمھاری رخصت کا حال معلوم ہوا۔ برسوں سے یہ تمنا دل میں تھی کہ اس فرض کو میں اپنے اہتمام خاص سے ادا کروں۔ مگر حاکم نے رخصت نہ دی مجبور رہا۔ یہ بات تم پر ظاہر ہوئی ہوگی کہ سب بچوں میں تم سے مجھکو ایک خاص طرح کا اُنس تھا۔ اور میں اس بات کو بطور احسان نہیں لکھتا۔ بلکہ تم نے اپنی خدمت گزاری اور فرماں برداری سے خود میرے اور سب کے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ آٹھ برس کی عمر سے تم نے میرے گھر کا تمام بوجھ اپنے سر پر اُٹھا رکھا تھا مجھکو ہمیشہ یہ بات معلوم ہوتی رہتی کہ تمھارے سبب بیگم یعنی تمھاری ماں کو بڑی بے فکری حاصل ہے۔ جب کبھی اس اثنا میں مجھکو گھر جانے کا اتّفاق ہوا تو انتظام دیکھ کر ہمیشہ

میرا جی خوش ہوا۔ اب تمہاری رخصت ہوجانے سے ایسا نقصان ہوا کہ اُس کی تلافی شاید اس عمر میں ہونے کی مجکو امید نہیں ہو سکتی خدا تم کو جزائے خیر دے اور اس خدمت کے صلے میں میری دعاؤں کا اثر تم پر ظاہر ہو۔ خیر اندیش خاں کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے اکبری خانم سے زیادہ جہیز نہیں لینا چاہا۔ اِس سے تمھاری بلند نظری اور عالی ہمتی ثابت ہوتی ہے۔ مگر میں اس کا نعم البدل بھیجتا ہوں وہ یہ خط ہے اس کو تم بطور دستور العمل کے اپنے پاس رکھو اور ان نصیحتوں پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ تعالی ہر ایک مشکل تم پر آسان ہو گی اور اپنی زندگی آرام و آسایش میں بسر کرو گی سمجھنا چاہیئے کہ بیاہ کیا چیز ہے۔ بیاہ صرف یہی بات نہیں ہے کہ رنگین کپڑے پہنے۔ مہمان جمع ہوئے۔ مال و اسباب و زیور پایا۔ بلکہ بیاہ سے نئی دنیا شروع ہوتی ہے نئے لوگوں سے معاملہ کرنا اور نئے گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ جس طرح پہلے پہل بچھڑوں پر جوا رکھا جاتا ہے آدمی کے بچھڑوں کا جوا بیاہ ہے۔ نکاح ہوا۔ لڑکی بی بی بنی۔ لڑکا میاں بنا۔ اِس کے یہی معنی ہیں کہ دونوں کو پکڑ کر دنیا کی گاڑی میں جوت دیا۔ اب یہ گاڑی قبر کی منزل تک ان کو کھینچنی پڑے گی۔ پس بہتر یہ ہے کہ دل کو مضبوط کر کے اِس مہم کا سرانجام کیا جائے۔ اور زندگی کے دن جبقدر رہوں عزت آبرو صلح کاری اتفاق سے کاٹ دیئے جائیں۔ ورنہ لڑائی بھڑائی۔ جھگڑے بکھیڑے شور و شر فساد۔ اور رو اویلا سے دنیا کی مصیبت اَور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اَب تم کو اَی میری پیاری بیٹی اصغری خانم سوچنا چاہیئے کہ میاں بی بی میں خدا نے کتنا فرق رکھا ہے۔ مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم بہشت میں اکیلے گھبرایا کرتے تھے۔ اِن کے بہلانے کو خدا نے ماما حوا کو جو سب سے پہلی عورت دنیا میں ہو گزری ہیں پیدا کیا۔ پس عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا۔ اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔ افسوس ہے کہ دنیا میں کس قدر کم عورتیں اس فرض کو ادا کرتی ہیں۔ مردوں کا درجہ خدا نے عورتوں پر زیادہ کیا نہ صرف حکم دینے سے بلکہ مردوں کے جسم میں زیادہ قوت اور اُن کی عقلوں میں زیادہ روشنی دی ہے۔ دنیا کا بندوبست مردوں کی ذات سے ہوتا ہے۔ مرد کمانے والے اور عورتیں اُن کی کمائی کو موقع مناسب پر خرچ کرنے والیاں اور اُس کی نگہبان ہیں۔ کنبہ بطور کشتی کے ہے اور مرد اُس کے ملاح ہیں۔ اگر ملاح نہ ہو تو کشتی پانی کی موجوں میں ڈوب جائے گی۔ یا کسی کنارے پر ٹکر کھا کر پھٹ پڑے گی کنبے میں اگر مرد منتظم نہیں تو اس میں ہر ایک طرح کی خرابی کا احتمال ہے۔ کبھی نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ دنیا میں خوشی صرف دولت سے حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ دولت اکثر خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ بہت بڑے اونچے گھروں میں لڑائی اور فساد ہم زیادہ پاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صرف دولت سے تو خوشی نہیں ہوتی۔ برخلاف اِس کے اکثر خانہ داری میں خوشی صرف اتفاق و صلح کاری سے ہوتی ہے غریب آدمیوں کو ہم دیکھتے ہیں جن کی آمدنی نہایت مختصر ہے۔ دن کو محنت مزدوری سے معاش پیدا کرتے رات کو سب مل کر دال روٹی سے پیٹ بھر لیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ بے شک یہ لوگ صلح کاری کے سبب دال روٹی اور گاڑھے دھوتر میں زیادہ آرام سے ہیں بہ نسبت نوابوں اور بیگموں کے جن کا تمام عیش آپس کی ناسازگاری سے تلخ رہتا ہے۔ اَی میری پیاری بیٹی صغری خانم اتفاق پیدا کرو اور صلح کاری کو غنیمت جانو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اتفاق کن باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ صرف اِس بات سے کہ بی بی اپنے میاں سے محبت کرے بلکہ محبت کے علاوہ اس کو میاں کا ادب کرنا بھی لازم ہے۔ بڑی نادانی ہے اگر بی بی میاں کو برابر کے درجے میں سمجھے۔ بلکہ اس زمانے میں عورتوں نے ایسا خراب دستور اختیار کیا ہے کہ ادب کے بالکل خلاف ہے۔ جب چند سہیلیاں آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں تو اکثر یہ تذکرہ ہوتا ہے کہ فلانی کا میاں اُس کے ساتھ کس طرح کا برتاو رکھتا ہے۔ ایک کہتی ہے کو اَیئی سنے تو

یہاں تک اُن کو دبایا ہی کیا مجال جو میری بات کو کاٹیں یا اُلٹ کر جواب دیں۔ دوسری فخر کرتی ہی جب تک گھڑیوں خوشامد کریں
میں کھانا نہیں کھاتی۔ تیسری بڑائی مارتی ہی ہیں تو دس مرتبے پوچھتے ہیں تب ایک جواب مشکل سے دیتی ہوں۔ چوتھی ڈینگ
لیتی ہی چاہے وہ پہروں نیچے بیٹھے رہیں بندی کو پلنگ سے اُترنا قسم ہی۔ پانچویں شیخی بگھارتی ہی جو میری زبان سے نکلتا
ہی پورا کر کے رہتی ہوں۔ شادی بیاہ میں ٹونے ٹوٹکے بھی اسی غرض سے نکلے ہیں کہ میاں مطیع و فرماں بردار رہے۔ کہیں تو
دلہن کی جوتی پر کاجل پار کے میاں کے سُرمہ لگایا جاتا ہی اس کا یہ مطلب ہی کہ عمر بھر جوتیاں کھاتا رہے اور چوں نہ کرے۔ کہیں نہاتے
وقت دلہن کے پاؤں کے انگوٹھے کے تلے بیڑا رکھا جاتا ہی اور میاں کو کھلایا جاتا ہی اس کے یہ معنی کہ پیروں پڑتا رہے۔ اِن
باتوں سے صاف ظاہر ہی کہ عورتیں مردوں کا درجہ اور اختیار کم کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ تعلیم بہت بُری تعلیم ہی اور ہرگز اس کا
نتیجہ قباحت سے خالی نہیں۔ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہی اگر دباؤ اور زبردستی سے کوئی اُن کو زیر کرنا چاہے ناممکن ہی بہت آسان
ترکیب اِن کو زیر کرنے کی خوشامد اور تابع داری ہی۔ اور جو احمق عورت اپنا دباؤ ڈال کر مرد کو زیر کرنا چاہتی ہی وہ بڑی غلطی میں ہی
وہ شروع سے تخمِ فساد بوتی ہی اور اس کام کا انجام ضرور فساد ہوگا اگرچہ وہ اس کو بالفعل نہیں سمجھتی۔ اصغری خانم! میری
صلاح یہ ہی کہ تم گفت و گو اور نشست و برخاست میں بھی اپنے میاں کا ادب ملحوظ رکھنا۔ مذہب میں میاں بی بی کے متعلق بہت
احکام ہیں اور چوں کہ تم نے قرآن کا ترجمہ اور اُردو کے بہت سے مذہبی رسالے پڑھے ہیں میں اُمید کرتا ہوں وہ احکام تھوڑے
بہت ضرور تمھارے خیال میں ہوں گے۔ اُن احکام کا مجموعہ خانہ داری کے لئے بڑا دستور العمل ہی مگر افسوس ہی لوگ خدا رسول کے
حکموں کی تعمیل میں تن دہی نہیں کرتے اور اسی سے انواع و اقسام کی خرابیاں پیش آتی ہیں۔ میں نے حدیث کی کتاب میں پڑھا
تھا کہ اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو پیغمبر صاحب فرماتے ہیں کہ میں بی بی کو حکم دیتا کہ اپنے میاں کو سجدہ کیا
کرے۔ پس اسی ایک بات سے تم خیال کر سکتی ہو کہ میاں اور بی بی میں کیا نسبت ہی۔ اب اِس کے ساتھ ملکی رواج کو ملاؤ کہ بی بی
نہ تو میاں کو چھوڑ سکتی نہ بدل سکتی نہ اُس سے کسی وقت اور کسی حال میں بے نیاز ہو سکتی۔ تو سوائے اِس کے کہ سچے دل سے آپ
اُس کی ہو رہے اور اطاعت سے خوشامد سے جس طرح ممکن ہو اُس کو اپنا کرلے عافیت کی۔ عزت و آبرو کی۔ دوسری کوئی تدبیر نہ ہی
اور نہ ہونی ممکن ہی۔ کیا وجہ کہ شادی بیاہ ایسے چاؤ سے ہوتا ہی اور چوتھی کے بعد ہی بہو سے ساس نندوں کا بگاڑ شروع ہو جاتا
ہی یہ مضمون غور کے قابل ہی۔ بیاہ کے پہلے تک لڑکا ماں باپ میں رہا اور صرف انھیں کے ساتھ اُس کو تعلق تھا۔ ماں باپ نے
اُس کو پرورش کیا اور یہ توقع کرتے رہے کہ بڑھاپے میں ہماری خدمت کرے گا۔ بیاہ کے بعد بہو ڈولی سے اُترتے ہی یہ فکر
کرنے لگتی ہی کہ میاں آج ماں باپ کو چھوڑ دیں پس لڑائی ہمیشہ بہوؤں کی طرف سے شروع ہوتی ہی۔ اگر بہو کنبے میں مل کر رہے اور کبھی
ساس کو نہ معلوم ہو کہ بیٹے کو ہم سے چھڑانا چاہتی ہی تو ہرگز فساد نہ پیدا ہو۔ یہ تو سب کوئی جانتا ہی کہ بیاہ کے بعد ماں باپ کے ساتھ تعلق
چند روزہ ہی آخر گھر الگ ہوگا میاں بی بی جدا ہو کر رہیں گے۔ دنیا میں یہی ہوتی آئی ہی۔ لیکن نہیں معلوم کم بخت بہوؤں کو بے صبری
کہاں کی پڑ جاتی ہی کہ جو کچھ ہونا ہو اسی دم ہو جائے۔ بہوؤں میں ایک عیب چغلی کا ہوتا ہی جو بنیادِ فساد ہی۔ وہ یہ کہ سسرال کی ذرا ذرا
بات آ کر ماں سے لگاتی ہیں اور مائیں خود بھی کھود کھود کر پوچھا کرتی ہیں۔ لیکن اس کہنے اور پوچھنے سے سوائے اِس کے کہ لڑائیاں
پڑیں اور جھگڑے کھڑے ہوں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بعض بہوویں اس طرح کی مغرور ہوتی ہیں کہ سسرال میں کیسا ہی اچھا کھانا

اور کیسا ہی اچھا کپڑا اُن کو ملے ہمیشہ نظر حقارت سے دیکھتی ہیں ایسی باتوں سے میاں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ صغریٰ اس کی تم کو بہت احتیاط چاہیئے سسرال کی ہر ایک چیز قابل قدر ہے اور تم کو ہمیشہ کھانا اور کپڑا پہن کر بشاشت ظاہر کرنی چاہیئے جس سے معلوم ہو کہ تم نے پسند کیا۔ نئی دُلہن کو اس کا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیئے کہ سسرال میں بے دلی سے نہ رہے اگرچہ اُوپری ہونے کے سبب سے البتہ اجنبی لوگوں میں جی نہیں لگتا لیکن جی کو سمجھانا چاہیئے نہ یہ کہ روتے گئے وہاں رہے تو روتے رہے آتے دیر نہیں ہوئی آنے کا تقاضا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اُنس پیدا کرنے کے واسطے چاولوں کا رواج بہت پسندیدہ ہے اس سے زیادہ میکے کا شوق ظاہر کرنا سسرال والوں کو ضرور ناپسند ہوتا ہے گفتگو میں درجۂ اوسط ملحوظ رہے یعنی نہ اتنی بہت کہ خود بخود بک بک اتنی کم کہ غرور سمجھا جائے بہت بکنے کا انجام رنجش ہوتا ہے جب بات دن کی بکواس ہو گی ہزاروں طرح کا تذکرہ ہوگا نہیں معلوم کس کس ذکر میں کیا بات مونھ سے نکل جائے نہ اتنی کم گوئی اختیار کرنی چاہیئے کہ بولنے کے واسطے لوگ خوشامد اور منت کریں ضد اور اصرار کسی بات پر زیبا نہیں اگر کوئی بات تمھاری مرضی کے خلاف بھی ہو اُس وقت ملتوی رکھو پھر کسی دوسرے وقت بطرز مناسب طے ہو سکتی ہے فرمایش کسی چیز کی نہ کرنی چاہیئے فرمایش کرنے سے آدمی نظروں میں گھٹ جاتا اور اُس کی بات ہیٹی پڑ جاتی ہے جو کام ساس نندیں کرتی ہیں تم کو اپنے ہاتھوں سے کرنا عار نہ سمجھنا چاہیئے چھوٹوں پر مہربانی۔ اور بڑوں کا ادب ہر دل عزیز ہونے کے واسطے بڑی عمدہ تدبیر ہے۔ اپنا کوئی کام دوسروں کے ذمّے نہیں رکھنا چاہیئے۔ اور اپنی کسی چیز کو بے خبری سے پڑا نہ رہنے دو کہ دوسرے اُس کو اُٹھا لیں گے۔ جب دو آدمی چھپکے چھپکے باتیں کریں اُن سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے پھر اُس کی تفتیش بھی مت کرو کہ یہ آپس میں کیا کہتے تھے اور خواہ مخواہ یہ بھی مت سمجھو کہ کچھ ہمارا ہی تذکرہ تھا۔ اپنا معاملہ شروع سے ادب لحاظ کے ساتھ رکھو۔ جن لوگوں میں بہت جلد نہایت درجے کا اختلاط پیدا ہو جاتا ہے اُسی قدر جلد اُن میں رنجش پیدا ہونے لگتی ہے فقط میں چاہتا ہوں کہ تم ہر روز بلا ضرورت بھی اس خط کو کم سے کم ایک دفعہ پڑھ لیا کرو تاکہ اس کا مطلب پیش نظر رہے۔ والدعا

حررہ دور اندیش خان۔

منتخب الحکایات یہ وہ کتاب ہے جس کو مولنٰنا نے اپنی چھوٹی صاحبزادی کے لیے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس قسم کی کتابیں اردو میں اَور بھی ہیں۔ لیکن اُن میں اور اس میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ منتخب الحکایات میں بے معنی اور لاحاصل کہانیاں نہیں ہیں۔ ہر ایک حکایت نہایت دلچسپ ہے۔ بچے اس سے خوش بھی ہوتے ہیں اور نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ۴۵ حکایتیں ہیں بعض حکایتیں ایسپ فیبلز سے بھی لی گئی ہیں۔ کتاب میں نئی اور مفید بات یہ ہے کہ ہر ایک حکایت سے ایک نتیجہ نصیحت نکالا گیا ہے جو تحت حکایت میں حاصل کے عنوان سے درج ہے۔ بعض حکایتیں دل سے بھی گھڑی ہوئی ہیں اور بعض سچی ہیں منتخب الحکایات میں مولنٰنا نے ایک حکایت پنجابی کٹڑے کی مسجد کے ایک طالب علم کی لکھی ہے وہ یہ ہے۔

"ایک طالب علم پنجابی کٹڑے کی مسجد میں بے قدری کے ساتھ رہتا تھا۔ نہ تو لنگر کی روٹیوں میں سے اُس کو حصہ ملتا۔ نہ دعوت میں کوئی اُس کو ساتھ لے جاتا۔ نہ کسی جگہ اُس کا کھانا مقرر تھا۔ پس بے چارہ ہمیشہ بھوکا رہا کرتا۔ ایک روز کوئی بڑا موٹا پنجابی مرا اور اُس کا جنازہ نماز کے واسطے مسجد میں لائے۔ اُس طالب علم نے دور سے دیکھ کر پہلے تو جانا کہ روٹیوں کا خوان آیا حصّہ لینے کی اُمید سے دوڑا حوض کے پاس جا کر معلوم ہوا کہ جنازہ ہے۔ بے چارہ نا اُمید ہو کر لوگوں سے پوچھنے لگا کیوں جی کون مر گیا؟ لوگوں نے کہا ارے میاں تم نے نہیں سُنا فلاں سوداگر مر گیا۔ طالب علم نے پوچھا کہ کیا کچھ بیمار رہتے تھے؟ لوگوں نے کہا نہیں تو کل تک بھلے چنگے تھے رات خاصی طرح اسی مسجد میں عشا کی نماز پڑھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تختہ کیا۔ طالب علم نے پوچھا

تخمہ کیا؟ لوگوں نے کہا بدہضمی کا ہیضہ جو بہت کھانا کھا جانے سے ہو جاتا ہی۔ طالب علم نے کہا آہا یہ مرض مبارک ہم کو کبھی نہیں ہوتا

حاصل دنیا کی تکلیفیں آدمی کو موت پر دلیر کر دیتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکایت آپ بیتی ہی یعنی مولنا پر خود ایسا واقعہ گزرا ہی۔ اور یہ صرف اس بنیاد پر بیان کیا جاتا ہی کہ مولنا پنجابی کٹڑے کی مسجد میں رہا کرتے تھے اور کھانے پینے کی طرف سے وہاں ان پر بہت تنگی تھی۔ لیکن اگر یہ واقعہ خود مولنا کی ذات پر گزرتا تو وہ ضرور کہیں نہ کہیں اس کو بیان کر دیتے۔ ہم کو مولنا کے بہت سے واقعات اُن کی تصانیف میں ایسے ملے ہیں جو اُن کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں ان واقعات کو دوبارہ بیان کرتے ہوئے صاف لکھ دیا ہی کہ یہ واقعہ مجھ پر گزرا ہی۔ چنانچہ ہم نے جب تک الحقوق والفرائض کی جلدیں نہیں پڑھیں ہم اسی دھوکے میں تھے کہ ابن الوقت کوئی شخص نہ تھا۔ نوبل صاحب کے ساتھ ابن الوقت نے میز پر چھری کانٹے سے جو کھانا کھایا تھا وہ ایک فرضی واقعہ تھا۔ لیکن الحقوق والفرائض کی جلدوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ابن الوقت خود ہمارے مولنا تھے۔ اُنھوں نے صاف صاف لکھ دیا ہی کہ یہ میرا ذاتی واقعہ ہی۔ پس اگر اس بھوکے طالب علم کا واقعہ بھی خود انھیں کا ذاتی واقعہ ہوتا تو کہیں نہ کہیں ضرور ذکر کرتے۔ تاہم میں کسی کے قیاس میں کیوں دخل دوں۔ کئی مرتبہ دل نے چاہا کہ مولنا سے خود اس واقعے کی تصدیق ہو جاتی تو بہتر تھا۔ مگر ان سے پوچھتا کون پوچھنے کی جرأت تو اس وقت ہوتی کہ کبھی مولنا نے اپنی زندگی کے واقعات بنائے ہوتے۔

غرض منتخب الحکایات بچّوں کے قابل نہایت عمدہ کتاب ہی۔ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے اس کتاب پر یہ ریمارک کیا ہی کہ "اس کتاب میں بچّوں کے لیئے منتخب اور مسلسل کہانیاں ہیں جن کی طرف وہ متوجہ کیئے جاتے ہیں اور اُن کی سمجھ میں ترقی ہوتی ہی۔ مصنف نے دیباچے میں اس قسم کی معمولی کہانیوں کی مذمّت کی ہی جو عموماً رائج ہیں۔ کہ ایک تھی چڑیا اور ایک تھا چڑا چڑیا لائی چاول کا دانہ اور چڑا لایا دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ بجائے اِس قسم کی کہانیوں کے مصنف نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں حکایات لقمان اور دوسرے قصوں سے انتخاب کر کے بچّوں کی سمجھ کے موافق لکھی ہیں۔ زبان شستہ اور عمدہ ہی۔ اگرچہ چند غلطیاں کتابت کی نقلنویس نے کی ہیں۔ یہ کتاب ایک آسان اسکول ریڈر اور انعامی ہی اور چھپنے کے قابل ہی"

چند پند یہ وہ کتاب ہی جس کو مولنا نے میاں بشیر کے لیئے ۱۸۶۹ء میں بمقام اورئی ضلع جالون تصنیف کیا تھا۔ نیز یہ وہ کتاب ہی جس کے پتے سے مرآۃ العروس کا پتہ چلا۔ اور نہ صرف پتا چلا بلکہ چند پند بہت کچھ اُس کے عروج کا باعث ہوئی۔ یہ کتاب بھی بچوں کے لیئے نہایت مفید ہی۔ حرف شناسی اور الفاظ شناسی کے بعد بچوں کو یہ کتاب پڑھائی جائے تو بہت مفید اور مناسب ہی ہمارے نزدیک یہ کتاب بچّوں کی تعلیم و تربیت اور عادات و خصائل کی ذمّہ دار ہو سکتی ہی اس میں مندرجۂ ذیل مضامین ہیں۔ صفائی سونا۔ کھانا۔ لباس۔ بات چیت۔ آدب۔ صحبت۔ عقل۔ موافقت۔ صحت اور مرض۔ غصّہ۔ لالچ۔ تکبر۔ بے حیائی۔ وغیرہ وغیرہ مضامین پر نہایت قریب الفہم اردو میں چھوٹے چھوٹے مگر جامع مضمون لکھے ہیں۔ اور آخر میں مذہب کے متعلق ایک مختصر سا مضمون ہی۔ اس کے بعد حضرت نوحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بھی اختصار کے ساتھ درج فرمائے ہیں۔ جا بجا مشکل الفاظ کے معانی فٹ نوٹ میں لکھ دیئے ہیں تاکہ بندی کو فہم مطالب میں سہولت ہو۔ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے اس پر بھی ریمارک کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ یہ کتاب ایک صاف اور شستہ سلسلہ

بچوں کے لیے بکار آمد مضامین کا ہے۔ . . . . . آخر حصّے میں مذہبی اور اخلاقی اصول اور مختلف مذاہب جو ہندوستان میں مُروّج ہیں اُن کا مختصر بیان ہے جس میں کوئی بات ناپسندیا تنگ دلی کی نہیں ہے۔ اس کا طرز بیان سادہ اور عمدہ ہے۔ یہ کتاب مسلمان بچوں کے لیے بطور ایک انعام کے چھاپنے کے قابل ہے۔"

نمونۂ چند پند | ذیل کا مضمون بھی مراۃ العروس کی طرح بطور فال کے اقتباس کیا گیا ہے۔

ادب

تم کو سمجھنا چاہیے کہ گو آدمی سب ایک طرح کے ہیں۔ دو کان۔ دو ہاتھ۔ دو آنکھیں۔ دو پاؤں۔ ایک ناک۔ ایک سر۔ سب کے برابر ہیں لیکن پھر بھی آدمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کوئی باپ ہے کوئی بیٹا۔ کوئی اُستاد ہے کوئی شاگرد ہے۔ کوئی آقا اور مالک ہے کوئی نوکر اور خادم۔ کوئی مولوی کوئی جاہل۔ کوئی حاکم۔ کوئی طبیب۔ کوئی دکان دار۔ کوئی مزدور۔ پس اگر سب آدمی درجے میں برابر ہوں تو دنیا کا انتظام ٹوٹ جائے اِس واسطے ہر ایک کے واسطے خاص درجے اور خاص رتبے مقرر ہیں۔ بیٹے کو باپ کا اور شاگرد کو اُستاد کا اور نوکر کو مالک کا اور رعایا کو حاکم کا اور بیمار کو طبیب کا حکم ماننا لازم اور واجب ہے۔ عمر اور رشتے اور ذات اور ہنر اور لیاقت اور دولت اور حکومت سے درجہ معلوم ہوتا ہے جس کی عمر زیادہ ہو یا جو رشتے میں بڑا ہو یا جو ذات میں شریف ہو جیسے مسلمانوں میں سید اور ہنود میں برہمن یا جس کو لیاقت زیادہ ہو جیسے مولوی اور پنڈت۔ یا جو دولت مند یا حاکم ہو سب قابلِ ادب ہیں۔

اگر تم ادب کرتے ہو تو مت سمجھو کہ یہ بھی دنیا کی ایک رسم ادا کرتے ہیں اور اگر ادب نہ بھی کریں تب بھی کچھ نقصان نہیں۔ خبردار ایسی بات ذہن میں مت آنے دو ادب نہ کرنے میں سراسر تمھارا زیان ہے جس کا تم نے ادب کیا جھک کر سلام کرنے یا مؤدب ہو کر بیٹھ جانے سے تم نے اُس کو کیا دے دیا۔ لیکن تم نے ایک سلام میں بڑا فائدہ حاصل کیا۔ جس کا تم ادب کرو گے ضرور وہ تم سے خوش ہوگا اور اُس کا جی چاہے گا کہ تم کو کچھ نفع پہنچائے۔ اُستاد کا ادب کرو توجی لگا کر اور سمجھا کر سبق دے گا۔ جب بھولو گے خوشی سے بتائے گا ماں باپ کا ادب کرو تو دیکھو کیسے کیسے چین تم کو کرتے ہیں۔ جو مانگو سو موجود جو کھاؤ سو حاضر۔ حاکم کا ادب کرو تو عزت سے پاس بٹھائے گا۔ ہر بات میں تمھاری رعایت کرتا رہے گا۔ اب ادب نہ کرنے والوں کی حالت پر نظر کرو۔ بے ادب شاگرد کو اُستاد بے دلی سے پڑھاتا ہے۔ بھولا ہوا پوچھتا ہے تو بتانے میں دریغ کرتا ہے اور کہتا ہے کیوں بے ایک دفعہ کا بتایا ہوا یاد نہیں رکھتا۔ اُٹھ کان پکڑ کر کھڑا ہو بے ادب بیٹا ماں باپ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو ماں کہتی ہے موئے تیرے نام کو جلتا ہوا انگارا۔ جان مار تُو نے خوب جلایا ہے۔ باپ کو آنے دے تو دیکھ کیسا ٹھیک بنواتی ہوں۔ بے ادب جب حاکم کے دربار میں جاتا ہے تو چپراسی الگ دھکے دیتے ہیں۔ نذکوری الگ کان پکڑتے ہیں۔ ادب صرف حکم ماننا نہیں ہے۔ اگر تم باپ کا حکم مانو تو تم نے باپ کا ادب پورا نہیں کیا بلکہ ادب میں حکم ماننے کے علاوہ دل سے اطاعت اور دل سے تعظیم یعنی بڑائی کرنا اور لحاظ ضرور ہے۔ تم پر جس جس کا ادب لازم ہے اُن کو خوب جھک کر سلام کیا کرو۔ جہاں تک ہو سکے اِن کی خدمت کرو اُن کے سامنے بدلحاظی کی کوئی بات مت کرو۔ یہاں تک کہ نشست و برخاست میں بھی اتنا خیال کرو کہ اُن کی طرف پشت مت ہونے دو۔ اُن سے اُونچے مت بیٹھو۔ اُن کی طرف پاؤں مت کرو۔ اُن سے آگے مت چلو۔ اُن سے بات میں ردّ و کد مت کرو۔ اُن کے سامنے بہت مت بولو۔ اور بہت مت ہنسو۔ اُن سے آنکھ مت ملاؤ۔ اُن کا نام نہ لو۔ ہر چند کوئی پوچھے اور جو ضرورۃً لو بھی تو بہت ادب کے ساتھ۔ نام سے پہلے لفظ جناب اور نام کے بعد

صاحب لگالو۔جب تم اتنی باتیں کروگے تو ادب والے پیارے بیٹے کہلاؤگے۔ جو لڑکے اپنے بڑوں کا ادب نہیں کرتے دنیا میں ہمیشہ کے واسطے ذلیل اور خوار رہیں گے۔ کیسے کم بخت ہوتے ہیں وہ بیٹے جو ماؤں کو جواب دیتے ہیں۔ اور اُن کی تعظیم نہیں کرتے۔ بہتر تھا کہ بجائے ایسے ناہموار اولاد کے سانپ پیدا ہوتے۔ یا عورت بانجھ ہوتی اور ایسی ناشدنی اولاد دنیا میں نہ پیدا ہوتی۔ تم ماں باپ کی قدر نہ جانوگے جب تک خود باپ نہ ہوگے اور جب تک وہ وقت آئے تب تک بہت کم امید ہے کہ ماں باپ تم سے ادب کرانے کے لیئے زندہ رہیں پس اس فرض کے ادا کرنے میں ہرگز وقت ضائع نہ کرو۔"

نصاب خسرو یہ ایک ۲۸ صفحے کی نظم ہے جو روزمرہ کی بول چال کے مطابق بتدی لڑکوں کے لیئے ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوئی۔ جب بچوں کو فارسی زبان کی کتابیں شروع کرائی جائیں تو بہت ضروری ہے کہ پہلے اُن کو اُس زبان کے مشہور الفاظ جو کثرت سے استعمال میں آتے ہوں یاد کرا دیئے جائیں تاکہ اُن الفاظ کی مدد سے بچوں کو کتاب پڑھنے میں آسانی ہو۔ فارسی الفاظ یاد کرا دینے کے واسطے نصابِ خسرو کی نظمیں پڑھا دینا بہت مفید ہوگا۔ نظم کے سہارے سے لڑکے سبق جلد یاد کر لیتے ہیں اور دیر تک نہیں بھولتے۔ اصل میں نصاب خسرو مولٰنا کی خاص کوئی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ خالق باری جو ایک مشہور کتاب ہے وہی پُرانے ہندی محاوروں کے لحاظ سے ترمیم شدہ ہے۔ وہ الفاظ اس میں سے چھانٹ دیئے گئے ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا۔ بہت سے اشعار کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ آخر میں الفاظ فارسی و عربی کی ایک فرہنگ لگا دی گئی ہے۔ نصاب خسرو میں ۸۵۷ لفظ ہیں ان میں پورے ڈھائی سو عربی کے ہیں اور ۵۰۸ فارسی کے۔ عربی فارسی کے وہ الفاظ جو اُردو کی روزمرہ میں مستعمل ہیں وہ اس حساب سے خارج ہیں۔ اس کتاب پر بھی ڈائرکٹر صاحب نے ریمارک کیا ہے کہ "نصاب خسرو المعروف بہ خالق باری فارسی زبان کی ابتدائی کتاب کا جو اس ملک میں رائج ہے نیا اڈیشن ہے۔ جس کو ابتداءً امیر خسرو دہلوی نے مرتب کیا تھا یہ کتاب اِس اصول پر لکھی گئی ہے کہ بچہ جب کسی زبان کو شروع کرتا ہے تو ضرور ہے کہ اُس کو ایک کافی تعداد کار آمد الفاظ کی مستحفظ ہو اور تاکہ یہ بات آسانی سے حاصل ہو الفاظ کو منظوم کر دیا ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اصلاحات ذیل کی ہیں (۱) الفاظ متروک الاستعمال کو خارج کر دیا ہے (۲) اپنی طرف سے کچھ اشعار بڑھائے ہیں (۳) مشق کے لیئے ایک فرہنگ بحساب حروف تہجی لگا دی ہے (۴) الفاظ کے نیچے حروف لکھ دیئے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی ہے یا فارسی یا ہندی۔ ...... یہ نسخہ پُرانے نسخے سے مرجح ہے۔ فوراً طبع ہونا چاہیئے۔"

صرفِ صغیر قواعد فارسی کا ایک مختصر رسالہ ہے ۲۴ صفحوں کا۔ یہ بھی ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا نثر کے سوا جا بجا نظم میں بھی قواعد فارسی کو باندھ دیا ہے اگر یہ قواعد طالب علموں کو مستحفظ کرا دیئے جائیں اور ان قواعد کا استعمال بھی دکھا دیا جائے تو اس طریقے سے مبتدیوں کو ضرور اتنی استعداد ہو جائے گی کہ وہ سلیس فارسی عبارت کا صحیح ترجمہ کر لیں گے۔ بلکہ شاید آسان فارسی بھی صحت کے ساتھ لکھنے لگیں اور یہ بات بھی تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ اگر اچھی طرح تعلیم ہو اور مبتدی کو سمجھا کر پڑھایا جائے تو اتنی استعداد صرف چھ مہینے میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب بہادر نے اس پر بھی ایک ریمارک کیا ہے وہ یہ ہے کہ "وہ یہ ایک ابتدائی رسالہ قواعد فارسی کا ہے جو مبتدیوں کے لیئے لکھا گیا ہے مصنف نے زبان فارسی ہندوستان میں اب تک رائج ہونے کی وجوہ اپنے

دیباچے میں بیان کی ہیں۔ اُردو کی تکمیل کے لئے فارسی ضروری ہے۔ یہ کتاب اُن طلبہ کے لیئے ہے جنھوں نے اُردو میں کافی استعداد حاصل کرلی ہو جو ہمارے طریقۂ تعلیم کے مطابق ہے۔ برخلاف اِس ملک کے دستور کے کہ اُردو سے غفلت کی جاتی ہے اور فارسی شروع کرادی جاتی ہے اس بات کے معلوم کرنے سے مجھے خوشی ہوئی کہ اس طریقے کا ناپسند کرنے والا نذیر احمد اپنے وقت کا تجربہ کار اور آزاد خیال عالم ہے۔ یہ رسالہ چھپنے کے قابل ہے اور غالبًا جماعتہائے اعلیٰ مدارسِ تحصیل میں جہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے اِس کی ترویج ہوگی۔" صرف صغیر میں مصنف نے جابجا قواعد بھی نظم کردیئے ہیں۔ اور وہ صرف اِس لیئے کہ بچے نظم کو زیادہ خوشی سے پڑھتے ہیں اور اُس میں اُن کا زیادہ دل لگتا ہے۔ نمونے کے طور پر دو مختصر نظمیں درج کی جاتی ہیں۔

بتاؤں ماضی کی تم کو قسمیں کہ چھ ہیں گنتی میں جان بابا (۱)
ہے پہلے مطلق جو نونِ مصدر کو حذف کرڈالو بے محابا
قریب جو پاس کی ہو گزری ہے اُس کے آخر میں استِ ظاہر
بعید گزری ہوئی ہے مدت کی بُود ہوتا ہے اُس کا آخر
ہے احتمالی کہ جس میں شک ہو نشان اُس کا ہے لفظ باشد
تمام ہے پانچویں چناں چہ زدن سے کوئی بنائے می زد
چھٹی تمنائی جس کی گردان کلہم تین صیغے آئے
لگائے مطلق میں یائے مجہول جو تمنائی کو بنائے

لازم کو آپ گر متعدی بنایئے (۲)
آخر میں امر کے الف اول لگایئے
اور اُس کے بعد کیجئے نیدن کو مستزاد
یہ ہے طریق تعدیہ ہذا ہو المراد

رسم الخط یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ۳۲ صفحوں کا ہے اس میں املا نویسی کے قواعد درج ہیں۔ فی زماننا جو لوگ استعداد فارسی و عربی سے بے بہرہ ہوتے ہیں وہ اُردو کی کتابت میں فاحش غلطیاں کیا کرتے ہیں۔ اُن کی روک تھام رسم الخط سے باحسن الوجوہ ہوتی ہے۔ مولٰنا اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"میری تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوا جب میرے اپنے بچے تعلیم کے قابل ہوئے۔ آخر آپ پڑھا تھا۔ پڑھایا تھا۔ سررشتۂ تعلیم کی نوکری کے ذریعے سے پڑھنے پڑھانے کی نگرانی کی تھی۔ طریقۂ تعلیم کے خلل اور کتابوں کے نقص مجکو ذرا ذرا معلوم تھے۔ آنکھوں دیکھے تو مکھی نگلی نہیں جاتی۔ میں نے آپ اپنے طور کی کتابیں بنائیں اور آپ ہی پڑھائیں۔ تصنیف و تالیف کا اصلی محرک تو یہ تھا۔ بخت و اتفاق سے کتابیں سرکار میں پیش ہو کر پسند اور لوگوں میں پھیل کر مقبول ہوئیں۔ خدا جانے مَیں اس بارے میں کیا کچھ کرتا۔ اور کیسے کیسے منصوبے ذہن میں تھے۔ مگر دیکھا تو لوگوں کو علم کا مطلق شوق نہیں اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آج سرکار نوکریوں سے امتحان کی قید اُٹھادے پھر دیکھیے کالجوں اور اسکولوں کی کیسی بُری گت ہوتی ہے۔ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ معاش کا انحصار نہ ہو تو لوگ علم کے نام سے ٹکرا بھی نہ توڑیں۔ میں نے علمی کتابیں بھی لکھ کر دیکھیں۔ مگر لوگوں کی بے رغبتی کی وجہ سے کسی کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ الا ماشاء اللہ۔ میں نے اپنا قاعدہ یہ رکھا ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں اُس کے رواج دینے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ میں کتاب کیا تصنیف کرتا ہوں گویا کنکوّے بناتا ہوں۔ اگر اُن میں پرواز کا مادہ ہے خود بخود اُڑیں گی۔ ورنہ میں کہاں ان کے پیچھے دُم چھلّے کی طرح بندھا بندھا پھروں۔ اِس بے اعتنائی پر بلکہ بے اعتنائی بھی نہیں حمیت اور خودداری پر خدا کے فضل سے میری ساری کتابیں ایسی مقبول ہوئیں والحمد للہ علیٰ ذٰلک کہ دوسری دوسری زبانوں میں

ترجمہ ہوتی اور جگہ جگہ بار بار چھپتی چلی جاتی ہیں۔ مگر علمی کتابیں ہیں کہ جب سے تصنیف ہوئیں اینٹڈ پڑی ہیں۔ یہ رسالہ رسم الخط بھی اُن ہی علمی کتابوں میں ہے جن کو کسی فقیر کی بد دعا ہے کہ ہندوستانی ان سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ میرے نزدیک یہ رسالہ اس قدر ضروری ہے کہ کوئی مکتب کوئی اسکول اس سے مستغنی نہیں۔ اہل یورپ جن کو مشرقی زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں کہیں مدتوں میں جاکر زبان تو ٹوٹی پھوٹی بولنے بھی لگتے ہیں۔ مگر کتابت پر بالکل قادر نہیں ہوتے اُن کو ان قواعد کا سیکھنا نہایت ضروری اور مفید ہے بشرطیکہ جو منشی اُن کو پڑھاتا ہے ان قواعد کو خود سمجھ کر اُن کو سکھائے۔ بے شک اِن قواعد کے بدون بھی کام چل رہا ہے لیکن جیسا صرف و نحو اور منطق کا ہونا ضروری ہے ویسا ہی ان قواعد کا۔ بلکہ بدرجۂ اولیٰ مگر قاعدے ہمیشہ غور طلب ہوتے ہیں کسی قدر یہ بھی ہیں۔ خدا اتنی زحمت اُٹھانے کی توفیق دے۔ میں تو مدتیں ہوئیں اِس رسالے کو رو بیٹھا تھا۔ نذیر حسین تاجر کتب کے اصرار سے مکرر چھپوانے کی اجازت دیدی ہے۔ ان کو اس کے پھیلنے کی توقع ہے۔ مجکو نہیں ۔

اگرچہ اس مفید رسالے پر ڈائرکٹر پبلک آف انسٹرکشن نے یہ چلتا ہوا سا ریمارک کیا ہے کہ "فنِ املا نویسی میں یہ ایک ابتدائی رسالہ ہے۔ نیا اور عالمانہ مضمون ہے۔ مدارس میں یہ کارآمد ہوگا" لیکن ہم نے جب اِس رسالے کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ رسالہ نہایت ضروری اور بکارآمد ہے اور مخصوص آج کل تو اس قدر بکارآمد ہے کہ اگر اس کے قاعدوں پر عملدرآمد کیا جائے تو لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام صوبجات میں بالخصوص صوبہ پنجاب میں مولنا کی رسم الخط پر علی العموم بہت لحاظ کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے صوبجات میں بعض رسالے پابندی کرتے ہیں لیکن اَور صوبجات ہند میں کچھ بھی پروا نہیں کی جاتی۔ رسم الخط میں حسب ذیل عنوان ہیں۔

حرفوں کی پوری شکل۔ مرکبات۔ قواعد متعلقۂ ترکیب لاحق۔ ترکیب لاحق کی تقطیع۔ قواعد متعلقۂ ترکیب سابق۔ قواعد متعلقۂ ترکیب طرفین۔ متفرق قاعدے۔ خاتمہ۔ خاتمے میں مولنا لکھتے ہیں "خوش خطی ایک ہنر ہے۔ جس کی قدر ہر ایک زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ بلکہ ان دنوں میں چوں کہ چھاپے خانے کثرت سے جاری ہیں خوش خطی کی اَور بھی زیادہ قدر و منزلت ہے۔ ابتدا میں اگر لڑکے جی لگا کر اس کا اہتمام کریں تو تھوڑی محنت سے سوادِ خط درست ہو سکتا ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ اس کے واسطے خاص استاد ہو اور تمام وقت مشق اور اصلاح میں صرف کیا جائے۔ چھپی ہوئی کتابیں ہمیشہ خوش خط لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی کتاب کو دیکھ کر نقل کرنا اور اُسی کے سے حرف بنانے کی کوشش کرنا خوش خط ہو جانے کے واسطے عمدہ اور سہل تدبیر ہے۔ حرفوں کے جوڑ توڑ۔ نوک پلک۔ کشش دائرہ مرکز۔ سب جزئیات کو بغور خیال رکھنا اور اپنی کی ہوئی نقل کو اصل سے مقابلہ کر کے فرق و اختلاف پر نظر کرنی چاہیے۔ اگر اسی طرز پر چند روز متواتر مشق کی جائے تو آخر کو اصل سے حرف ملنے لگیں گے۔ لڑکوں کا دستور ہے کہ جب اُن کو حرف بنانے آ جاتے ہیں تو گھسیٹ کر چلتے ہیں۔ نام کے دستخط بنانے کا ولولہ اور جلد لکھنے کی ہوس شروع سے اُن کے خط کو بگاڑ چلتی ہے۔ اور خط کا دستور ہے کہ جب ہاتھ بگڑ گیا پھر درست ہونا مشکل ہو جاتا ہے جیسے گھوڑا کہ جب اُس کو بدرفتاری کی عادت ہو گئی تو اس میں قدم بہت دنوں کی محنت میں نکلتا ہے۔ پس ابتدا میں ہمیشہ ہاتھ کو روکے قلم کو سنبھالے ہوئے آہستہ لکھنا چاہیے تاکہ حرفوں کی صورت ٹھیک بنتی جائے۔ اور التزام کے ساتھ آدھ گھنٹہ مشق کے واسطے خاص کر لینا چاہیے جب ایک خاص شان پر ہاتھ بیٹھ جائے گا تو بعد کو جلدی میں بھی وہی شان باقی رہے گی خوش خطی بجائے خود کوئی علم نہیں۔ نہ اس سے عقل کو تیزی حاصل ہوتی ہے۔ نہ اخلاق کو درستی۔ نہ معلومات کو ترقی۔ بلکہ خوش خطی کو صرف

مصوری یا نقاشی کا ایک شعبہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ تو کسی طرح مناسب نہیں کہ انسان تحصیل علم پر اس کو ترجیح دے۔ تاہم یہ عام پسند اور ہر دل عزیز ہنر ایسا بھی نہیں کہ لڑکے اِس سے بے بہرہ رہیں۔ کم سے کم اتنا تو ضرور ہے کہ کمال خوش خطی حاصل نہ کریں تو عیب بدخطی بھی اپنے میں پیدا نہ ہونے دیں۔ خط نستعلیق کے علاوہ جس کے قاعدے اِس رسالے میں مذکور ہیں ایک خط رواجی ہے جو سرکاری کچہریوں اور خانگی تحریروں میں مستعمل ہے۔ اس میں نہ قاعدے کا حفظ ہے نہ خود حرفوں کی اصلی صورت کا التزام نہ نقطے کی پروا نہ نشان کی خبر۔ مگر کام اسی خط سے پڑتا ہے اور اکثر لوگ اِس خط میں مہارت اور استعداد بہم پہنچانے کو مکتوب جمع کرتے اور سبقاً سبقاً اُس کو پڑھتے ہیں۔ بے شک ایسے خطوط پر جس قدر نظر ہوگی اُسی قدر پڑھنے میں سہولت ہوگی۔ پس تم کو اس سے بھی غافل نہ رہنا چاہیئے یہ اُمید مت رکھو کہ ہر جگہ تم کو مطبع مصطفائی کا چھاپہ پڑھنے کو ملے گا۔ لکھنے والے تو وہ وہ غضب کرتے ہیں کہ بڑے بڑے مشّاقوں سے بھی دو چار حروف نہیں پڑھے جاتے۔ بے چارہ مبتدی تو بھلا کیا پڑھ سکے گا۔

بنات النعش اِس کتاب کو مرآۃ العروس کا حصۂ دوم کہنا بجا ہے۔ مرآۃ العروس کے شائع ہونے کے تیسرے برس ۱۸۷۲ء میں یہ کتاب بھی گورنمنٹ میں پیش کی گئی۔ وہی سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر تھے جن کو مرآۃ العروس کے سامنے کوئی کتاب جچتی نہ تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ بنات النعش پر صرف پانسو انعام ملا۔

اِس کتاب کی بھی وہی بولی ہے۔ وہی طرز تحریر ہے۔ مرآۃ العروس سے تعلیم اخلاق اور تربیتِ خانہ داری مقصود تھی۔ اِس سے بھی وہی ہے مگر ضمناً اور معلوماتِ مفیدہ کا اِس میں کافی طور پر اضافہ کیا گیا ہے۔

اصغری خانم جن کی سلیقہ شعاری اور سگھڑاپے کا ذکر مرآۃ العروس میں ہے وہ شوقیہ لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں اُس مکتب میں حسن آرا بیگم نے جو اس کتاب کی ہیروائن ہیں تعلیم پائی ہے۔ حسن آرا کے مزاج کی اُفتاد ایسی بُری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔ نہ ماں کا ادب نہ آپا کا وقر۔ نہ باپ کا ڈر۔ نہ بھائیوں کا لحاظ۔ نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں۔ لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اُٹھائے رہتی تھی۔ اِس بدسلیقہ لڑکی کی تعلیم و تربیت جس عمدہ طور پر ہوئی ہے وہ قابل دید ہے۔ حسن آرا کی بگڑی ہوئی عادات۔ امیرانہ خیالات۔ لاڈ پیار کی وجہ سے ہٹ اور ضد اور دوسری لڑکیوں کو حقارت سے دیکھنے اور اُن پر نام دھرنے اور اسی قسم کے صدہا معائب کی اصلاح نہایت خوش اسلوبی سے اصغری خانم نے کی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اُس کے دل میں پیدا کیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں اخلاقی مضامین۔ کام کی باتیں۔ میل جول کے طریقے۔ نیکی اور سچی خیرات۔ ہم جولیوں کا پاسِ ادب جناب کی دل چسپ باتیں۔ زمین کی کشش۔ وزن مخصوص کشش ثقل۔ مقناطیس۔ زمین کی ہئیت و حرکت۔ خوردبین۔ رنگ۔ متحرک چیزوں میں آنکھوں کا غلطی کرنا۔ زمین کے گول ہونے کی دلیل جسمانی ریاضت۔ زمین کی جسامت اور تقسیم۔ تمدن کی وجہ۔ شہر اور دیہات کی آب و ہوا کا مقابلہ۔ اہل شہر اور دیہاتیوں کا محاکمہ۔ عورتوں کے توہمات۔ عرب کا جغرافیہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ سمجھا بجھا دیا ہے۔ یہ کتاب فی نفسہ ایک عمدہ دستور العمل ہے۔ جنرل نالج یعنی عام معلومات اس سے بہت ہوتی ہے۔ بنات النعش کا ترجمہ بھی گجراتی زبان میں ہوا ہے اور آشکارا پریس بمبئی میں چھپا ہے۔

نمونۂ بنات النعش راقم نے بنات النعش کو بھی بطور فال کھولا تو "محمودہ کا حسن آرا کو آنا کہ غنی تا ند محتاج تر ا ند کا مضمون سمجھانا" نکلا۔ اِس لیے یہ مضمون تو درج کیا جاتا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "حُسن آرا کا مکتب سے رخصت ہونا" بھی درج کیا جائے

کہ یہ دونوں مضمون لازم و ملزوم ہیں۔ ذیل کے دونوں مضمون اپنی طوالت کی وجہ سے ناظرین کو شاید منقبض کریں اس لیئے ہم معافی چاہتے ہیں۔ مولانا کی تصانیف کا اقتباس کچھ "حیاۃ النذیر" کا حجم بڑھانے کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اگر لائف میں مضامین کا اقتباس نہ ہوتا تو ہمارے نزدیک یہ کتاب مکمل نہ ہوتی۔

محمودہ کا حسن آرا کو (آنانکہ غنی تراند محتاج تراند) کا مضمون سمجھانا

محمودہ۔ محتاج کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر محتاجی اور کیا ہوگی کہ آپ کا ایک دن بھی بے نوکروں کے نہیں کٹ سکتا۔ بھلا میں پوچھتی ہوں۔ ماما نہو تو کھانا کون پکائے۔ لونڈیاں نہ ہوں تو پانی کون پلائے۔ موُنھ کون دُھلائے پنکھا کون جھلے۔ چیز کون اُٹھا کر دے۔ چارپائی کون بچھائے۔ بچھونے کون کرے۔ گھر میں جھاڑو کون دے۔ یہ تو روزمرہ کے کام ہیں۔ کھانا۔ کپڑا۔ برتن۔ زیور اور ضرورت کی کل چیزیں چھوٹی یا بڑی یہاں تک کہ پانی پینے کا مٹی کا آبخورہ۔ کنگھی۔ سوئی۔ سلائی۔ کیا آپ نے اپنے ہاتھوں بنائی ہیں یا لوگوں نے آپ کو بنا کر دی ہیں۔ اس پر بھی آپ کہتی ہیں کہ "خدا نہ کرے ہم کسی کے محتاج کیوں ہونے لگے"۔ **حسن آرا**۔ بے شک ضرورت کی سب چیزیں اور لوگ بناتے اور ٹہل خدمت بھی اور لوگ کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی چیز ہم کو مفت دی جاتی ہے۔ اور کیا بے لیئے کوئی ٹہل خدمت کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کے لیئے ہم روپیہ خرچ کرتے ہیں روپے کے لالچ سے لوگ خود بخود چیزیں لیئے دوڑے چلے آتے ہیں۔ بے بُلائے ٹہل خدمت کرنے کو حاضر ہوتے ہیں۔ روپیہ ہو تو گھر بیٹھے دنیا بھر کا سامان لے لو اور نوکر تو ایک صبح رکھو ایک شام۔ مَیں تو جانتی ہوں کہ دولت بڑی چیز ہے جس کے پاس دولت ہے وہ کسی کا محتاج نہیں اور تمام دنیا اُس کی محتاج ہے۔

محمودہ۔ آہا بیگم صاحب آپ بڑی غلطی کرتی ہیں۔ بھلا لوگ آپ کی دولت کی قدر نہ کریں۔ اور کوئی روپے کا خواہاں نہ ہو تب آپ کیا کیجیئے۔ یہ سُن کر حسن آرا چپ ہوئی۔ اور سوچ کر کہا تو یہ کہا کہ ایسی صورت میں سوائے مر رہنے کے اور کیا تدبیر ہے۔ کام کاج ہم سے کچھ ہو نہیں سکتا اور فرض کیا کہ اپنے اوپر جبر سہا اور آپ اُٹھ کر پانی پی لیا۔ بچھونا اپنے ہی ہاتھوں کر لیا تب بھی کھانا پکانا تو ممکن نہیں اور مانا کہ کوئی سہج سا کھانا مر گر کر پکا لیا کیوں کہ سُنا ہے کہ آنا جان سوئیاں اور خشکہ اُبال لینا جانتی ہیں مگر ضرورت کی اور ہزار چیزیں ہیں۔ کپڑا کون بُنے گا۔ زیور کون گھڑے گا۔ لیکن کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ دولت کی قدر۔ روپے کی خواہش نہ ہو؟

محمودہ۔ بیشک ممکن ہے بہت دن ہوئے مجھ کو اُستانی جی نے ایک کتاب پڑھائی تھی۔ اُس میں لکھا تھا کہ ابتدا اِ دنیا میں بہت مدت تک اشرفی روپے پیسے کا چلن کچھ بھی نہ تھا۔ اُس زمانے میں لوگ کھیتی کے کام سے بھی اور جس طرح اب ہر طرح کا غلہ اور انواع و اقسام کی ترکاریاں اور میوے اور پھل پھول لوگ محنت کر کے زمین سے پیدا کرتے ہیں۔ اُن دنوں کچھ بھی نہیں جانتے تھے سمندر کی مچھلیاں اور جنگل کے جانور مار لاتے اور اُن ہی کے گوشت سے اپنا پیٹ بھر لیتے یا جنگل میں جو ساگ پات از خود جم اُٹھتا ہے جانوروں کی طرح اُس کو کھا لیتے۔ یہ زرق برق اور تکلف کے کپڑے جو اب اس زمانے میں ایسے سستے ہیں کہ ہر ایک غریب آدمی کو بھی میسر آ جاتے ہیں پہلے ان کا نام بھی کسی نے نہیں سُنا تھا۔ جانوروں کے چمڑے اور ڈھاک وغیرہ کے پتوں سے بدن کو ڈھانکتے اور عالی شان محلوں کی جگہ درختوں کی چھاؤں اور پہاڑوں کی کھوؤں میں پانی اور سردی گرمی سے پناہ لیتے۔ جوں جوں دنیا کی

زیادہ ہوتی گئی آدمی اپنے آرام کے لیئے نئے نئے پیشے اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے گئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ ایک آدمی ہر ایک طرح کا کام آپ اکیلا کر لیتا اور ہر طرح کی چیز آپ بنا لیتا۔ اِس سبب سے کسی نے ایک کام لیا اور کسی نے دوسرا۔ کوئی کھیتی کرنے لگا کوئی لوہار بنا۔ کوئی سُنار۔ کوئی جولاہا۔ کوئی موچی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ کھیتی والا سب کے لیئے کھانے کا غلّہ پیدا کرے۔ لوہار۔ چاقو مقراض وغیرہ لوہے کی چیزیں بنائے۔ بڑھئی ہل۔ چارپائی۔ چوکی۔ کُرسی۔ وغیرہ لکڑی کی چیزیں۔ سُنار زیور گھڑا کرے۔ جولاہا ہر قسم کے کپڑے بُنے۔ اور آپس میں ضرورتوں اور چیزوں کا مبادلہ کر لیا کریں۔ چندے اِسی طرح بے روپے بے سکّے دنیا کا کام چلا۔ مگر آخر کار مشکلیں پیش آنے لگیں جس کو کتاب والے نے یوں لکھا ہے کہ اَب فرض کرو کہ مثلاً موچی کو کپڑے کی ضرورت ہوئی اور وہ ایک بہت طرحدار جوتی بنا کر جولاہے کے پاس لے گیا۔ گردن کا دانہ دار چمڑا۔ بیٹھی ہوئی نوک۔ کھڑی ہوئی ایڑی۔ کیمخت کے پان۔ اُونچی دیواریں۔ کمایا ہوا تلا۔ بخیئے کی دوخت اور کہا دیکھو تو شیخ جی کیا جوتی بنا کر لایا ہوں۔ کیچڑ میں پھرو۔ پکّی سڑک پر دوڑو نہ تلا گھسے گا نہ صورت بگڑے گی۔ بھراؤ کا نام نہیں۔ برس روز سے کم چلے تو اُلٹی میرے سر مارنا۔ مگر مجکو گاڑھے کا ایک تھان چاہیئے۔ آٹھ سے نہ ہو تو چھ سے پون گز کا پنہا۔ جولاہا بولا چودہری جوتی تمھاری سرِ ان اور تھان بھی جیسا تم چاہتے ہو موجود۔ سوت بھی گول راچھ بھی پنھے دار ہے۔ خوب ٹھوک ٹھوک کر بُنا ہے۔ ماڑی کا نام نہیں۔ مگر وہ پہلی جوتی جو تم نے بنا دی ہے ابھی تک ثابت ہی ہے۔

موچی۔ ارے شیخ جی! تین برس کی جوتی اَب تک۔ **جولاہا**۔ کیوں دن بھر تو کارگاہ میں بیٹھا رہتا ہوں آٹھویں دن کبھی پینٹھ میں جانے کا اتفاق ہوا جوتی پر ایسی زد کیا پڑتی ہے۔ دوسرے بھائی میں غریب آدمی ہوں۔ پاؤں بھی ہولے ہولے رکھتا ہوں۔ موچی بے چارہ نا اُمید ہو کر چلا آیا اور پہنچا سُنار کے پاس کہ کیوں لالہ تم کو جوتی کی ضرورت ہے۔ **سُنار**۔ ہاں بھائی اچھے آئے دس دن سے ننگے پاؤں پڑا پھرتا ہوں۔ اور اس کے بدلے زیور بھی وہ بنا کر دوں کہ تمام برادری میں کسی کے یہاں نہ نکلے۔

موچی۔ اجی ساہ جی کہاں ہم اور کہاں زیور۔ مجھ کو دیکھو کہ چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔ گھر میں بچّوں کے پاس ٹوپی تک نہیں۔ گھر والی پیوند گانٹھتے گانٹھتے ہار گئی۔ کپڑے کی ضرورت ہے۔ **سُنار**۔ کپڑے کی ضرورت ہے تو شیخ نمازی کے پاس جاؤ۔

موچی۔ گیا تھا اُس کے پاس جوتی موجود ہے۔ **سنار**۔ چلو دیکھیں شیخ نمازی کو کچھ گہنا بنوانا ہو۔ سُنا تھا کہ بیٹی کا بیاہ کرنے والا ہے تو میں اُس کو گہنا بنا دوں گا۔ تم مجھ کو جوتی دینا اور میں اُس سے تھان لے کر تم کو دے دوں گا۔ اب سُنار اور موچی دونوں پھر جولاہے کے پاس گئے۔ **سُنار**۔ شیخ جی کہو بیٹی کا بیاہ کب کرو گے۔؟ **جولاہا**۔ چودھری وہ بات تو بگڑ گئی۔ **سنار**۔ کیوں۔ **جولاہا**۔ وہ لڑکا بڑا خراب نکلا۔ چور۔ جواری۔ بھانگ پیتا ہے۔ **سُنار**۔ کچھ تم کو گہنا بنوانا ہے۔ **جولاہا**۔ ابھی تو نہیں جب پھر نسبت ناطہ ٹھیرے گا دیکھ لیا جائے گا۔

غرض کہ پھر بے چارے موچی کی جوتی اینڈ رہ گئی۔ جب ہر ایک شخص کو ایسی دقت پیش آنے لگی تو سب نے مل کر یہ تجویز کی کہ چیز کا مبادلہ چیز سے ٹھیک نہیں ایک ایسی چیز ٹھیراؤ کہ ہر کوئی ہر ایک چیز کے بدلے اُس کو لے لیا کرے۔ موچی اپنا بنایا ہوا جوتا اُس کے عوض دیا کرے۔ سُنار اپنا گھڑا ہوا زیور۔ جولاہا اپنا بُنا ہوا تھان۔ تب سکّہ چلا۔ پہلے لوہے کا سکّہ تھا اور ایسا بھاری تھا کہ شاید سو روپے کی مالیت کے واسطے چھکڑا بھر بوجھ ہوتا تھا۔ پھر تانبے اور چاندی اور سونے کے سکّے چلے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چمڑے کا روپیہ چلا تھا۔ اُس میں بھی سونے کی کیل تھی۔ اب انگریزوں نے وہ انتظام ٹھایا ہے کہ کاغذ کا سکہ چلاتے ہیں۔

ایک ورق کاغذ دس۔ سو۔ ہزار۔ لاکھ روپے کا ہوتا ہے۔ جتنا روپیہ کاغذ میں لکھا ہے جہاں چاہو بھنا لو۔ نہ بٹہ ہے نہ دستوری۔ پس روپیہ اپنی ذات سے کسی کام کا بھی نہیں نہ اُس کو نان خطائی کی طرح کھاتے نہ اُس کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے ہیں مگر جو چیز چاہو روپے کے بدلے البتہ لے سکتے ہو پس حقیقۃ میں درکار ہوتی ہے وہ چیز اور روپیہ اُس کے حاصل کرنے اور بہم پونہچانے کا ایک ذریعہ ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقۃ ہے اُس روپیہ کی جس پر امیروں اور دولتمندوں کو اس قدر ناز ہے۔ حسن آرا۔ کیا ہی اچھی بات آپ نے مجھ کو بتائی مگر یہ تو فرمایئے کہ جب روپیہ ہر ایک چیز کا عوض ہو سکتا ہے تو جس کے پاس روپیہ ہے گویا وہ ہر ایک چیز کا مالک ہے۔ اور ہر ایک چیز اُس کے اختیار میں ہے تو ضرور روپیہ بڑی قدر و منزلت کی چیز ہے اور روپے والوں کو جتنا ناز اور جتنا گھمنڈ ہو سب بجا اور درست ہے۔ محمودہ۔ گھمنڈ کی تو کوئی وجہ نہیں پاتی روپیہ بیشک چیز کا بدل ہے مگر خود اُس چیز کا کام نہیں دے سکتا۔ مثلاً فرض کرو کہ ہم کو ایک جوتی کی ضرورت ہے تو اس میں دو باتیں ہیں ایک یہ کہ جوتی درکار تھی اور جوتی موجود ہے۔ اور دوسری یہ کہ جوتی تو موجود نہیں مگر روپیہ ہے جس کے بدلے ہم جوتی مول لے سکتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غور کیجئے ہرگز یکساں نہیں پھر بھی روپے والے کو اتنی حاجت باقی ہے کہ روپیہ لے کر بازار جائے اور جوتی مول لائے۔ فرض کیجئے کہ جوتی نہ ملی یا ملی اور قیمت نہ ٹھیری تو آخر روپئے والا محجوب رہے گا یا نہیں۔ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب روپئے والا جوتی لینے جاتا ہے یہ جوتی کا محتاج ہے مگر جوتی والا حقیقۃ میں روپے کا محتاج نہیں بلکہ وہ اُس چیز کا محتاج ہے جس کے بدلے جوتی کی قیمت خرچ کرے گا۔ غرض کہ روپے والا زیادہ محتاج ہے اور اگر زیادہ نہیں تو جوتی والے کے برابر سہی۔ پھر اس کو گھمنڈ کس بات کا ہے۔ ایک چیز کا یہ خواہش مند ہے یعنی جوتی کا۔ اور دوسری چیز یعنی روپے کا دوسرا۔

حسن آرا۔ لیکن روپے کے بدلے ہر وقت چیز میسّر آسکتی ہے۔ محمودہ۔ یہ غلطی ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیسے کی جگہ دو دینے کو موجود ہیں اور چیز نہیں ملتی۔ میری اماجان کبھی غدر کے حالات بیان کیا کرتی ہیں کہ سب لوگ بھاگ بھاگ کر سلطان جی جا رہے تھے روپے کا سیر بھر آٹا تلاش کرتے تھے اور نہیں ملتا تھا۔ دن بھر مردوے روپے لیئے لیئے پھرتے تھے اور شام کو ہار کر خالی ہاتھ چلے آتے تھے۔ غدر کے سبب رسد کا باہر سے آنا بالکل بند تھا۔ گانوں والوں کے پاس جو رسد تھی وہ کہتے تھے کہ روپیہ لے کر ہم کیا کریں گے گھر میں تھوڑا بہت اناج رکھا ہے تو بال بچوں کا سہارا تو ہے۔ حسن آرا۔ البتہ اگر ایسا اتفاق پیش آجائے تو روپیہ محض نکمّا ہے مگر کیا روز غدر ہوتا پڑا ہے۔ یہ بھی خدا جانے کیا بات تھی۔ اَب تو جس کے پاس دولت ہے وہی آسودہ ہے۔

حسن آرا کا مکتب سے رخصت ہونا

ہم شروع کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ حسن آرا مکتب میں بیٹھی تو گیارھویں برس میں تھی جب اُس کو خیر سے چودھواں برس لگا تو جھجر والوں کی طرف سے بیاہ کا تقاضا شروع ہوا۔ اِس عرصے میں حسن آرا نے سارا قرآن مجید پڑھا اور چوں کہ دو سیپارے روز تلاوت کا معمول تھا ایسا یاد تھا کہ گویا حفظ ہے۔ اُردو بے تکان اور بے تکلّف لکھتی پڑھتی تھی۔ سوادِ خط بھی کچھ بُرا نہ تھا۔ قرآن کا ترجمہ اور کنز المصلّی۔ قیامت نامہ۔ راہِ نجات۔ وفات نامہ۔ قصۂ شاہِ روم۔ قصۂ سپاہی زادہ۔ معجزۂ شاہِ یمن۔ رسالۂ مولد شریف مشارق الانوار۔ اتنی تو مذہبی کتابیں اس کی نظر سے گزر گئیں اور ان کے علاوہ حساب ضروری قاعدۂ کسر تک اور ہندوستان کا

جغرافیہ۔ ہندوستان کی تاریخ۔ چند پند۔ منتخب الحکایات۔ مرأۃ العروس۔ سب کچھ سیکھ پڑھ کر فارغ ہوگئی۔ اُردو کے اخبار بے تامل پڑھ کر سمجھ لیا کرتی تھی اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ خانہ داری کے جو ہنر عورتوں کو درکار ہیں سب اُس نے حاصل کیے اور معلوماتِ مفیدہ کا اتنا ذخیرہ اُس نے فراہم کر لیا کہ وہ اُس کو تمام عمر کی آسایش اور مسرت کے لیے کافی تھا۔ کتاب کے ذریعے سے جو کچھ اُس نے سیکھا اُس کا ہزار چند اُستانی اصغری خانم اور مکتب کی لڑکیوں سے باتوں باتوں میں حاصل کیا جب اِس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہنچی تو ہر چند گھر والوں نے اُس کو مکتب جانے سے روکا مگر اُس کو مکتب سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا تھا کہ ایک لحہ مکتب سے جدا رہنا اُس کو شاق تھا حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک کہ مائیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تب ناچار سلطانہ بیگم خود اُستانی اصغری خانم کے پاس آئیں سلام و دعا اور مزاج پُرسی کے بعد سلطانہ بیگم بولیں۔ اُستانی جی اِتم ہیں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی کہ آج جاؤں کل جاؤں لیکن تمھاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں ملتی۔ سینی میں نہیں پروتی میں نہیں۔ مگر کام ہے کہ سمٹنے میں نہیں آتا۔ آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی۔ سو کام کا ہرج کیا اور میں نے کہا چلوں ذرا کھڑے کھڑے اُستانی جی سے مِل آؤں۔

اُستانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے۔ آپ نے ناحق تکلیف کی مجھ ہی کو بُلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سینے اور مسالا ٹانکنے کو آپ کے یہاں سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ جوڑے ماشاء اللہ بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر جانے والے ہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر نہیں حسن آرا کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور مسالا بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا۔ اُس جوڑی کی گلبدن کے پائجامے میں جو میں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گوکھرو کچھ زیادہ گیا ہے۔ بہتیرا شہربانو کہتی رہی کہ اُستانی جی لاؤ اُدھیڑ کر پھر ٹانک دوں میں نے کہا خیر رہنے بھی دو اُدھیڑنے سے گوکھرو خراب ہو جائے گا۔ آیندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا پھڑک گئیں اور کہنے لگیں بھر کہاں مردوں کی ٹھپکی اور کہاں عورتوں کی۔ میں بولی ارے مردِوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ اَئے حضور یہ جوڑا میاں علی جان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب کہ عورتوں کا کام کیسا ہی سجل کیوں نہ ہو مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں۔ کہاں کے علی جان اور کیسے مرد یہ جوڑا تو میری اُستانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور اُن ہی نے اس میں مسالا بھی ٹانکا ہے۔ یہ سُن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں۔ حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ سُتھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا۔

اُستانی جی۔ خیر اور جوڑوں کی سلائی مجکو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے حسن آرا کے تمام جوڑے یہیں بھیج دیئے ہوتے لڑکیاں تو خوشی خوشی سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم۔ اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا۔ مغلانیوں سے میں نے صرف موٹا کام لیا۔ چاندنیاں ہوئیں گھٹریاں ہوئیں۔ دسترخوان ہوئے۔ سوزنیاں ہوئیں۔ موباف۔ غلاف۔ تکیے۔ تو شک۔ لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ

مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے۔ باقی پہننے کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی اماں کے ہاں بنے پروئے گئے۔ **استانی جی**۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو نصیب ایک یہ ہزاروں اور گھس پس کر پرانے ہوں۔ **سلطانہ بیگم** ٹھنڈا سانس بھر کر ہاں استانی جی دعا کیجئے اللہ نصیب اچھے کرے۔ بیٹیوں کا بھی کچھ عجب نازک معاملہ ہے۔ کن کن مصیبتوں سے پالو پرورش کرو اور پھر دھن پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک سمدھیانہ کر کے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور کان امیٹھا۔ ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی۔ میں نے کہا حاشا اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی میں شہر میں اب بیٹی نہ دونگی۔ کالا مونھ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے۔ سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے ہاتھ شرم ہے۔ **استانی جی**۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیئے اول تو جھجھر والے خود بڑے رئیس ہیں۔ دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ ان شاء اللہ دیکھ لیجیئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو الٹا الاہنا دیجئے گا کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ **سلطانہ بیگم**۔ فرق تو آپ کی عنایت سے زمین و آسمان کا ہے۔ آپ کے فیضانِ تعلیم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرّے کو خورشید، پوتھ کو لعلِ سفید حیوان کو آدم، حسنا کو ماشاء اللہ حسن آرا بیگم بنا دیا۔ اِس کی خوبی تقدیر کی ایک یہی بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اُس کی استانی ہیں۔ یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہونِ منت رہیں گے۔ مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی تیاری ہوتی دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے۔ یوں ہی گھر میں اُس کا جی نہیں لگتا۔ اب اور بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے۔ ارادہ تھا کہ پورے مہینے بھر مائیوں بٹھاؤں گی۔ اُس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ مائیوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے۔ رنگت زرد ہو گئی ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ دیکھو اداس صورت دیکھو غمگین۔ میں کہتی ہوں اِس کو اتنا فکر کیوں ہے۔ اِس عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں ماشاء اللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے۔ یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال ہو گا۔ **سلطانہ بیگم**۔ گھر کی تو اُس کو مطلق پروا نہیں۔ البتہ مکتب اُسکی جان ہے۔ دیکھیئے کیونکر بچی کا دل بہلے گا **استانی جی**۔ میں سمجھا دوں گی۔ اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہی ہوتا ہے۔ **سلطانہ بیگم**۔ اترسوں خیر سے پچیسویں تاریخ اور جمعے کا دن ہے اگر آپ اجازت دیں تو حسنا کو مائیوں بٹھا دیا جائے۔ کنبے والے پچھوا پچھوا بھیجتے ہیں کہ اب تک لڑکی کو مائیوں نہیں بٹھایا۔ **استانی جی**۔ خدا مبارک کرے۔ تاریخ بھی اچھی۔ دن بھی اچھا۔ اور حسن آرا بیگم کو مائیوں بٹھانے کی تو کچھ ضرورت نہ تھی مگر خیر دنیا کی رسم ہے۔ **سلطانہ بیگم**۔ پھر آپ فرمائیں تو حسنا گھر سے نہ نکلے۔ میں تو کئی دن سے کہہ رہی ہوں مونھ سے تو کچھ نہیں کہتی آنکھ بچی اور مکتب میں۔ **استانی جی**۔ کل اور معاف کیجئے پرسوں ان شاء اللہ میں حسن آرا بیگم کو مکتب سے رخصت کروں گی۔ لڑکیوں کی خواہش ہے کہ کل دونوں وقت مکتب کی طرف سے حسن آرا بیگم کی دعوت ہو۔ رت جگا کریں۔ پرسوں سویرے ذرا آپ بھی جمال آرا بیگم کو ساتھ لے کر تشریف لائیے گا۔ اور لڑکیوں کی مائیں بہنیں بھی آئیں گی۔ اِس کے بعد سلطانہ بیگم تو رخصت ہوئیں۔ اگلے دن بڑے تکلف اور بڑی دھوم کے ساتھ حسن آرا بیگم کی دعوت ہوئی۔ مکتب کی لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں

وہ وہ کھانے پکائے کیا کوئی رکاب دار پکائے گا۔سات کورت جگا ہوا حسن آرا کے سہاگ اور رائیوں کے گیت گائے گئے اور لڑکیوں نے یہ بھی صلاح کی کہ مکتب کی طرف سے پڑھاوے کا جوڑا تو خیر دیا ہی جا سے گا مانجھے کا جوڑا بھی مکتب ہی کا ہو اور حسن آرا بیگم ہی جوڑا پہن کر مکتب سے رخصت ہوں۔صبح سویرے اُٹھ۔نماز اور تلاوت سے فارغ ہو مکتب میں جھاڑو دلوا سلیقے کے ساتھ دالانوں میں صاف اور ستھرا فرش بچھوا دیا۔اتنے میں مہمانوں کی ڈولیاں آنی شروع ہوئیں۔کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا۔لڑکیوں کی ماں بہنوں میں تو کوئی بھی ایسی نہ تھی کہ نہ آئی ہو محلے کی ساری بیویاں بے بلائے سیر دیکھنے کو آموجود ہوئیں اور اچھی خاصی شادی رچ گئی۔بیچ والان میں جہاں سوزنی گاؤ تکیہ بچھا تھا اُستانی جی بیٹھیں اور سارے مہمان اُسی دالان میں آکر بھر گئے۔جب سب لوگ بیٹھ بٹھا چکے تو اندر کوٹھری سے لڑکیاں حسن آرا بیگم کو مانجھے کا جوڑا پہنا کر باہر لائیں اور اُستانی جی کے عین سامنے لا بٹھایا تب اُستانی جی نے حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر یہ تقریر کی۔کہ بُوا حسن آرا بیگم! آج مَیں تم کو اپنے اور اپنی مکتب کی لڑکیوں کی طرف سے رخصت کرتی ہوں۔آج اُستادی۔شاگردی۔اور ہم مکتبی سب کا خاتمہ ہو گیا۔یہ سُن کر سارے مہمانوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے اور اُستانی جی کا بھی دل اس قدر بھر آیا کہ ضبط کرتی تھیں مگر آواز سے رقت ظاہر تھی مگر محبت اخلاص ان شاء اللہ جب تک دم میں دم ہے باقی رہے گا حسن آرا بیگم مَیں تم کو مثل اپنی بتول کے اور محمودہ کے چاہتی اور پیار کرتی تھی۔اور کرتی ہوں اور جب تک دنیا میں ہوں خدا نے چاہا کروں گی۔مگر اُستادی شاگردی کا ایسا ناطا ہے کہ مجھ کو اس محبت کا برتاؤ رکاوٹ کے ساتھ کرنا پڑتا تھا کبھی کبھی مَیں نے تم کو تمھاری غلطیوں پر تنبیہ کیا ہوگا۔بلکہ شاید کسی بے جا بات پر ملامت بھی کی ہو سو وہ تنبیہ اور ملامت سب تمھارے فائدے تمھاری اصلاح اور تمھاری بہتری کے واسطے تھی۔جب دو آدمی دنیا میں کسی طرح کا تعلق رکھتے ہیں چاہے وہ تعلق ہمسایہ گی اور ہم وطنی اور انسانیت ہی کا کیوں نہ ہو مگر بہت سے حقوق ایک کے دوسرے پر ہوتے ہیں وہ تعلق جو مجکو تمھارے ساتھ تھا میں کہہ چکی ہوں کہ تعلقِ مادری و فرزندی کے قریب قریب تھا۔ہر چند میں تمھارے حقوق کے ادا کرنے میں اپنے مقدور بھر کوشش کرتی رہی ہوں۔لیکن ممکن ہے کہ مجھ سے تمھارے کسی حق کے ادا کرنے میں کچھ فروگزاشت ہوئی ہو سو آج میں اِس بھرے مجمع میں تم سے بہ منت اس کی معافی چاہتی ہوں اس واسطے کہ مَیں بھی آدمی ہوں اور آدمی کو کبھی یہ غرور نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے فرائضِ انسانیت کو پورا پورا ادا کیا ہے (ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور ہوا مگر اُس کے ساتھ رقت بھی تھی) بوا حسن آرا بیگم! انسان کا خمیر اُنس سے ہے دو چار دفعہ کی صاحب سلامت سے آدمی کو آدمی کی محبت پڑ جاتی ہے اور تم سے تو تین برس کامل اس درجے کا اختلاط رہا کہ رات دن پاس رہنے کا اتفاق ہوا پس آج میں تم کو اُسی صدمے اُسی درد اُسی رنج کے ساتھ رخصت کرتی ہوں جس طرح بتول اور محمودہ کو کروں گی۔اگر خدا کو منظور ہے۔سب جتنے اِس وقت موجود تھے پکار کر رو دئیے۔

(اُستانی جی۔تھوڑی دیر ضبط کرنے کے بعد) بُوا حسن آرا بیگم! میں جُدائی اور رخصت کے مضمون کو بار بار کہنا نہیں چاہتی اس واسطے کہ اس سے تم کو اور مجھ کو اور سب سُننے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔مگر غور کرو تو تمھارا رخصت ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے دنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور ہے کہ بیاہ ہوا اور ماں باپ سے جُدا ہوئیں۔مجھ کو بھی اپنی ماں سے کبھی ایسا ہی تعلق تھا کہ جیسا تم کو اب بیگم صاحب سے یا مجھ سے ہے۔تمھاری طرح میں بھی ایک آپا رکھتی تھی۔تمھاری جیسی سہیلیاں میری بھی تھیں مگر آخر سُسرال کی نئی دنیا میں آکر بسی اور کیا مَیں اکیلی بسی۔مجھ ایسی ہزاروں لاکھوں تم کو شاید شہر کے باہر بیاہے جانے کا خیال ہوتا ہوگا۔

سو جھجر کچھ دور نہیں ہے۔ باہر شہر ہی کر تمھارے واسطے نہیں جن کے لیئے ماشاء اللہ ہر طرح کی سواریاں موجود ہیں۔ اگر آنا چاہو تو پھر
نہیں سو اپہر۔ بوا حسن آرا بیگم! ایسے کے تعلقات یاد رکھو۔ رفتہ رفتہ خود بہ خود ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔ پس کیا دل کو اتنا سمجھا لینا
بڑا کام ہے کہ پہلے ہی سے اِدھر کے تعلقات کو ضعیف فرض کر لیا جائے۔ حسن آرا بیگم! تمھاری حالت میں جو انقلابِ عظیم ہونے والا
ہے مجھ کو اُمید ہے کہ تم اُس سے بے خبر نہیں ہو اور تم کو شکر کرنا چاہیئے کہ جس امتحان کے لیئے تم بلائی جاتی ہو تم کو اُس کے واسطے
طیاری کرنے کی اچھی خاصی فرصت اور فراغت حاصل تھی۔ جو کچھ تم نے پڑھا اور سیکھا اور سُنا اَب اس امتحان میں تمھاری اصلاح کا
اور مددگار ہوگا۔ جو شخص تمھاری طرح کتابوں کا ذخیرہ پاس رکھتا ہے اگر وہ اپنے تئیں تنہا سمجھے یا وہ اپنے تئیں اپنے پیاروں سے
بچھڑا ہوا خیال کرے تو یہ اُس کی غلطی ہے۔ یہی کتابیں تمھاری تنہائی کی سہیلیاں ہیں۔ اور سہیلی بھی کیسی ماں کی طرح مہربان
اُستانی کی طرح شفیق۔ مونس۔ غمخوار۔ رفیق۔ غمگسار۔ ناصح۔ دوست دار۔ خیر خواہ۔ وفا شعار۔ بوا حسن آرا بیگم! اَب تک جو کچھ
تم پڑھتی رہیں تم کو قصے اور کہانیاں معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن وہ کہانی اب تک جگ بیتی تھی اور اب اپنی بیتی ہوگی۔ جتنی کتابیں
تمھارے پاس ہیں اگرچہ تھوڑی ہیں مگر غور کرنے اور عمل کرنے کو بہت ہیں اور ہیں تمھارے ہی فائدے کی نظر سے۔ آخری
نصیحت تم کو کرتی ہوں کہ تم اسی طرح التزام کے ساتھ ان کو پڑھتی اور دیکھتی رہنا جیسے مکتب کی حالت میں پڑھا اور دیکھا کرتی تھیں
جس روز سے تم مکتب میں داخل ہوئیں مَیں نے تمھارے حالات قلم بند کرنے شروع کر دیئے تھے اور اب تک جو مباحثے۔ اور
مطارحے تم میں اور لڑکیوں میں واقع ہوئے ہیں سب کو سلسلہ وار لکھتی چلی گئی اَب میں دیکھتی ہوں تو اُن سے ایک اچھی خاصی
کتاب بن گئی ہے بنات النعش مَیں نے اُس کا نام رکھ دیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جو مَیں تم کو بہ طور اپنی یادگار کے دیتی ہوں۔
کتاب کی دیکھا بھالی میں دو چار لمحہ سلسلۂ سخن منقطع رہا اور پھر اُستانی جی نے اپنی تقریر شروع کی۔ بوا حسن آرا بیگم! اس کتاب
میں تم اپنی بلکہ مکتب کی سب لڑکیوں کی ہو بہو تصویریں پاؤ گی۔ یہ سن کر کل حاضرین جنھوں نے کتاب کو اچھی طرح اُلٹ پلٹ کر
دیکھا تھا متعجب ہوئے۔ اُستانی جی۔ تصویر سے میری یہ مراد ہے کہ تمھارے مزاج۔ تمھاری عادت۔ تمھاری خو بو کا اس میں ایسا
بیانِ کامل ہے کہ جو تمھارے حالات سے واقف ہے کتاب سے پڑھتے کے ساتھ سمجھ جائے گا کہ تمھارا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب تم کو وہ عادتیں
یاد دلائے گی جن کی اصلاح میں مجھ کو بڑے بڑے اہتمام کرنے پڑے ہیں۔ تم کو اس کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ گویا پھر
وہی تم ہو اور وہی مکتب ہے وہی بات بات پر ضد ہے اور وہی بات بات پر تعجب ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے تم کو معلوم ہوگا کہ مکتب کی
تعلیم نے تم پر کہاں تک اثر کیا۔ کون کون بُری عادتیں تھیں کہ چھڑا دیں۔ کون کون سی غلط فہمی تھی کہ اُس کی اصلاح کی اور کون کون
سی نیک باتیں ہیں کہ اولاً اُن کی بہتری تم سے تسلیم کرا کے پھر تم کو اُن کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ ظاہر میں تم آج سے اِس مکتب سے
جُدا ہوئیں مگر میرے اور مکتب کی لڑکیوں کے دلوں سے ہمیشہ تم نزدیک رہو گی اور وقتاً فوقتاً جو فائدہ تم کو اس مکتب سے پہنچنا
ممکن ہے پہنچتا رہے گا۔ جو نئی کتاب ہم لوگ پائیں گے یا جو عمدہ مضمون سُنیں اور دیکھیں گے ضرور تم کو اُس کے پڑھنے میں شریک کر لیا
کریں گے۔ بوا حسن آرا بیگم! تم جانتی ہو کہ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن خدا کا شکر کرتی ہوں کہ مَیں اپنی حالت سے رضا مند اور
اپنی حیثیت میں خوش ہوں کیوں کہ بقول ایک بزرگ کے آسمان کو دیکھتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ ضرور کسی نہ کسی دن طائرِ روح قفسِ عنصری
سے نکل کر اوجِ فلک پر پرواز کرتا ہے۔ پھر زمین کو دیکھتی ہوں اور پاتی ہوں کہ جب مروں گی تو صرف چند بالشت زمین میری ہڈیوں کے لیئے

درکار ہوگی۔ پھر غور کرتی ہوں تو دنیا میں نہ کچھ ساتھ لائی اور نہ کچھ ساتھ لے جاؤں گی اور ہزاروں لاکھوں خدا کے بندے ایسے
ہیں کہ اُن کے مقابلے میں ہر طرح اور ہر اعتبار سے میری حالت بمدارج بہتر ہے۔ اِن خیالات نے میرے دل پر یہ اثر کیا ہے کہ دوزخ
شکم بھرنے کو کچھ دال دلیا اور تن بدن ڈھانک لینے کو کچھ موٹا جھوٹا کپڑا اُس کے سوا دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا ہونا میں
اپنے واسطے ضروری سمجھوں اُس کے حاصل کرنے کی فکر کروں پھر بھی خدا نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو ضرورت سے زیادہ اور حاجت
سے بڑھ کر بہت کچھ دے رکھا ہے۔ کچھ تھوڑا سا باقتضائے محبت اُس میں سے اور کچھ رقم مکتب سے لے کر میں نے دو سو روپیہ کا
ایک جوڑا تمھارے لیئے بنایا ہے۔ مکتب کی رقم تم جانتی ہو کہ میں اُس کی مالک نہیں ہوں لڑکیوں کی چیز ہے جن کاموں کے دام
سے یہ رقم فراہم کی جاتی ہے پس یہ جوڑا خلعتِ مکتبی ہے جو میں تم کو نہایت خوشی سے دیتی ہوں خدا تم کو اس کا پہننا مبارک کرے
تمھارے جہیز میں اِس سے کہیں زیادہ قیمت کے جوڑے ہوں گے مگر جب دیکھو گی کہ کس چاؤ اور کس شوق اور کس محبت سے
ہم چند غریب آدمیوں نے مل کر یہ جوڑا بنایا ہے تو ہم سب کو اُمید ہے کہ تمھارے قیمتی اور عمدہ اور نفیس جہیز میں اس کا شامل کیا
جانا کچھ بدنما نہ ہوگا۔ یہ سُن کر حسن آرا نے پھر اُسی حالت سے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُستانی جی۔ لو حُسن آرا بیگم! اب دن زیادہ چڑھ
گیا ہے اور لوگوں کے کھانے پکانے کا وقت ہے میں نہیں چاہتی کہ زیادہ دیر تک تم سب کو باتوں میں لگائے رکھوں مگر صرف ایک
بات اَور کہہ لینے دو کہ اگر اُس کو نہ کہوں گی تو گویا تمھارا فرضِ رخصت میرے ذمے رہ جائے گا۔ لڑکیاں جو بیاہ ہوئے پیچھے
ماں باپ۔ بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب سے جدا ہو کر سسرال جاتی ہیں۔ اِس انقلابِ حالت میں خدا تعالیٰ ہم عورتوں کو اپنے
فضل سے اُس انقلاب کا نمونہ دکھاتا ہے جو ہر بشر کے واسطے مقدر ہے دنیا ہمارا میکا ہے اور عاقبت بجائے سسرال کے ہے کوئی
لڑکی سدا میکے میں نہیں رہتی۔ اور بیر سویر ایک نہ ایک دن اُس کو سسرال جانا ہوگا اِسی طرح کوئی شخص ہمیشہ دنیا میں نہیں رہے گا
سدا رہے نام اللہ کا۔ جس لڑکی نے میکے میں رہ کر ہنر سیکھا عقل و تمیز حاصل کی سسرال میں بھی ساس سسرے کی لاڈو۔ نند
بھاوجوں کی چہیتی اور اپنے میاں کی پیاری ہوگی۔ اِسی طرح جس نے دنیا میں رہ کر اچھے عمل اور نیک کردار کیے۔ عاقبت میں اُسی
کی عزت اور اُسی کی توقیر ہے اور ایسے ہی لوگ بہشت کے مالک ہوں گے مگر جس لڑکی نے ماں باپ کی نازبرداریوں میں وقت
کو ضائع کیا اور اپنے مزاج کی اصلاح اور عادات کی درستی اور تحصیل ہنر کا کچھ فکر نہ کیا سسرال میں جائے گی تو میاں کی نظروں میں
ذلیل ساس نندوں کے نزدیک بے وقر۔ بعینہٖ وہی حال ہوگا اُن کا جو زندگی کے دن غفلت اور بے پروائی میں اکارت کرتے
ہیں قیامت میں رسوا اور ذلیل ہوں گے۔ جس طرح لڑکیاں میکے سے جہیز لے کر جاتی ہیں دنیا کے میکے کا جہیز اپنے اپنے عمل
ہیں جو آدمی کے ساتھ جاتے ہیں۔ حسن آرا بیگم! میں جانتی ہوں کہ ان دنوں تمھارے دل میں عجب عجب طرح کے خیالات گزرتے
ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ مگر اپنے خیالات کو ذرا اونچا کرو اور اپنی نظر کو تھوڑا اور آگے بڑھاؤ۔ سوچنے اور سمجھنے کی بات
ہے تو یہ ہے کہ دنیا کیا چیز ہے کس لیئے ہم یہاں آئے ہیں کیا ہم کر رہے ہیں اور انجام کار کیا ہونا ہے۔ جس طرح تمھارے میکے رہنے
کے دن پورے ہو چکے ہر شخص کے واسطے ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اُسکی مدتِ حیات تمام ہو جائے گی۔ اور سب مل کر اس وقت
خدا کی درگاہ میں دعا کریں کہ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق دے ہر طرف سے آمین آمین کا شور ہوا م دنیا کے میکے اور سسرال میں
تو چند روزہ ہیں الٰہی اس جہان میں سدا سدا کو رہنا ہے پردہ رکھ لیجیو اور فضیحت مت کیجیو (سب نے پکار کر کہا آمین آمین) الٰہی

یہ تیری کنیز جس کو ہم حسن آرا بیگم کہہ کر پکارتے ہیں منزلِ دنیا جس کو ہم سب تیرے حکم سے طے کر رہے ہیں شروع کرنے والی ہے تیرا فضل و کرم اس کا حافظ۔ تیری توفیق اس کا بدرقہ۔ تیری عنایت و مہربانی اس کی زادِ راہ ہو (سب کو رقت ہوئی اور سب نے کہا آمین) اس کے بعد اُستانی جی نے اُٹھ کر دیر تک حسن آرا کو گلے لگا کر پیار کیا اور آہستہ آہستہ کوئی دعا پڑھ کر حسن آرا پر دم کی اور دروازے تک ساتھ لے جا کر پالکی میں سوار کرا دیا اور مجلس تمام ہوئی۔“

بنات النعش پر ڈائرکٹر صاحب کا ریمارک

ڈائرکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس کتاب پر ریویو کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجنسہٖ درج کر دیا جائے ”اس کتاب کو مرآۃ العروس کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس طور سے کہ اس میں اُس خاندانی لڑکی کی تعلیم کا بیان ہے کہ جس کا نام حسن آرا تھا۔ اور جس کا ذکر کتاب مذکور میں کیا گیا ہے۔ اُس کی تصویر ایک لاڈلی بگاڑی ہوئی لڑکی کی ہے۔ حسن آرا کی خالہ کے صلاح و مشورے سے اصغری (جس کا ذکر مرآۃ العروس میں ہے) کی زیرِ نگرانی میں حسن آرا نے کتابیں پڑھنا اور تحصیل علم شروع کیا جس سے اُس کی حالت سنبھل گئی۔ اصغری کی نند محمودہ نے حسن آرا کی اصلاح میں ایک بھاری حصہ لیا ہے۔ جو سبق اور لکچر شاگردوں کو دیئے گئے ہیں اور اُس کے متعلق اُن کی آپس میں گفتگو ہوئی ہے اس کتاب کا مواد ہے۔ یہ کتاب فی الحقیقت ”سینڈ فورڈ اور مرٹن“ کے تعلیمی قصوں اور سائنس کے آسان مسائل کے طرز پر ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جو لڑکیوں کے حالات کے مناسب ہوں۔ قصے کے طور پر ایک مختصر بیان قابلِ توجہ ہے جو ایک قابلِ قدر قصہ ہے اور وہ ایک دل چسپ تمثیل ۱۸۵۷ء کے تشویش ناک واقعات کی ہے۔ کام کاج کی عادتیں اور روزانہ ریاضت کے فائدوں کے بیان محمودہ نے اپنا ذاتی تجربہ ایامِ غدر کا بیان کیا ہے جب کہ دفعۃً اس کو اپنا مکان دہلی سے چھوڑنا پڑا۔ ایسی حالت میں کہ نقل مکان اور سواری کا کچھ انتظام نہ تھا۔ سائنس کے متعلق مضامین عمدگی سے اور فطری طور پر بیان کیئے گئے ہیں۔ یہ سبق صرف انگریزی سے ترجمہ نہیں کیئے گئے ہیں اور اغلب ہے کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو دل چسپ اور بکار آمد ہوں گی یہ ایک عام پسند مقدمے۔ جغرافیۂ طبعی۔ مقناطیس۔ علم ہیئاۃ اور انتظام خانہ داری کے ہیں۔ جو بیانات اِن مضامین پر لکھے گئے ہیں اُن سے میرا خیال آرچ بشپ وہٹلے کی کتاب کے آسان مباحث کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ جن سے ہمارے مدارس دستور العمل کے نام سے واقف ہیں۔ مجھے اپنے جانشین کے خیال سے اتّفاق ہے کہ زبان صاف اور کھری ہے۔ اور طرزِ بیان ٹھیک وہی ہے جو ایک ایسی کتاب میں ہونا چاہیئے جو لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے لکھی گئی ہو۔ اور ان اعتبارات سے غالباً مرآۃ العروس سے کم تر نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ کہنا چاہتا ہوں اور میری رائے یہ ہے کہ مصنف اپنے نقشِ اولیں پر سبقت لے گیا ہے۔ مصنف نے پھر ایک نمونہ ایسا پیش کیا ہے کہ اُردو تحریر ایک فہمیدہ عالم کے قلم سے بلا تر غیب مبالغہ اور نمایش کے لکھنا ممکن ہے۔ بلکہ یہ نقشِ ثانی نقشِ اوّلیں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ اِس لیئے کہ اِس میں زیادہ تر مضامین معلوماتِ عامّہ اور علمی مذاق کے ہیں۔ بڑا نقص اس کتاب کا جیسا کہ تقریظِ سابقہ میں ٹھیک طور پر لکھا گیا ہے یہ ہے کہ اوقاف اور فقرے علی حدہ علی حدہ نہیں ہیں۔ اور اگر بلحاظِ فہرستِ مضامین اِس قسم کی تقسیمِ ابواب پر کر دی[1] جائے تو اس میں شک نہیں ہے کہ اس کتاب میں ایک بڑی خوبی ہو جائے۔

[1] حسبِ ایماء ڈائرکٹر صاحب بہادر بنات النعش میں ترمیم و اصلاح کر دی گئی۔ اس کتاب پر پہلے گریفتھ صاحب بہادر قائم مقام ڈائرکٹر نے ریویو کیا تھا اور گورنمنٹ میں تین سو روپیہ انعام کی سفارش کی تھی مگر ڈائرکٹر مستقل مسٹر کمپسن نے واپس آ کر دوبارہ ریویو کیا اور پانسو انعام کی سفارش کی اور یہی انعام ملا ۱۲۔

حسب اشتہار گورنمنٹ پانسو روپیہ انعام دیا جاسکتا ہے اور بعد اس کے کہ مصنف اس کتاب کی تصحیح کرے اور جو اسقام اوپر بتلائے گئے ہیں اُس کو رفع کرے تو یہ کتاب سررشتہ تعلیمات اور عام لوگوں کے لیے طبع کی جائے۔ ۵ فروری ۱۸۷۲ء

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا ریمارک

آپ نے اِس کتاب کی وقعت کا جو اندازہ فرمایا ہے اُس سے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر متفق ہیں۔ جناب ممدوح مصنف کے لیے پانسو روپیہ کے انعام کی منظوری بہ خوشی عطا فرماتے ہیں اور تعلیم کی یہ ایک بہت بکار آمد اور عام پسند کتاب ہے۔ اور حسب رائے خود سررشتہ تعلیم اور عام استعمال کے لیے چھپوائی جائے۔ باب وار تقسیم اور مناسب سُرخیاں اول درج کرادی جائیں۔ مورخہ ۲۸ فروری ۱۸۷۲ء

توبۃ النصوح

یہ کتاب اعظم گڑھ کی تصنیف ہے۔ اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف اور ترجمے کے اعتبار سے اچھا کام یاب زمانہ تھا۔ مولانا نے وہاں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو اُن کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبول ناول ہے۔ دوسرے گولڈسمتھ کی ہسٹری کا ترجمہ کیا جس کا تذکرہ حصّہ دوم میں گزر چکا ہے۔ اِس کتاب میں کیا ہے۔ اس کو مولانا سے بہتر کوئی نہیں بیان کرسکتا ع "تصنیف را مصنّف نیکو کند بیاں" مولانا فرماتے ہیں۔ اِس کتاب میں انسان کے اُس فرض کا مذکور ہے جو تربیتِ اولاد کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کتاب کے تصنیف کرنے سے مقصودِ اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً عام لوگوں سے واقع ہو رہی ہے اُس کی اصلاح ہو اور اُن کے ذہن نشین کردیا جائے کہ تربیتِ اولاد صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کردیا۔ روٹی کما کھانے کا کوئی ہنر اُن کو سکھا دیا۔ اُن کا بیاہ برات کردیا۔ بلکہ اُن کے اخلاق کی تہذیب اُن کے مزاج کی اصلاح اُن کی عادات کی درستی۔ اُن کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے۔ افسوس ہے کہ کتنے لوگ اِس فرض سے غافل ہیں۔ کوئی شخص تربیتِ اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کرسکتا تاوقتیکہ وہ خود بھی اپنی شائستگی کا نمونہ اُن کو نہیں دکھاتا اور اولاد کے ساتھ اپنا برتاؤ محتسبانہ طور کا نہیں رکھتا۔ پرلے سرے کی بے وقوفی ہے اولاد کو اپنے کردارِ ناسزا کی بری مثالیں دکھانا اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ یہ لوگ بڑے ہو کر زبانی پند یا کتابی نصیحت پر کاربند ہو کر صالح اور نیک وضع ہوں گے سب لوگ اولاد کے ساتھ غایت درجے کی شیفتگی پیدا کرلیتے ہیں اور بمصداق حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ اُن کو اولاد کے عیوب پر آگہی نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو عیب کو عیب سمجھ کر نہیں مقتضائے عمر یا نتیجہ ذہانت یا دوسرے طور پر اُس کی تاویل کرکے اُن کی خرابیوں سے درگزرا اور چشم پوشی کیا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہ ہو۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرادے گی کہ تربیتِ اولاد ایک فرضِ موقت ہے یعنی لڑکے جب تک کم سن اور صغیر ہیں تربیت پذیر ہیں اور بڑے ہوئے پیچھے اُن کی اصلاح مشکل یا متعذر بلکہ محال ہو جاتی ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ بلا تخصیصِ مذہب تلقینِ حسنِ معاشرت اور تعلیم نیک کرداری و اخلاق کی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے۔ لیکن نیکی کو مذہب سے جُدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بُو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ اور منفک کرنے کا قصد کرے۔ ادھر تو انضمام مذہب ایک امر ناگزیر ہے اور اُدھر اختلاف مذہب جو اس ملک میں اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ گویا ہر کوڑی آدمی ایک جدا مذہب رکھتے ہیں۔ آنکھیں دکھا رہا ہے۔ لوگوں ہی میں اس بلا کا تعصب آگیا ہے کہ کیسی ہی اچھی بات کیوں نہ کہی جائے دوسرے مذہب والے اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

[۱] یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَھُمْ فِیْ اٰذَانِھِمْ مضمون جس کو میں نے ایک فرضی قصے اور بات چیت کے طرز پر لکھا ہے مذہبی پیرایے سے تو خالی نہیں ۔ اور خالی ہونا ممکن نہ تھا لیکن تمام کتاب میں کوئی بات ایسی بھی نہیں جو دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی یا نفرت کا موجب ہو بلکہ جہاں جہاں ضرورۃً مذہبی تذکرہ آ گیا ہے وہ ایسے طور کا ہے کہ دوسرے مذہب والے بھی اسی طرح کے عقیدے رکھتے ہیں صرف اصطلاح و عبارت کا تفرقہ ہے۔ [۲] لَا مُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ مثلاً مسلمانوں کی نماز وہی ہندوؤں کی پوجا پاٹھ ہے۔ مسلمانوں کا روزہ ہندوؤں کا برت ۔ مسلمانوں کی زکوٰۃ ہندوؤں کا دان پُن وقس علیٰ ہذا یہ قصہ اگرچہ ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر بتغیرِ الفاظ ہندو خاندان بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ خاندان جو فرض کیا گیا ہے اس میں دو میاں بی بی ہیں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو پکی عمر کے ہیں اور بیاہے جا چکے ہیں اور لاجرم ان کی عادتیں راسخ۔ ان کی خصلتیں کالطبیعۃ ہیں ۔ منجھلا بیٹا اگرچہ عمر اس کی بھی کم نہیں لیکن اس نے مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور وہ صرف توجہ کا محتاج ہے جیسے گھوڑا کہ بے راہ چلا جا رہا ہے اس میں رفتار پیدا کرنے کی ضرورت نہیں باگ کا موڑ دینا کافی ہے منجھلی لڑکی کم سن ہے وہ عمر کے اس درجے میں ہے جب کہ بچوں کی قوتِ تفتیش و تلاش تیز اور نقل کرنے کی امنگ بہ سرعت ترقی ہوتی ہے۔ وہ بھولے پن سے اس طرح کے سوالات کرتی اور سادہ دلی سے ایسی ایسی باتیں پوچھتی ہے کہ ماں قائل ہو ہو جاتی ہے جس طرح پر اس خاندان کے لوگ زندگی کرتے ہوئے فرض کیے گئے ہیں وہ ایک سچا بلا تصنع نمونہ ہے اس زمانے کے ہر ایک خاندان مدعی شرافت کے طرز ماند و بود کا ۔ ایسا فرض کیا گیا ہے کہ رئیس البیت یعنی خاندان کا سرگروہ جس کا نام نصوح ہے ایک وبائی ہیضے میں مبتلا ہوا اور اس کی حالت ردی اس قدر ہوتی گئی کہ اس کو اپنے مرنے کا تیقن کرنا پڑا اور چوں کہ اسی وبا میں چند روز پہلے اسی گھر کے تین آدمی مر چکے تھے اور شہر میں موت کی گرم بازاری تھی تو ایسی حالت میں نصوح کا اپنی نسبت موت کا تیقن ایک معمولی بلکہ ضروری بات ہے۔ نصوح کو ڈاکٹر نے جو اس کا معالج تھا خواب آور دوا دی تھی وہ سو گیا اور اس کے اگلے پچھلے خیالات ایک خواب بن کر اس کے سامنے آ موجود ہوئے ۔ خواب جو نصوح نے دیکھا تمام قصے کی جان ہے ۔ حشر اور اعمال نامہ اور حساب قبر کی تکلیف اور دوزخ کا عذاب یعنی قیامت کے حالات جن کا وہ اپنے مذہب اسلام کے مطابق معتقد تھا خواب میں اس کو واقعات نفس الامری دکھائی دیے جاگا تو خائف و ہراساں بیدار ہوا تو ترساں و لرزاں ۔ خوف کا نتیجہ اور ہراس کا اثر جو نصوح پر مترتب ہوا قصے کے پڑھنے سے ظاہر ہوگا۔ اس نے نہ صرف اپنے نفس کی اصلاح کی بلکہ سارے خاندان کی اصلاح کو اپنے ذمے فرض و واجب سمجھا۔ چوں کہ خاندان کے چھوٹے بڑے سب اس طرزِ جدید سے ناآشنا تھے کنفس واحدۃٍ نصوح کے مقابلے پر کمربستہ ہو گئے اور اس کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں لیکن چوں کہ نصوح کے ارادے میں استحکام اور اس کے دل کو خدا کا بھروسا تھا وہ غالب آیا مگر مشکل سے اس کو ظفر ہوا مگر دشواری سے ۔ کیوں کہ اولاد میں جو جتنا عمر رسیدہ تھا اسی قدر عسیر الانقیاد تھا۔ تربیتِ اولاد جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے ایک شعبہ ہے اس عام انسانی ہمدردی اور نفع رسانی کا جو ہر فرد بشر پر اس کی استطاعت کے قدر واجب ہے...۔"

اگرچہ خلاصۂ کتاب اس ریویو میں آ گیا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نصوح کا خواب بھی درج کر دیا جائے ۔ مگر قبل اس اقتباس کے توبۃ النصوح کے متعلق ہم دو واقعات لکھنا چاہتے ہیں ہمارے نزدیک اس کتاب کے حرفوں میں ایک ایسی بیش

[۱] کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں ۱۲ [۲] اصطلاح ٹھیرا لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے اس میں کسی کو کیوں عذر ہونے لگا ۱۲-

قیمت چیز پوشیدہ ہے جس کو ہم ساری کتاب کی جان کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ کچھ نہیں ہے سوائے اثر کے۔ اثر کی دو نقلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) صوبۂ بہار میں میرے ایک دوست تھے وہ ناقل تھے کہ وہاں کے کسی گورنمنٹ اسکول کے پانچویں کلاس میں ایک طالب علم پڑھتا تھا۔ توبۃ النصوح اُس زمانے میں بنگال و بہار کے انگلش اسکولوں کے کورس میں داخل تھی۔ معلوم نہیں اب ہے کہ نہیں۔ غرض اُس اسکول میں سالانہ تقسیم انعام کا جلسہ ہونے والا تھا جس وقت افسر اسکول کی آمد کی خبر معلوم ہوئی تو ہیڈ ماسٹر نے جو نہایت ہی علم دوست تھا عمائدین شہر کو بھی اِس جلسے میں مدعو کیا۔ غرض جلسہ منعقد ہوا۔ اسکول کے ہر ایک کلاس سے ایک ایک طالب علم قبل ہی سے اِس لیے منتخب کر لیا گیا تھا کہ کورس کی کسی کتاب کا ایک ایک حصہ حاضرین کو سنائے۔ چناں چہ اُس طالب علم سے کہا گیا کہ تم توبۃ النصوح پڑھنا۔ اُس نے کہا کہ بہتر۔ حکم کی تعمیل کروں گا۔ مگر آپ مجھے اس کتاب میں سے کوئی حصہ منتخب کر دیجیے۔ ہیڈ ماسٹر نے فرمایا کہ تم اپنے کلاس ماسٹر سے اس بارے میں مدد لو۔ وہ تمھیں کوئی پیس منتخب کر دیں گے۔ چناں چہ طالبِ علم مذکور کلاس ماسٹر کے پاس حاضر ہوا اور ہیڈ ماسٹر کا حکم سُنا دیا۔ کلاس ماسٹر نے کہا کہ میں تو کل کتاب کو ماسٹر پیس سمجھتا ہوں وہ ہمہ صفت موصوف ہے۔ انتخاب کا کوئی انتخاب کیا کرے۔ جس جگہ سے چاہنا پڑھ دینا۔ اور کہہ دینا کہ کلاس ماسٹر نے یہی پیس منتخب کیا ہے۔ بہر حال وقتِ مقررہ پر جلسہ منعقد ہوا اور جب اِس طالبِ علم کی نوبت آئی تو حاضرینِ جلسہ کے سامنے بُلایا گیا۔ ناظرین کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ افسرِ اسکول کو اُردو زبان سے بے حد شوق تھا۔ **افسرِ اسکول** (طالبِ علم سے) یہ کون سی کتاب ہے؟

طالب علم:۔ توبۃ النصوح۔

افسر اسکول۔ میں نہایت شوق سے اِس کتاب کو سنوں گا۔ اُردو میں یہ ایک لاجواب کتاب ہے۔ اچھا پڑھو۔

چناں چہ طالب علم مذکور نے آغازِ کتاب ہی سے اِس طرح پڑھنا شروع کیا۔ "اب سے دُور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا[1] کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔ ایک بازارِ موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی۔ جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدھی آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اُجڑے پڑے تھے کہ دن دو پہر جاتے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف۔ سودے والوں کی پکار بند ملنا جلنا۔ اختلاط و ملاقات۔ آمد و شد۔ بیمار پرسی و عیادت۔ بازدید و زیارت۔ مہمان نوازی و ضیافت۔ کل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا مصیبت میں گرفتار۔ زندگی سے مایوس۔ کہنے کو زندہ پر مُردے سے بدتر۔ نہ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں طاقت۔ بالو گھر میں اٹوانٹی کھوانٹی لے کر پڑ رہا۔ یا کسی بیمار کی تیمارداری کی۔ یا کسی عزیز آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگِ مفاجاۃ حقیقت میں ان ہی دنوں کی مَوت تھی۔ نہ سان نہ گمان اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کُلّی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے الا ماشاء اللہ کوئی جزوئی بچ گیا تو بچ گیا۔ ورنہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آ جانا۔ پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی۔ ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری دوا دعا جاں کنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا۔ غرض

[1] دلی میں قاضی کے حوض کے پاس اب بھی حکیم بقا کا کوچہ موجود ہے اس میں حکیم بقاء اللہ خاں کے پوتے پڑپوتے رہتے اور مطب کرتے ہیں ۱۲۔

کچھ اس طرح کی الم گیر[91] وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا پڑا تھا۔ دو پونے دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں سارا شہر کچھ ادھیا سا[92] گیا صدہا عورتیں بیوہ ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم بن گئے۔ جس سے پوچھو شکایت جس سے سنو فریاد۔ مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاکی تھا اور وہ اکیلا شکر گزار دنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مداح نہ اس سبب سے کہ اس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا خود اس کے گھر میں بھی اکٹھے تین آدمی اسی وبا میں تلف ہوئے۔ اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اٹھے نصوح نماز صبح کی نیت باندھ چکا تھا باپ بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ مسواک کرتے کرتے ابکائی آئی ابھی نصوح دوگانہ[93] فرض ادا نہیں کر چکا تھا۔ سلام پھیر کر دیکھتا ہے کہ باپ نے قضا[94] کی ان کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالہ تھیں ان کو جاں بحق[95] پایا۔ تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئیں مگر نصوح کی شکر گزاری کا کچھ اور ہی سبب تھا اس کا مقولہ[96] یہ تھا کہ ان دنوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ راستی پر آ گئی تھیں دلوں میں رقت[97] و انکسار کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت[98] سے پیدا ہونی دشوار ہے۔ غفلت کو ایسا کاری تازیانہ[99] لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سرگرم تھا۔ جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آ موجود ہوتے تھے۔ جنھوں نے بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا ان کے اشراق[100] و تہجد[101] تک قضا نہیں ہونے پاتے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی تعلقات زندگی کی ناپائداری سب کے دل پر منقش تھی۔ لوگوں کے سینے صلح کاری کے نور سے معمور تھے۔ غرض ان دنوں کی زندگی اس پاکیزہ اور مقدس اور بے لوث[102] زندگی کا نمونہ تھی جو مذہب تعلیم کرتا ہے۔ نصوح یوں ہی دل کا کچا تھا جب اس نے اول اول نناونے[103] کی گرم بازاری سنی سرد[104] ہو گیا اور رنگت زرد پڑ گئی۔ باسباب ظاہر جو تدبیریں انسداد[105] کی تھیں سب کیں۔ مکان میں نئی قلعی پھروا دی۔ پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی۔ گھر کے کونوں میں لوبان کی دھونی دے دی۔ طاقوں میں کافور رکھوا دیا۔ جا بجا کوئلہ ڈلوا دیا۔ باورچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں نمک ذرا تیز رہا کرے۔ پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے۔ گلاب۔ نارجیل[106] دریائی۔ جدوار۔ تمر ہندی[107]۔ سکنجبین وغیرہ جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کراتے ہیں تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں تاکہ خدانخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈنی نہ پڑے۔ نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیاں بھی فراہم کیں۔ کالرا پل کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لے لیں۔ کالرا ٹنکچر الہ آباد میڈیکل ہال سے روپیہ بھیج کر منگوا رکھا۔ آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلورو ڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں۔ ایک اخبار میں لکھا دیکھا کہ بنارس میں ایک بنگالی اس بیماری کا حکمی علاج کرتا ہے اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موعود ہے اس کا دعویٰ دار ہوا ہے۔ چٹھی لکھ کر اس کی دوا بھی طلب کی۔ نصوح کو ایک وجہ تسلی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق[108] اسی کے ہمسائے میں رہتا تھا۔ گو روسیاہ ہیضے کے توڑ کے

---

[91] عام۔ سارے جہان میں پھیلی ہوئی ۱۲ [92] آدھا سا رہ گیا ۱۲ [93] دو رکعت ۱۲ [94] مر گئے۔ ادا اور قضا ایک دوسرے کی ضد ہیں اس میں بھی لطف ہے ۱۲ [95] خدا کو جان سونپ دی ۱۲ [96] اس کا کہنا یہ تھا ۱۲ [97] نرم دلی ۱۲ [98] محنت جیسے روزے رکھنا ۱۲ [99] اثر کرنے والا کوڑا ۱۲ [100] آفتاب نکلے پیچھے کی نماز ۱۲ [101] آدھی رات کے بعد کی نماز ۱۲ [102] بے آمیزش۔ خالص ۱۲ [103] ہیضے کو عورتیں نناواں کہتی ہیں یعنی بے نام کی بیماری ۱۲ [104] ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے گرم اور سرد صنعت تضاد ہے ۱۲ [105] روک ۱۲ [106] ناریل ۱۲ [107] املی ۱۲ [108] ہوشیار۔ تجربہ کار ۱۲

واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا پر نہ بچا۔ باپ کی اجل آ گئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پونہچی کہ بڑے میاں ٹپکیاں[۱] لینے لگے۔ وہ رشتے کی خالہ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر[۲] تھیں کہ انھوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی غرض دوا اُن کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ڈکوسیں مگر اُس کی عمر ہو چکی تھی۔ اول اول نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ[۳] ہوا تھا مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور خود اُسی کے گھر میں تابڑتوڑ[۴] ایک چھوڑ تین تین موتیں ناچار تن بہ تقدیر صبر و شکر کرکے بیٹھ رہا۔ غرض پورا ایک چلّہ[۵] شہر پر سختی و مصیبت کا گزرا نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے یہاں تک کہ نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ جنازہ جامع مسجد[۶] کے صحن میں رکھا ہے۔ یوں تو ہزارہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃ الملک کی موت سب پر بھاری تھی اوّل تو اُن کی ٹکر[۷] کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا دوسرے اُن کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پونہچتا تھا گو اُن کے مرنے کا گھر گھر ماتم تھا لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک[۸] ڈالی کیوں کہ معتقدات[۹] عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کی بھینٹ[۱۰] لیے نہیں جاتی۔ خیر لوگوں نے کچھ سمجھا ہو یوں بھی شورش بہت کچھ فرو[۱۱] ہو چلی تھی اور امن و امان ہوتا جاتا تھا لوگوں نے دُکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا اُن ہی دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے اب خدا نے اپنا فضل کیا آج زردہ پکواؤ مگر تاکید کرنا کہ چاول کھڑے نہ رہیں شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسبِ عادت سو رہے۔ کوئی پہر رات باقی رہی ہوگی کہ دفعۃً نصوح کی آنکھ کھل گئی۔ جاگا تو پیٹ میں آگ پھنکی ہوئی تھی۔ اُٹھتے اُٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی اس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا خوب کس کر دونوں بازو باندھے گلے میں توے کی سیاہی تھوپی عطر کا پھویا ناک میں رکھا اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے بہتیرا ضبط کیا بہتیرا ٹالا آخر بڑے زور سے استفراغ[۱۲] ہوا گھر والے سب جاگ اُٹھے نصوح کو اس حالت میں باہر بیٹھا ہوا دیکھ سب کے کلیجے دھک[۱۳] سے رہ گئے۔ کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا۔ کوئی الائچی ڈال پان بنا کر پاس آ کھڑا ہوا۔ کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ نصوح کو تو لا کر چارپائی پر لٹایا اور اب سب لوگ لگے اپنی اپنی تجویزیں کرنے۔ کسی نے کہا خیر یہ ہی غذا تھی۔ کوئی بولا زردے میں گھی بُرا تھا۔ کوئی کہنے لگا گھر چن کا فساد ہے۔ غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے گلاب و سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا نصوح اگرچہ تکان کی وجہ سے مضمحل[۱۴] ہو گیا تھا مگر ہوش و حواس سب خدا کے فضل سے بجا تھے۔ سب کی صلاحیں اور تجویزیں سُنتا تھا اور دوا جو

---

۱ ہچکیاں ۱۲ ۲ لفظی معنی پیٹ بھری مراد یہ ہے کہ زندگی سے اُکتا گئی تھیں ۱۲ ۳ بھروسا ۱۲ ۴ اوپر تلے ۱۲ ۵ چالیس دن ۱۲ ۶ دہلی کی بڑی مسجد جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے لوگ بعض مُردوں کے جنازے جامع مسجد میں لے آتے ہیں تاکہ بہت سے نمازی جنازے کی نماز پڑھیں ۱۲ ۷ برابر کا۔ مقابلے کا ۱۲ ۸ یعنی بیماری کا زور دبا ۱۲ ۹ عام لوگوں کے عقائد ۱۲ ۱۰ قربانی ۱۲ ۱۱ دب چلی تھی ۱۲ ۱۲ قے ۱۲ ۱۳ جیسے دفعۃً ہو گئے سے دھکا لگ جائے ۱۲ ۱۴ نڈھال ۱۲

لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا۔ لیکن استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اُس نے کہہ دیا تھا کہ لو صاحب خدا حافظ ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔ استفراغ امتلائی مجھ کو بارہا ہوئے ہیں مگر کچھ میرا جی اندر سے بیٹھا جاتا ہی اور ہاتھ پاؤں میں سنسنی سی چلی آرہی ہی اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی اُدھیڑ بُن میں لگ گیا اور سمجھا کہ بس دنیا سے چلا۔ صبح ہوتے ہوتے ردّ دائرۃ کے کل آثار پیدا ہوگئے۔ بردِ اطراف تشنج۔ ضعف۔ متلی۔ اسہال تشنگی ہر ایک کیفیت اشتداد پر تھی موئے اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑا گیا۔ حکیم جی خود خفقانی المزاج ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے مگر بھاگتی مدّۃ کی راہ و رسم طوعاً کرہاً آئے اور کھڑے کھڑے کچھ اسما آثار کر چلے گئے بیمار میں تو بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی ایک پہر ہی بھر کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا۔ عورتوں نے پردے میں سے جہاں تک اس گھبراہٹ میں زبان لے یاری دی کہا لیکن حکیم صاحب یہی کہے چلے گئے کہ برف کے پانی میں نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ۔ تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواردی کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی فوراً آدمی کو شفاخانے دوڑایا اور ڈاکٹر دوالے صدا کی طرح آموجود ہوا اوپر تلے چار پڑیاں تو اُس نے اپنے سامنے پلائیں۔ چلتے ہوئے ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلا کر مریض کو علیحدہ مکان میں اکیلا لٹا دینا کوئی آدمی اُس کے پاس نہ رہے تاکہ اُس کو نیند آجائے۔ اگر سو گیا تو جاننا کہ بچ گیا۔ فوراً ہم کو خبر دینا۔ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سُلا کر لوگ ادھر اُدھر ٹل گئے مگر دبے پاؤں آکر دیکھ دیکھ جاتے تھے۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرۃ انگیز تھی۔ یہ کچھ تو بیماری کا اشتداد ہوا مگر ہوش و حواس سب بدستور تھے وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا لوگ جانتے تھے کہ غش میں پڑا ہی۔ ابتدا میں تو نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرنے سے گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھے بلکہ جو لوگ اِس کی علالۃ کو سوء ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے دل میں اُن کی رائے کی تحسین کرتا تھا۔ لیکن افسوس یہ مسرّۃ نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی دم بدم اُس کی حالۃ ایسی ردی ہوتی جاتی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف تھے۔ آخر چار و ناچار اُس کو سمجھنا پڑا کہ اب میں دنیا میں چند ساعۃ کا مہمان اور ہول اذعان مرگ کے ساتھ پہلا قلق اُس کو دنیا کی مفارقۃ کا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہی جس کا انقطاع نہیں۔ وہ جدائی ہی جس کے بعد وصال نہیں۔ وہ گم شدگی ہی جس کی کبھی بازیافت نہیں وہ غشی ہی جس سے افاقہ نہیں وہ بیگانگی ہی جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر روتا اور کبھی ساز و سامان دنیا پہ نظر کر کے سر کو دُھنتا اور کہتا ع

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اُس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا

---

۱ بہت کھا جانے کی وجہ سے جو قے ہو ۱۲ ۲ بگاڑ ۱۲ ۳ ہاتھ پاؤں کا ٹھنڈا پڑ جانا ۱۲ ۴ اینٹھن ۱۲ ۵ دست ۱۲ ۶ سختی۔ ترقی ۱۲ ۷ چار و ناچار ۱۲ ۸ اُلاہنا ۱۲ ۹ یوں ہی بے سوچے سمجھے کی ۱۲ ۱۰ چل چلاؤ کی ۱۲ ۱۱ گونج کی آواز جو لوٹ کر آتی ہی ۱۲ ۱۲ آہستہ کہ پاؤں کی آہٹ نہ ہو ۱۲ ۱۳ یعنی اُس کے سننے سے ڈرتا ہی ۱۲ ۱۴ بھاگتا تھا۔ بچتا تھا ۱۲ ۱۵ بدہضمی ۱۲ ۱۶ کہتا تھا کہ اُنھوں نے ٹھیک سمجھا ۱۲ ۱۷ خوشی ۱۲ ۱۸ موت کا یقین ۱۲ ۱۹ رنج ۱۲ ۲۰ جدائی ۱۲ ۲۱ ہو چکنا ۱۲ ۲۲ ملنا ۱۲ ۲۳ کھو کر پا جانا ۱۲ ۲۴ افسوس پلک جھپکانے میں یار کی صحبۃ ختم ہوگئی۔ ہم پھول کے مونھ کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہیں پائے کہ بہار کا موسم ہو چکا ۱۲

کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی ہی۔ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہی کہ اس کا متکفل[۱] ہو نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل کہ گھر کو سنبھال لے اندوختہ[۲] جو ہی سو واجبی ہی واجبی ہی کب تک اکتفا[۳] کرے گا دو ناکدخدا[۴] بیٹیاں اس کے آگے ہیں کچا ساتھ[۵] خالی ہاتھ بچوں کی پرورش کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں کیا ہوگا اور کیونکر یہ پہاڑ[۶] زندگی اس کے کاٹے کٹے گی۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جا چکا[۷] ہی۔ رہا منجھلا اسسال انٹرنس[۸] پاس کرنے کو تھا اور امید تھی کہ یہ کچھ ہوگا مگر اب وہ تمام منصوبے ہی غلط ہوا چاہتا ہی۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان یہ دو لڑکیوں کا فرض کیسا میں اپنی گردن پر سے چلا بڑی لڑکی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھیری تھی اور جب میرے رہتے یہ دقت تھی تو اب ان دو بچیوں کا دیکھیے کیا ہو۔ پیش بینی[۹] اور مآل اندیشی[۱۰] کرکے پار سال گانوں لیا تھا ابھی تک پٹی داروں[۱۱] نے اس میں اچھی طرح تسلط[۱۲] نہیں بیٹھنے دیا حال میں جو چالیس پچاس بیگھے سیر[۱۳] کرکے نیل بو لیا تھا وہ سب گیا گزرا ہوا۔ گو دام پر جو روپیہ لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا۔ رہنے کے مکان میں کس تنگی سے بسر ہوتی ہی کوئی مہمان آنکلتا ہی تو شرمندہ ہونا پڑتا ہی۔ شمال رویہ دالان در دالان بنوانے کا ارادہ تھا۔ ڈیڑھ دون[۱۴] لکڑی کا روپیہ بھیج چکا ہوں وہ نہیں آئی۔ بزازوں والوں کو اینٹوں کی دادنی[۱۵] دی تھی وہ نہیں پٹی[۱۶] افسوس کہ موت نے مجھ کو مہلت نہ دی لوگوں کا لینا دینا حساب کتاب بڑے بڑے بکھیڑے ہیں آج سلجھانے بیٹھوں تو مہینوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔ اجل سر پر آ پہنچی تمام لینا لوانا مارا پڑا۔ اے کاش میں کچھ نہیں تو دس بارہ برس ہی اور جی جاتا تو یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کر لیتا۔ بال بچے بھی ذرا اور سیانے ہو جاتے کھانے کمانے لگتے۔ ادھر ان کی شادی بیاہ کر چکتا گانوں کا معاملہ بھی رو براہ[۱۸] ہو جاتا۔ مکان کو اپنے طور پر بنا لیتا۔ لوگوں کا حساب کتاب سب صاف کر دیتا۔ گھر والی کے واسطے کچھ ذخیرہ[۱۹] وافی[۲۰] فراہم[۲۱] کر جاتا تب فراغت سے مرتا۔ کیا مرنے میں مجھ کو کچھ عذر یا خدانخواستہ کسی طرح کا انکار تھا۔ میں اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دنیا میں آکر مرنا ضرور ہی مگر ہر چیز ایک وقت مناسب پر ٹھیک ہوتی ہی یہ بھی کوئی مرنا ہی کہ ہر ایک کام کو ادھورا ہر ایک انتظام کو ناقص ناتمام چھوڑ کر چلا جاؤں ایسا بے ہنگام[۲۲] مرنا نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام متعلقین اور وابستگان[۲۳] کے لیے موجب زیاں و باعث نقصان[۲۴] ہی۔ اگرچہ نصوح بہ نظر ظاہر ایک آزاد اور بیگانہ وار زندگی[۲۵] بسر کرتا تھا نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اس کی خو تھی نہ بال بچوں ہی سے کچھ بہت اختلاط کرنے کی عادت انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے تقاضے اور اصرار[۲۶] سے بقدر ضرورت کچھ دخل دے دیا ورنہ اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی اور یہی سبب تھا کہ جب کبھی سننے کا اتفاق ہوتا کہ فلاں شخص نے بڑی حسرت[۲۷] کے ساتھ جان دی تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا

۱؎ خرچ بات کی ذمہ داری کرنے والا ۱۲ ۲؎ جوڑا ہوا۔ پس انداز ۱۲ ۳؎ کفایت۔ بس ۱۲ ۴؎ کنواری ۱۲ ۵؎ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ۱۲ ۶؎ بڑی لمبی بھاری ۱۲ ۷؎ بس میں نہیں رہا آوارہ ہو گیا ۱۲ ۸؎ فضیلت کے درجے میں داخل ہونے کا امتحان ۱۲ ۹؎ آئندہ کے واقعات کو پہلے سے دیکھ لینا ۱۲ ۱۰؎ انجام کار کو سوچنا ۱۲ ۱۱؎ زمین داری کے حصے دار ۱۲ ۱۲؎ قبضہ ۱۲ ۱۳؎ زمین دار کی خود کاشت ۱۲ ۱۴؎ کوہ ہمالیہ میں ایک ضلع جہاں لکڑی کا بڑا بھاری جنگل ہی ۱۲ ۱۵؎ پیشگی رقم ۱۲ ۱۶؎ ادا نہیں ہوئی ۱۲ ۱۷؎ چکیں ۱۲ ۱۸؎ یعنی گانوں کے معاملے کا بھی کوئی رستہ نکل آتا ۱۲ ۱۹؎ اندوختہ ۱۲ ۲۰؎ کافی ۱۲ ۲۱؎ جمع ۱۲ ۲۲؎ بے وقت ۱۲ ۲۳؎ جو آدمی کے پلے بندھے ہوں یعنی اہل و عیال ۱۲ ۲۴؎ نقصان کا سبب ۱۲ ۲۵؎ ان لوگوں کی سی زندگی جن کو گھر سے لگاؤ نہیں ۱۲ ۲۶؎ ضد ۱۲ ۲۷؎ افسوس ۱۲

کی شان ہی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دنیا سے نکلنے کو اُن کا جی ہی نہیں چاہتا نہیں معلوم دنیا کی کون سی ادا
اُن کو پسند ہوتی ہی ورنہ استغفر اللہ[1] یہ دار المحن[2] انسان کے رہنے کے لائق ہی۔ صدہا بکھیڑے۔ ہزارہا مخمصے روز کے
جھگڑے آئے دن کی مصیبت۔ سچ ہی خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت[3] اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں ظاہر میں
تو موت سب کو بُری معلوم ہوتی ہی اور اس سے لوگ ایسا ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے لیکن غور کر کے دیکھو تو مرنا بھی
ایک نعمت ہی۔ انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہی جہاں ایک حالت سالہا سال رہی گو وہ کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں
نہ ہو خواہ مخواہ آدمی اُس سے ملول[4] ہو جاتا ہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی من[5] سلویٰ کھاتے کھاتے ایسے اُکتائے کہ
آخر کو اُن کے دل لہسن اور پیاز پر للچائے۔ اگر دنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر
جان دیتے اور حیاتِ دراز[6] کو عذابِ مقیم[7] سمجھتے۔ میرے دل کی تو یہ کیفیت ہی کہ مجھ کو یہاں سے چلے جانے کی مطلق پروا نہیں
اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اُس کی مفارقت[8] کا قلق[9] ہو۔ لیکن بڑا فرق ہی فرض[10] اور واقعات میں۔ یہ بھی نصوح کے نفس
کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو بے ہمہ[11] باہمہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ دوسروں کو مرتا دیکھتا
تھا اپنے تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا لیکن جب خود اپنے سر پر آن بنی تو سب سے زیادہ بودا نکلا وہ اپنے تعلقات سے واقع
میں اب تک بے خبر تھا جب موت سامنے آموجود ہوئی اور چلنا ٹھیر گیا تو حقیقت کھُلی کہ اِدھر زن و فرزند کا فریفتہ[12] ہی اُدھر مال و
متاع[13] کا دلدادہ[14]۔ اتنا بڑا سفر تو اُس کو درپیش مگر بارِ علائق[15] کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اُس کے پاؤں[16] ہزار ہزار من کے
ہو رہے تھے ریل کی سیٹی بج چکی تھی مگر یہ ابھی سٹیشن کے باہر اسباب کے سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اگر اسی حالت میں کہ اس
کی روح تعلقاتِ دنیوی میں ڈانوا ڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی کہیں خدانخواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہان
سے گیا گزرا ہوا تھا۔ خسر الدنیا والآخرۃ[17] ازیں سو راندہ و زاں سو درماندہ۔ مگر خدا نے بڑا ہی فضل کیا کہ نا اُمیدی نے
اس کی ہمت بندھائی اور اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب[18] سے حاصل۔ مرتا ہوں
تو مردانہ وار کیوں نہ مروں اور استقلال کے ساتھ جان کیوں نہ دوں۔ اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں
پر ایک اُداسی سی چھا گئی اب جس چیز کو دیکھتا ہی ہیچ[19] اور بے وقعت نظر آتی ہی یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کو دوا
پلا کر تنہا لٹوایا استغنا[20] سے ایک طرح کا اطمینان جو دل کو پہنچا اور اُدھر علالت کی اشتداد کا تکان تھا ہی اُوپر سے پہنچی دوا جو
بالخاصہ[21] خواب آور تھی اور تیمارداروں[22] کا ہجوم ہوا کم۔ لیٹا تو نیند کی ایک جھپکی سی آگئی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری
دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئی اُس کے پیش نظر تھے سب اُس کے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب

ف۱ خدا سے معافی چاہتا ہوں۔ نفرۃ کی جگہ بولتے ہیں ۱۲ ف۲ محنتوں کا گھر ۱۲ ف۳ کام ۱۲ ف۴ اُکتا جاتا ہی ۱۲ ف۵ مَن ایک طرح کی اوس جو جم کر ترنجبین سی ہو جاتی تھی اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا ایک جانور مَن و سلویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو بے زحمت ملتا تھا ۱۲ ف۶ لمبی زندگی ۱۲ ف۷ ٹھیرا ہوا عذاب جو ٹلے نہیں ۱۲ ف۸ جدائی ۱۲ ف۹ رنج ۱۲ ف۱۰ یعنی دل میں ایک بات کا مان لینا اور چیز ہی اور کر کے دکھانا دوسری چیز ۱۲ ف۱۱ سب سے الگ اور سب میں شامل ۱۲ ف۱۲ ریجھا ہوا ۱۲ ف۱۳ سامان۔ اسباب ۱۲ ف۱۴ فریفتہ کا مرادف ہی ۱۲ ف۱۵ تعلقات کا بوجھ ۱۲ ف۱۶ پاؤں ہزار ہزار من کے ہوں تو کیا ہلا جائے ۱۲ ف۱۷ دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا ۱۲ ف۱۸ بے قراری ۱۲ ف۱۹ ذلیل ۱۲ ف۲۰ بے پروائی ۱۲ ف۲۱ یعنی اِن میں خدا نے خاصیت ہی یہی رکھی تھی ۱۲ ف۲۲ بیمار کے خبر گیر ۱۲

متخیلہ نے اُن کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈمڈ کرکے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اُس کو یہ تصور بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں الساد م بجود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے مونہ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے گھرّے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہلِ معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی کرکے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پونہچا کر کاربرآری کرسکے۔ اگرچہ انصاف و معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبۃ ادنیٰ اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں کیا خفیف کیا سنگین کوئی اس کے رحم سے نا اُمید نہیں۔ اختیارات اُس کے اس قدر وسیع ہیں کہ نہ اُس کے فیصلے کی اپیل ہے نہ اُس کے حکم کا مرافعہ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہ ہو جائیں۔ پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواروی اور سرسری طور پر تجویز کرکے ٹال دیا جائے۔ نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے ہر عذر کو رفع ہر حجۃ کو قطع بلکہ خود مجرم کو قائل معقول کرکے اور گنہگار کے مُنہ سے اُس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد۔ غرض جو تجویز ہے موجّہ جو فیصلہ ہے مدلل جو رائے ہے حتمی واقعاتی جو حکم ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل ثقہ اور راست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال چشم دید بلکہ مجرم کے رفیق اور ہمنشین کہ اُس کے رازدار اور معین و مددگار رہوں پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً فردِ قرار دادِ جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور جتنے الزام اُس پر لگائے گئے ہیں سب کو سمجھتا اور اپنی برائت کے وجوہات کو سوچتا ہے۔ کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علیٰحدہ جگہ میں نظربند ہے۔ جو جیسا مجرم ہے مناسب حالۃ حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے مگر بہت ہی بڑا ٹھکانا ہے۔ محنۃ کڑی مشقۃ سخت۔ جو اُس میں گرفتار ہیں سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار ہیں۔ نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ ان لوگوں میں ہزارہا آدمی تو اجنبی تھے لیکن جابجا شہر اور محلّے کے آدمی ہی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے نصوح کو یہ سب سامان دیکھ کر اُسی خواب کی حالۃ میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے۔ کس کی کچہری ہے یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں میرے ہم وطنوں نے

---

[1] خیال باندھنے کی قوۃ ۱۲ [2] ملا جلا کر ۱۲ [3] شکل۔ صورۃ ۱۲ [4] خاموشی ۱۲ [5] سانس کو روکے ہوئے ۱۲ [6] گھرّے یعنی مزاج کے روکھے ۱۲ [7] مقدمے کا سمجھ جانا ۱۲ [8] ہر ایک بات کو جان لینا ۱۲ [9] ہلکے ۱۲ [10] بھاری ۱۲ [11] ہٹا کر ۱۲ [12] اٹھا کر۔ توڑ کر۔ جواب دے کر ۱۲ [13] دلیل ۱۲ [14] وجہ کے ساتھ ۱۲ [15] دلیل کے ساتھ ۱۲ [16] یقینی ۱۲ [17] یقینی ۱۲ [18] نیکوکار ۱۲ [19] بھلے مانس ۱۲ [20] سچ بولنے والے ۱۲ [21] حال سے واقف ۱۲ [22] جنھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ۱۲ [23] بھیدی ۱۲ [24] ہر ایک کو الگ الگ ۱۲ [25] فوجداری کی مثل کا ایک کاغذ ہوتا ہے جس میں مجرم کا قصور لکھا رہتا ہے ۱۲ [26] صفائی ۱۲ [27] آسانی [28] بئس المصیر کا ترجمہ ہے ۱۲ [29] آرزومند ۱۲ [30] خوفناک ۱۲ [31] اوپری۔ اَن جان ۱۲ ؛

کیا جرم کیا ہی کہ ماخوذ ہیں اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں جوابدہی میں دیکھتا ہوں اسی حیرۃ میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا کہ دُور سے اُس کو اپنے والد بزرگوار حوالاتیوں میں بیٹھے نظر پڑے - پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہی مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع میں وہی ہیں - دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ یا حضرۃ ہم سب آپ کی مفارقۃ میں تباہ ہیں آپ یہاں کہاں باپ - میں اپنے گناہوں کی جوابدہی میں ماخوذ ہوں - یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دار الجزا[2] ہی اور خداوند تعالیٰ جل[3] وعلا شانہ اِس محکمے کا حاکم - بیٹا - یا حضرۃ آپ تو بڑے متقی پرہیزگار خدا پرست نیکوکار تھے آپ پر اَور گناہوں کا الزام - باپ - گناہ بھی ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں - دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال کیسی رُسوائی اور فضیحتہ سے بھرا ہوا ہی اور میں اُس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جوابدوں گا اور کون سی وجہ اپنی برارۃ کی پیش کروں گا - یہ وہی کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اُس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرار دادِ جرم سمجھا تھا باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرّا اُٹھا - شرک اور کفر اور نافرمانی ناشکری اور بغاوت[4] اور بے ایمانی کبر[5] و نخوۃ - دروغ[6] و غیبتہ[7] - طمع[8] و حسد[9] - مردم آزاری[10] - نفاق[11] وریا[12] - حبِّ دنیا[13] کوئی الزام نہ تھا کہ اُس میں نہ ہو - چوں کہ نصوح کے دماغ میں خیالات دنیوی گونج رہے تھے لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا دفعہ ڈھونڈنے سو تعزیرات ہند کے دفعات کی عوض قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا متعجب ہو کر باپ سے پوچھا کہ یا حضرۃ پھر کیا آپ اِن تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں - باپ - سب کا - بیٹا - کیا آپ حضورِ حاکم اقرار کر چکے ہیں - باپ - انکار کی گنجائش ہی نہیں - میری مخالفۃ میں گواہی اتنی وافر[14] ہی کہ اگر میں انکار کروں بھی تو پذیرا[15] نہیں ہو سکتا - بیٹا - جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفۃ پر آمادہ ہیں - باپ - اول تو دو شخص کراماً کاتبین[16] اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی[17] نہیں - جتنی باتیں کہتے ہیں پتے کی - اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچہ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو میں اُس کو دیکھتا ہوں حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں دوسرے یہی میرے اعضا ہاتھ پاؤں آنکھ کان وغیرہ کوئی میرے کہنے کا نہیں رہے سب مجھ سے منحرف[18] سب مجھ سے برگشتہ[19] - میری مخالفۃ پر آمادہ میری تذلیل[20] پر کمر بستہ[21] ہو رہے ہیں - بیٹا - آخر آپ کچھ اِس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں - باپ - میں اِن کو غلطی سے اعوان[22] و انصار بھیدی اور رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی[23] تھے اِنھوں نے وہ وہ سلوک میرے ساتھ کیے کہ تسمہ[24] لگا نہیں رکھا - بیٹا پھر آپ کا کیا حال ہی - باپ - جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں تنہائی سے جی گھبراتا ہی انجام کا معلوم نہیں شبانہ روز[25] اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں - حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہی کہ بیان نہیں کر سکتا - مگر صبح و شام ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہی - دوزخ وہی ہی وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور سُن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں اور غنیمتہ معلوم ہوتا ہی کہ ای کاش ہمیشہ کے واسطے اِسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا - بیٹا - پھر ہنوز

---

[1] بگڑا ہوا ۱۲ [2] بدلا پانے کا گھر ۱۲ [3] اُس کی شان بڑی اور اونچی ہی ۱۲ [4] سرکشی ۱۲ [5] غرور ۱۲ [6] جھوٹ ۱۲ [7] کسی کو پیٹھ پیچھے برا کہنا ۱۲ [8] لالچ ۱۲ [9] دوسرے کو دیکھ کر جلنا ۱۲ [10] لوگوں کو ستانا ۱۲ [11] مونھ پر کچھ دل میں کچھ ۱۲ [12] دکھاوا ۱۲ [13] دنیا کو دوست رکھنا ۱۲ [14] بہت ۱۲ [15] قبول ۱۲ [16] نیکی بدی لکھنے والے دو فرشتے جو ہر وقت آدمی کے ساتھ رہتے ہیں ۱۲ [17] پوشیدہ ۱۲ [18] پھرے ہوئے ۱۲ [19] پھرے ہوئے ۱۲ [20] ذلیل کرنا ۱۲ [21] کمر باندھے ہوئے یعنی مستعد ۱۲ [22] مددگار ۱۲ [23] خدا کی طرف سے ٹوہ لینے والا ۱۲ [24] گویا گردن جڑ سے کاٹ کر جدا کر دی ۱۲ [25] رات دن ۱۲

آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا - باپ - خدا نہ کرے کہ پیش ہو - جو دن حوالات میں گزرتا ہی غنیمت ہی - اوّل اوّل جب میں حوالات
میں آیا تو اعمال نامہ مجھ کو حوالے کر دیا گیا بس اُسی کو دیکھتا اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں - نجاۃ کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں
آتی - بیٹا - بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبۃ میں کام آ سکتے ہیں - باپ - اگر میرے لیئے عاجزی اور خلوص[1] کے ساتھ دعا
کرو تو کیا عجب ہی کہ مفید ہو - ابھی میرے ہم سائے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہی اُس پر بھی بہت سے الزام تھے
مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجے کا انصاف ہی رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہی اُس شخص کے پس ماندوں[2] نے
اُس کے واسطے بہت زار[3] نالی کی تو پرسوں یا اترسوں اُس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب
تجھ پر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے
ہی زن و فرزند ہیں ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہی کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دین داری کا
بیج بویا جا ہم نے تیری خطا معاف کی - بیٹا سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہی - بیٹا -
جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شد و مد[4] کے ساتھ ہوتا ہی کہ گویا آپ نے
ابھی انتقال فرمایا ہی اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہی آپ کی عنایتیں آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے
یاد کریں گے - رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہی - لوگ شاید میرے مُونہ پر خوش آمد سے کہتے
ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا - دعا کے بارے میں غلط بات کیوں کر عرض کروں اہتمام
نہیں ہوا - آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے - مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم[5] و صلوٰۃ[6]
کے بڑے پابند تھے کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے - باپ - کیوں نہیں یہ اُن ہی اعمال کا طفیل ہی کہ تم مجھ کو اس
حالۃ میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہی - مگر یہاں اعمال
میں خلوص نیۃ شرط ہی - میں نے اپنے اعمال کو آ کر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی کھوٹے روپے - نمازیں بے حضور قلب[7]
اکارت گئیں اور روزے چوں کہ پابندی رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے کے شمار میں در آئے -
بیٹا پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں - باپ - استغفر اللہ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں نفسی نفسی[8] پڑی
ہی ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبۃ میں گرفتار ہی دوسرے کی نجاۃ تو کوئی کیا کرائے گا پہلے آپ تو سرخ رو ہو لے
بیٹا - کیوں جناب معاذ اللہ[9] یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا[10] ہم لوگ تو خیر سارا شہر آپ کے اتقا[11] کا معتقد تھا کیا آپ خدا
کے قائل نہ تھے - باپ - قائل تو تھا دل سے معتقد نہ تھا - بیٹا - جناب آپ کے تمام اعمالِ ظاہر سے مستنبط[12] ہوتا تھا کہ آپ
کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ[13] عقیدۃ ہی - باپ - وہ تمام عقیدۃ معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی - جب اوّل اوّل میرا

---

[1] صدق دل ۱۲ [2] پیچھے رہے ہوؤں یعنی وارثوں ۱۲ [3] گڑگڑا کر رونا ۱۲ [4] زور و شور ۱۲ [5] روزہ ۱۲ [6] نماز ۱۲ [7] یعنی دل حاضر نہ تھا ۱۲ [8] اپنی اپنی جان ۱۲ [9] خدا کی پناہ - جب کسی نالائق بیہودہ اور بُری چیز کا مذکور کریں تو یہ کلمہ کہہ لیا کرتے ہیں یہاں شرک و کفر کی وجہ سے معاذ اللہ کہا ۱۲ [10] یعنی خیر ہم لوگوں نے سمجھا تو ہم پر آپ کا حق تھا آپ ہمارے بزرگ تھے ۱۲ [11] پرہیزگاری ۱۲ [12] ظاہر ہوتا تھا - نکلتا تھا ۱۲ [13] پکا جما ہوا عقیدہ ۱۲

اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا کہ تیرا رب[1] کون ہے جوں کہ مرتے وقت مجکو ایمان کی تلقین[2] کی گئی تھی میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ[3] تب اُس پہ جرح[4] کیا گیا کہ بھلا جب تو نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا اور جو کچھ کما کر لایا تھا سب صرف ہو گیا اور نانِ شبینہ[5] کو محتاج ہو کر نوکری کی جست وجو[6] میں ادھر اُدھر پھرتا اور مضطر[7] ہو ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا تھا مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لیئے تیرے مدعا کو حیزِ التوا[8] میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکمِ ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا ہمارے ایما[9] سے تیرے پرورش[10] کا وعدہ کیا مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا یہ بنا کہ تجھ کو اُس انگریز کے وعدہ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہمارے تحریری تمسک[11] وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[12] کا اگر تو ہم کو صمیمِ قلب سے حاضر[13] و ناظر[14] سمیع[15] و بصیر[16] و قادر[17] جانتا تھا تو گناہ پر تجھ کو کیوں کر جسارۃ[18] ہوتی تھی۔ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا مگر تو گناہوں کا نہایۃ بے باکی سے مرتکب[19] ہوتا تھا ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو ہمارے فرمانے کا یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتشِ دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اُس کو دُنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ[20] جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا کیا تو نے اُس کو ہمیشہ اپنی حسنِ تدبیر[21] کی طرف منسوب نہیں کیا جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارا[22] کرتا تھا مگر کیا تو اُسکا الزام ہماری ذاتِ مستجمع الصفات[23] پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش[24] ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھ پر کیئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا مونہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر بے شمار[25] نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا اُتنا ہی تو میری مخالفۃ پر کمربستہ[26] رہا۔ جتنی میں تیری رعایۃ کرتا رہا اُسی قدر تو گستاخ[27] اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیاۃِ بے ثبات[28] پر تجھ کو اتنا گھمنڈ[29] ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اِس چند روزہ[30] زندگی پر تو اِس قدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیۃ[31] سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تجھ کو نیست[32] سے ہست کیا اور خلعۃِ انسانیۃ سے سرفراز بنایا جو تجھ کو درکار تھا سو دیا جس کا تو حاجۃ مند تھا سب مہیا[33] کیا ہر حال میں تیرے حافظ۔ ہر کیفیۃ میں تیرے نگہبان رہے کیا

---

[1] پروردگار ۱۲ [2] تعلیم جب کوئی آدمی مرنے کو ہوتا ہے تو پاس والے اُس کو دین کی باتیں یاد دلاتے ہیں ۱۲ [3] اللہ تعالیٰ اکیلا جس کا کوئی ساجھی نہیں ۱۲ [4] توڑ۔ اعتراض ۱۲ [5] اتنی روٹی کہ رات کو کھا کر سو رہے ۱۲ [6] تلاش ۱۲ [7] بے قرار ۱۲ [8] یعنی تیرے مطلب کو ڈھیل میں ڈال دیا تھا ۱۲ [9] اشارہ ۱۲ [10] نوکری دینے سے مراد ہے ۱۲ [11] لکھی ہوئی دستاویز ۱۲ [12] جتنے جان دار زمین پر ہیں اللہ سب کی روزی کا ذمہ دار ہے ۱۲ [13] ہر جگہ موجود ۱۲ [14] سب چیزوں کو دیکھنے والا ۱۲ [15] سب کی سننے والا ۱۲ [16] سب چیزوں کو دیکھنے والا ۱۲ [17] ہر بات پر قدرت رکھنے والا ۱۲ [18] دلیری ۱۲ [19] یعنی بے دھڑک تجھ سے گناہ سرزد ہوتے تھے ۱۲ [20] فائدہ ۔ امن چین ۱۲ [21] یعنی اپنی ہی کوشش کا نتیجہ سمجھا ۱۲ [22] مراد ہے کہ آپ اپنا نقصان کرتا تھا ۱۲ [23] جس میں تمام خوبیاں اکٹھی ہوں ۱۲ [24] احسان کو بھول جانے والا ۱۲ [25] ان گنت ۱۲ [26] مستعد طیار ۱۲ [27] بے ادب ۱۲ [28] زندگی ناپائدار ۱۲ [29] غرور ۱۲ [30] تھوڑے دن کی ۱۲ [31] بندگی کا حلقہ ۱۲ [32] کچھ نہ تھا پیدا کر دیا ۱۲ [33] موجود ۱۲

اس واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ[1] کی مسجد ہم سے جدا رکھے جب
تو ایک مضغۂ گوشت[2] تھا ضعیف ولا یعقل[3] نادان و جاہل ضعیف اتنا کہ نقل و حرکت[4] پر قادر نہیں نادان ایسا کہ خویش و[5]
بیگانے کا امتیاز[6] نہیں ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے
یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کیے اور ان کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ انھوں نے
ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا[7] اور تو روز بروز چونچال[8] اور خوش حال ہوتا گیا پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا
کہ تو اس کی مدد سے اپنی آسایش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے۔ دنیا کے چرند پرند حیوانات[9]
نباتات[10]۔ جمادات[11]۔ سب کو تیرا مطیع فرمان[12] بنا دیا کہ تو ان پر حکمرانی کرے اور ان میں متصرف[13] رہے کیا اس لیے تو
بہک کر بھی کبھی ہماری طرف رخ نہ کرے اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے۔ تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود[14]
تھی دو لمحے تجھ کو تنفس[15] کے لیے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا۔ ایک رات دن بے آب و دانہ تجھ کو جینا دشوار ہوتا
منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے غلہ انبار کے انبار[16] ٹھونس گیا[17] اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت۔
زندگی بھر کئی کنوئیں تو نے خالی کیے ہوں گے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں دور ایک پانی اور ہوا اور
غلہ و غذا کیا ضرورۃ کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا۔ ہمارے توشہ خانہ[18] عام سے۔ مگر اس
پر تیری یہ ہیکڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرض دار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا ادھار آتا ہے۔ تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا لیتا تھا اور بھول
بھول جاتا تھا۔ دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا[19] تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ تجاہل[20] کرتا تھا۔ منہ
پر آنکھیں تھیں اور اندھا۔ ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا۔ زمین۔ آسمان۔ چاند سورج۔ ستارے۔ جنگل۔ دریا
میدان۔ انواع و اقسام کے درخت۔ پھل پھول کھانے کو الوان نعمت[21]۔ پہننے کو رنگا رنگ خلعت۔ جواہر بیش بہا[22]
نقرہ و طلا[23]۔ دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کے لیے اس قدر لوازمہ[24] بہم پہنچایا
ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف[25] ہم کو اس قدر تیری بندہ داشت[26] ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ ہم
چاہتے تو ایک ادنی سی چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ ایسا
تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوۃ۔ ہم عنایۃ کرتے
تھے اور تو بغاوۃ[27]۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا۔ کیا یہی تھا صلہ[28] جو تجھ سے ہم کو ملا۔ ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت

---

[1] یہ محاورہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کی رائے کے خلاف اپنی سمجھ سے علیحدہ ایک کام کرتا ہے ۱۲ [2] گوشت کی بوٹی ۱۲ [3] بے وقوف ۱۲ [4] ہلنے جلنے کی بھی طاقت نہ تھی ۱۲ [5] اپنے پرائے ۱۲ [6] فرق کرنے کا سلیقہ ۱۲ [7] پرورش کیا ۱۲ [8] ہشیار ۱۲ [9] جانور ۱۲ [10] پھل پھول درخت ۱۲ [11] بے جان چیزیں جیسے مٹی پتھر وغیرہ ۱۲ [12] حکم کا تابع ہونا ۱۲ [13] اپنے کام میں لاتے ۱۲ [14] بے حقیقت زندگی ۱۲ [15] سانس لینے کے لیے ۱۲ [16] ڈھیر کے ڈھیر ۱۲ [17] کھا گیا نگل گیا ۱۲ [18] مراد ہے گودام ۱۲ [19] مطلب کو پہنچنے والی ۱۲ [20] جان بوجھ کر اپنے تئیں بے خبر بنانا ۱۲ [21] رنگ برنگ کے کھانے ۱۲ [22] بیش قیمت موتی ۱۲ [23] چاندی سونا ۱۲ [24] سامان ۱۲ [25] برگشتہ پھرا ہوا ۱۲ [26] خاطرداری ۱۲ [27] سرکشی ۱۲ [28] انعام ۱۲

کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر[1] لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ یہ
میری عمدہ امانۃ اور نفیس ودیعۃ[2] ہے دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی[3] اور حفاظۃ کما حقہ[4] کیجیو جیسا اجلا شفاف براق روشن
یہاں سے لیے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ اس کو لایا ہے تو تجھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر
نجس۔ ناپاک تیرہ۔ بے آب۔ بدرونق۔ خراب ہم نے تو تجھ سے چلتے چلتے کہہ دیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس
طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان[5] کر سویا کہ قبر میں آ کر جاگا تھا تو مسافر
اور بن بیٹھا مقیم۔ تھا تو سیاح[6] اور ہو گیا مستوطن۔ کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال
سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں ان میں رہے گا۔ مسافر کا یہی کام ہے۔ سیاح کا یہی شیوہ ہے۔ تو تو جانتا تھا کہ تجھ کو یہاں لوٹ
کر آنا ہی پھر مرنے کے نام سے تجھ کو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سن کر تو چلتا کیوں تھا۔ اول تو تجھ کو ہماری
عبادۃ کا اتفاق ہی نہیں ہوا لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم[7] کی وجہ سے مصروفِ عبادۃ
ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں۔ کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو[8] سے خالی تھی۔ دنیا کی برسوں کی بھولی
بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ نہ تعدیل ارکان[9] ٹھیک۔ نہ قومہ[10] درست
نہ قعدہ[11] صحیح۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے
تجھ کو حکم دیا تھا کہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو تجھ کو اپنے ابنائے جنس[12] پر جو مبتلائے مصیبۃ ہیں رحم آئے اور
تیری صحۃ بدنی کو بھی نفع پہنچے تیرے مزاج میں فروتنی[13] اور انکسار کی صفۃ محمودہ کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے پیدا ہو لیکن
یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا نہ شکوہ نہ گلہ تازہ دم ہشاش بشاش[14] پھر
کھانا پینے کو موجود مگر روزہ چوں کہ ہمارے حکم سے تھا دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایۃ اور جو آیا اس سے
ضعف و ناتوانی کی حکایۃ العطش[15] اور الجوع[16] بھی تیرے دو وظیفے[17] تھے روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا
گرا کہ گویا جان نہیں باوجودے کہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھا لیتا تھا پھر بھی اس تصور سے کہ کل پھر
روزہ رکھنا ہے تیری جوع البقر[18] کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی
تاریخ رہائی کا تیرا بس چلتا تو ۲۹ کو[19] ۲۹ کی عید کرتا کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو امیدوار اور اجر کا متوقع ہے ہم نے
تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تا کہ مصیبۃ زدوں کی ہمدردی کرے مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحۃ پہنچانا تو درکنار

---

[1] پاکیزہ جوہر ۱۲ [2] امانۃ ۱۲ [3] جیسی چاہیے ۱۲ [4] جیسا حفاظۃ کا حق ہے ۱۲ [5] محاورہ ہے یعنی خوب پاؤں پھیلا کر سویا ۱۲ [6] لفظی معنی بہت سیر کرنے والا یہاں یہ مراد ہے کہ دنیا میں سیر کرنے کو آیا تھا اور اس طرح جم کر ہو بیٹھا کہ گویا کبھی یہاں سے چلنا ہی نہیں ۱۲ [7] رسم و رواج کی پابندی ۱۲ [8] اہل اسلام کے نزدیک نماز میں بعض ارکان کی کمی یا زیادتی سے نماز کے بعد دو سجدے کیے جاتے ہیں جن سے نماز پوری ہو جاتی ہے ۱۲ [9] نماز میں رکوع و سجود وغیرہ کو آہستگی اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا ۱۲ [10] کھڑا ہونا ۱۲ [11] بیٹھنا ۱۲ [12] تجھ جیسے لوگ۔ بنی آدم ۱۲ [13] عاجزی ۱۲ [14] خوش و خرم ۱۲ [15] پیاس ۱۲ [16] بھوک ۱۲ [17] یعنی یہی دو شکایتیں ہر وقت تیری زبان پر جاری تھیں ۱۲ [18] گائے بیل کی سی بھوک جو کبھی کھانے سے سیر نہیں ہوتے ۱۲ [19] مسلمان ۲۹ کے چاند کی عید سے زیادہ خوش ہوتے ہیں ۱۲-

دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھ کو باک[91] نہ تھا۔ تیرے ہمسائیں ہمارے بندے رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھ کو سوءِ ہضم[92] کے علاج سے اُن کی پرداخت[93] کی پروا نہ تھی۔ تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا۔ نعمۃ مال و دولۃ جو ہم نے تجھ کو عطا کی تھی تو نے تکلفات لایعنی[94] اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف[95] کی اور جو لوگ اُس کے سخت حاجۃ مند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے۔ تیری سب خباثتیں[96] مجھ کو معلوم ہیں تو نے درماندگی[97] کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کاربراری کی امید ہوتی تھی تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہی اور انتظام دنیا میں اُس کو بھی کچھ دخل ہی مگر ہاں جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا تب تو خدا کو یاد کرتا تھا۔ اگر ہماری خدائی اور سلطنۃ تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اُس کے اُٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان[98] کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام[99] کی بے توقیری[100] کی اور تو نے اپنا برا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سنتا تھا کیا تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیئے تھا کہ ایک دن تو بھی مریگا۔ خود تیری حالۃ میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے لڑکے سے جوان ہوا۔ جوان سے بڈھا ناتوان بال تیرے سفید ہوئے۔ دانت تیرے ٹوٹے۔ کمر تیری جھکی۔ قوتوں میں تیری فتور[101] آیا۔ غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے ہی کروٹ نہ لی ؎

تمامی عمر تو غفلۃ میں سویا ہمارا کیا گیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری[102] خود ہماری عادۃ نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر اپنے بندوں پر جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہی۔ مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے نہ خر مشتخص[103] کہ ہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرۃ[104] پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً[105] بھلا بھلا دیا ہی۔ لیکن توبہ و استغفار[106] ندامۃ و حسرۃ کا اظہار بھی تو کوئی کرے۔ ہماری رحمۃ حیلہ[107] جو ہماری رافۃ[108] بہانہ طلب کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اُس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبۃ عبودیت[109] صحیح رکھتا

---

[91] خوف ۱۲ [92] بدہضمی ۱۲ [93] پرورش [94] بے کار ۱۲ [95] ضائع کی ۱۲ [96] شرارتیں ۱۲ [97] بے بسی یعنی جب تدبیر سے کام نہ چلتا تھا اور تو عاجز ہو جاتا تھا تو اُس وقت تجھ کو خدا یاد آتا تھا ۱۲ [98] حکم جس کا تعمیل کرنا ضرور ہو ۱۲ [99] ہمارے احکام جن کی عزۃ کرنی لازم تھی ۱۲ [100] بے عزتی ۱۲ [101] ضعف آیا ۱۲ [102] سختی کرنا ۱۲ [103] خر گدھا نامشخص بے ٹھکانے ۱۲ [104] عذر۔ اہل اسلام کے ہاں لکھا ہی کہ اگر تمام عمر کوئی شخص بُرے کام کرے اور پھر خدا کے سامنے سچائی کے ساتھ عذر کرے تو اُس کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گویا گناہوں کا معاف کرنا اپنے اختیار میں ہی ذرا ندامۃ کا اظہار ہوا اور گناہ معاف ۱۲ [105] بالکل ۱۲ [106] معافی مانگنا ۱۲ [107] یعنی خدا کی رحمۃ حیلے اور بہانے ڈھونڈا کرتی ہی ۱۲ [108] شفقۃ یہ کسی قدر رحمۃ سے بڑھی ہوئی ہی یہ بھی موقع اور محل کی منتظر رہتی ہی ۱۲
[109] بندگی ۱۲

تو ہم اُس کی لاکھ بُرائیوں پر خاک ڈالتے ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہی کہ اُس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا عالمِ اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا سونے کو ہم نے منع نہیں کیا۔ تمتعاتِ[۱] دنیوی سے ہم نے باز نہیں رکھا پھر جو تو نے اُن کی بجا آوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی[۲] کے اَور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص نجاۃ جس کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہی اے کاش زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی ہی پروا ہوتی جیسے اُڑتو[۳] پر سفیدی۔ دُنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیان تجھ کو مضطر[۴] اور بے چین کر دیا کرتے تھے اگرچہ کیا دُنیا اور کیا دنیا کا خسارہ[۵] کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا لیکن تباہیِ دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی اے کاش تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے پُرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھ کو بہت ہی بڑی ندامت ہی۔ لیکن اس ندامت کا کچھ حاصل[۶] نہیں اس واسطے کہ یہ دار الجزا[۷] ہی دار العمل[۸] نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھ کو مہلت دیتے ہیں جا اپنے نامۂ اعمال[۹] کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطے کہ معقول اور قابلِ قبول ہو۔

خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے خاندان کی لایعنی زندگی پر سخت تاسف ہوا اور اُس نے تلافیِ مافات[۱۰] کا عہد کر کے فہمیدہ اپنی بی بی سے ماجرائے خواب بیان کیا اور اصلاح خاندان کے لیئے اُس کو اپنا مددگار بنایا۔

باپ نے جو یہ ام کہانی سنائی بیٹے پر اس طرح کی ہیبت چھائی کہ چونک پڑا۔ جاگا تو پھر وہی دالان تھا اور وہی تیمار داریوں کا سامان بی بی پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی میاں کی آنکھ کھُلی ہوئی دیکھ اُس کی جان میں بھی جان آئی ورنہ جس گھڑی سے میاں نے جی[۱۱] بُرا کیا تھا سہموں کے مارے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ نصوح آٹھ بجے ڈاکٹر کی دوا پی کر جو پڑا تھا تو اُس وقت کا سویا سویا اب کہیں دو بجے جا کر ہوشیار ہوا چوں کہ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نیند آ گئی تو جانتا کہ بیمار بچ گیا اُس کے سونے سے سب کو تسلی سی ہو گئی تھی مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو عورتیں پھر گھبرانے لگیں کہ نہیں معلوم کم بخت ڈاکٹر کیسی دوا پلا گیا ہی کہ دو پہر پڑے پڑے گزر گئے کروٹ تک نہیں بدلی۔ خدا جانے اندر سے جی کیسا ہی اور دل پر ایسی کیا آن بنی ہی کیوں کر ہوش آئے گا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہی نصوح بیدار ہوا تو بی بی نے پوچھا کیسی طبیعت ہی اچھے سوئے کہ گھر میں رونا پیٹنا ہو گیا اور تم کو

[۱] دنیا کے فائدے ۱۲ [۲] بد ذاتی ۱۲ [۳] محاورہ ہی مراد اس سے مقدار قلیل ہی یعنی ذرا سی بھی پروا ہوتی ۱۲ [۴] بے قرار ۱۲ [۵] گھاٹا، نقصان ۱۲ [۶] کچھ فائدہ نہیں ۱۲ [۷] بدلے کا گھر۔ یعنی جو کچھ دنیا میں کیا ہی یہ وقت اُس کے بدلے کا ہی ۱۲ [۸] کام کرنے کا گھر مراد اس سے دنیا ہی [۹] وہ عمل جس میں انسان کے تمام بُرے بھلے کام جو اُس نے دنیا میں کیئے ہیں لکھے ہوں گے ۱۲ [۱۰] جو کام کرنے سے رہ گیا تھا اُس کا عوض یعنی اُس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ میں نے جو غفلت سے اپنا زمانہ برباد کیا ہی کسی طرح اس کی کسر نکالوں ۱۲ [۱۱] عورتوں کا محاورہ ہی [illegible]

خبر نہیں۔ بولو بات کرو کہ اوپر والوں کو تسلی[۱] ہو۔ کسی بچے کے مُونہ میں دانہ تک گیا ہو تو حرام۔ چھوٹے بڑے سب کل کا کھائے ہوئے ہیں روتے روتے لڑکیوں کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ لڑکے ہیں کہ مضطر اور پریشان پھرتے ہیں۔ بی بی نے ہرچند دل جوئی کی باتیں کیں مگر نصوح کو خواب کا سارا ماجرا پیش نظر تھا مطلق جواب نہ دیا بی بی سمجھی کہ بیماری کی وجہ سے بولنے کو جی نہ چاہتا ہوگا مگر وہ خدشہ[۲] سب کے دل سے دفع ہو گیا۔ مبارک سلامت ہونے لگی اور گھر بھر نے بے رمضان کے عید منائی گو دیر ہو گئی تھی مگر لوگ بھوکے تھے بازار سے حلوا پوری منگوا کر سب نے تھوڑا بہت کھایا پیا کھانے ہی میں کسی نے یہ بات بھی چھیڑی کہ مریض کا غسل صحت ہو تو ایک رت جگا[۳] بڑی دھوم سے کیا جائے اور اچھے ہونے کی شادی کریں۔ یہ لوگ تو شادی اور رت جگے کے ارادے کر رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصور میں غلطاں پیچاں[۴] تھا۔ اُس کا دل مان گیا تھا کہ یہ خواب میرے وہم و خیال کا بنایا ہوا تو ہرگز نہیں ہے۔ ہو نہ ہو یہ ایک امر من جانب اللہ[۵] ہے خواب کیا ہے رؤیائے صادقہ[۶] اور الہام الٰہی ہے۔ باپ کا اظہار اس نے ایسی توجہ سے سُنا تھا کہ حرف بحرف نوک زبان یاد تھا جتنے الزام باپ پر لگائے گئے تھے غور کرتا تھا تو سب اپنے میں پاتا تھا بلکہ باپ کی حالت سے اپنی حالت کو مقابلہ کرتا تھا تو کچھ نسبت نہ تھی۔ اُن مرحوم[۷] کا یہ حال تھا کہ نماز روزے کے پابند۔ ورد و وظائف کے مقید۔ معاملے کے صادق بیوہار کے کھرے۔ لوگوں کے دیکھنے میں محتاط[۸]۔ پرہیزگار متقی۔ دین دار۔ اور یہاں نماز بھی تھی تو گنڈے دار[۹]۔ عیدین تو ضرور[۱۰] اس واسطے کہ عید سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی تیوہار نہیں اس سے بھاری کوئی میلہ نہیں برس روز میں یہی دو دن تو ساز و سامان کی نمائش کے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنے نئے شان دار کپڑوں میں اکڑ رہا ہے۔ کوئی گھوڑے کو چھیڑ چھیڑ کر کُداتا ہوا قصداً لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی نوکروں کی ہٹو بڑھو سُن کر پھولا ہوا ہے۔ کوئی کرائے یا مانگے کے تانگے پر سوار گاڑی بان سے کہتا ہے چودھری کیسا سڑیل تانگہ بنا رکھا ہے گدّا ہے تو میلا۔ پوشش[۱۱] ہے تو پھٹی ہوئی۔ نہ بیلوں کے گلے میں گھونگھرو۔ نہ پہیوں میں جھانجھ۔ خیر اب نماز کا وقت قریب ہے اتنا تو کر کہ وہ آگے اِکّہ جا رہا ہے اُس کے برابر لگائے چل۔ مرد آدمی تجھ کو انعام لینے کا بھی سلیقہ نہیں۔ رہا جمعہ اگر کپڑے خوب صاف ہوئے اور دھوپ بھی ایسی سخت نہ ہوئی دن ابر و باد سے پاک ہوا دوست آشناؤں سے ملنے کو جی چاہا تو گئے ورنہ محلے ہی کی مسجد میں ٹرخالی[۱۲] یا دل میں تاویل کر لی کہ شرائط جمعہ میں اختلاف ہے۔ پنج وقتی کو تو فرض و واجب کیا مستحب بھی نہیں سمجھا صبح اور ظہر اور عشا تو عمر بھر پڑھی ہی نہیں کیوں کہ عین سونے کے وقت تھے۔ رہی عصر سو ہوا خوری اور سیر بازار اور خرید اور فروخت دوست آشناؤں کی ملاقات دنیا بھر کی ضرورتوں کو بالائے طاق رکھتے تو ایک نماز پڑھتے۔ مغرب کے

---

[۱] یعنی تیمارداروں کو۔ گھر کے لوگوں کو تسلی ہو ۱۲ [۲] اندیشہ ۱۲ [۳] جب کوئی خوشی ہوتی ہے تو عورتیں رات بھر جاگتی اور گیت گاتیاں ہیں ۱۲ [۴] حیران۔ پریشان ۱۲ [۵] سچا خواب [۶] خدا کی طرف کا اشارہ ۱۲ [۷] رحم کیا گیا مسلمانوں میں جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کی طرف اِس لفظ سے اشارہ کیا کرتے ہیں ۱۲ [۸] احتیاط والے ۱۲ [۹] یعنی کبھی پڑھی کبھی نہ پڑھی ۱۲ [۱۰] دونوں عیدیں یعنی عید بقرعید ۱۲ [۱۱] اوپر ڈالنے کا کپڑا ۱۲ [۱۲] یعنی بے دلی سے ادا کی ۱۲

واسطے تو عذر ظاہر تھا وقت کی تنگی جب تک پھر پھرا کر گھر آئے حمرۂ شفق[۵۱] زائل ہو جاتی تھی۔ یہ تو اس عبادت کا حال تھا۔ جس کو ثواب بے زحمت اور اجر بے تکان کہنا چاہیئے اور جس عبادۃ میں ذرا سی تکلیف بھی تھی۔ جیسے روزہ یا زکوۃ حتی الوسع[۵۲] کوئی نہ کوئی حیلۂ شرعی اُس سے معاف رہنے کا سوچ لیا جاتا تھا۔ رجب کا مہینا آیا اور روزوں کے ڈر کے مارے ایک عجب طرح کا سہم چڑھا۔ سب سے آسان نسخہ[۵۳] یہ کہ کسی طبیب کے یہاں آنا جانا شروع کیا اُنھوں نے چند روزہ زندگی کے واسطے وہ وہ بکھیڑے کھڑے کر رکھے ہیں کہ روئے زمین پر اُن کے نزدیک کوئی تن درست ہی نہیں۔ یوں ملنے ملاقات کرنے جاؤ تو پان کی عوض نسخہ حوالے کر دیتے ہیں اور جہاں ایک دفعہ دوا پی اور روگ لگا۔ رمضان کے آتے آتے تو طبیعۃ خاصی محتاج مسہل[۵۴] ہو گئی اور حکیم صاحب کی بدولۃ روزوں سے بچ گئے زکوۃ[۵۵] کا ٹال دینا تو کچھ بڑی بات نہ تھی۔ نصاب پر حول[۵۶] کامل کیوں گزرنے دیں کہ زکوۃ دینی پڑے۔ جب دیکھا کہ برس پورا ہونے آیا بی بی کے نام زبانی ہبہ[۵۷] کر دیا۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ جب بی بی پر وجوبِ زکوۃ کا وقت آیا پھر اپنے نام ہبہ کرا لیا اور ٹھٹھیر[۵۸] ابدلائی کر کے خدا کو بالا[۵۹] بتایا یا مال کو ایسے پیرایے میں رکھا کہ زکوۃ سے بری رہے خاصی طرح دکانیں مول لیں۔ مکان بنوائے اُن میں کرایہ دار بسائے کہ مال نامی[۶۰] آپ نامی زکوۃ ندارد غرض جہاں تک نصوح احتساب کرتا تھا۔ اپنے تئیں دین سے بے بہرہ۔ ایمان سے بے نصیب۔ نجاۃ سے دُور ہلاکۃ و تباہی سے قریب پاتا تھا۔

غرض طالب علم توبۃ النصوح پڑھتا چلا جاتا اور افسر اسکول نہایت دل چسپی کے ساتھ سنتا جاتا تھا چوں کہ وقت میں گنجائش کم تھی اس لیئے افسر سکول کو بادلِ ناخواستہ یہ کہتے ہوئے طالب علم کو روکنا پڑا کہ اگرچہ دل نہیں مانتا کہ توبۃ النصوح کو بے ختم کیئے ہوئے چھوڑو مگر وقت تنگ ہی جہاں سے چھوڑا ہی نشان کر دو موقع ملے گا تو پھر سنیں گے طالب علم نے کتاب بند کر دی اور افسر اسکول تقسیم انعام میں مصروف ہوئے۔

مایُغنیک فی الصرف	یہ علم صرف میں ایک مختصر سا سو صفحے کا رسالہ ہی جس کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہی کہ اگر مبتدی اس کے قواعد کو سمجھ کر مستحفظ کر لے اور اُن کا استعمال بھی کرتا رہے تو علم

صرف میں دوسری کتاب کی اُس کو ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ کتاب مولنا نے ۱۸۹۲ء میں تصنیف فرمائی اور ۱۸۹۳ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق خود مولنا دیباچے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ خدا اپنے فضل و کرم سے پورا کرنے تو ارادہ یہ ہی کہ شایقین زبان عربی کے واسطے صرف و نحو کے چھوٹے چھوٹے

---

[۵۱] شفق کی سرخی۔ نماز مغرب کا وقت حمرۂ شفق کے زائل ہونے کے بعد نہیں رہتا ۱۲ [۵۲] جہاں تک ہو سکتا تھا ۱۲ [۵۳] تدبیر ۱۲ [۵۴] جلاب ۱۲ [۵۵] مال کا چالیسواں حصہ جو برس پیچھے خدا کی راہ میں دیا جاتا ہی ۱۲ [۵۶] مال کی وہ مقدار جس پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہی اقل درجہ چاندی کا دو سو درہم کے برابر ہی اور سونے کا بیس[؟] دینار کے برابر۔ درہم ساڑھے تین ماشے کا ہوتا ہی اور دینار ساڑھے چار ماشہ کا ۱۲ [۵۷] پورا سال ۱۲ [۵۸] بخشش بلا عوض ۱۲ [۵۹] ٹھٹھیرے نئے پرانے باسنوں کا بہت ردو بدل کرتے رہتے ہیں ۱۲ [۶۰] ٹالی دیا ۱۲ [۶۱] نامی کے دو معنی ہیں اول متعارف یعنی نامیدہ و مشہور اور دوسرے اسم فاعل نمو سے یعنی بالندہ اور روز افزوں۔ مال نامی میں دوسرے معنی مراد ہیں اور آپ نامی میں پہلے ۱۲

دو رسالے ایسے بنا دیجیے کہ اُن کو پڑھ کر عبارت عربی کو صحت کے ساتھ پڑھ لینے پر بخوبی قادر ہو جائیں پہلا رسالہ ہی جس میں صرف کا بیان ہی بے شک اِس کا پڑھنے والا صرف کا علامہ محقق تو نہیں ہو جائیگا مگر امید ہی کہ جتنی باتیں ضروری اور بکار آمد ہیں وہ سب کو جانے سب کو سمجھے اور سب کا برتاؤ کر سکے صرف و نحو عربی کا سامان جو کتب مروجہ میں ہی اُس کو کافی و وافی کہنا ایک طرح کی بے انصافی ہی وہ کافی سے کہیں زیادہ اور وافی سے کہیں بڑھ کر ہی مختصرات ۔ مطولات ۔ متون حواشی ۔ منہیات ۔ شروح ۔ تعلیقات ملا کر بجائے خود ایک کتاب خانہ ہی جس کو بالاستیعاب دیکھنے کے لیئے اگر تمام عمر طبعی نہیں تو تمام عمر تحصیل بدقت وفا کرے تو کرے مصنّفین کی طبع آزمائیوں نے صرف و نحو کو عقبات بنا دیا ہی کوئی ایسا ہی تقدیر کا رستم ہو تو ان سے باہر نکلے سچ ہی لڑکوں کا کھیل مینڈکوں کی موت ہی بس جب مبتدیان عربی خوان کو دیکھتا ہوں تو اُس ستارہ شناس کو یاد کرتا ہوں جس کو منظور تھا کہ اجرام فلکی میں جو صنائع بدائع قدرت مضمر ہیں اُن کو دیکھے مگر وہ دُوربین کے کیل پُرزوں کی ساخت میں ایسا محو ہوا کہ آسمان کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکا میں نے اس رسالے کے جمع کرنے میں نہ تو کوئی نیا قاعدہ باندھا نہ کوئی نیا مسئلہ ایجاد کیا ۔ پھر کیا تو کیا کیا ۔ اتنا کیا کہ ع متاع نیک ہر دوکاں کہ باشد ۔ اِدھر سے اُدھر سے جوڑ بٹور کر مطالب کو اپنے طور پر مرتب کر دیا ۔ ترتیب جو میں نے اختیار کی ہی میرے گمان میں نئی اور قریب الفہم ہی ۔ اوّل تو میں نے یہ ثابت کیا کہ الفاظ میں گروہ بندی ہی جتنے الفاظ میں چند حرف مشترک ہوں اور اُن کے معانی میں بھی کوئی امر مشترک پایا جائے وہ الفاظ ایک گروہ یا ایک باب ہیں اور حروف مشترک مادہ باب ۔ مادہ باب میں جو جو تغیرات جس جس غرض سے کیئے جاتے ہیں اُن کو صرف نے قواعد کے طور پر منضبط کر دیا ۔ معلوم یہ ہوا کہ تغیرات اکثر خاص حروف مادہ باب پر زیادہ کرنے سے ہوتے ہیں اور زوائد تین قسم کے ہیں ۔ ۱ زوائد نقل باب ۲ زوائد اشتقاق ۔ ۳ زوائد توزین و الحاق ۔ زوائد نقل باب سے ابواب ثلاثی و رباعی مزید و مجرد پیدا ہوئے ۔ اس بیان کو بمنزلہ کتاب منشعب کے سمجھو مگر خواص ابواب کا تذکرہ میرے رسالے میں زیادہ ہی ۔ پھر زوائد اشتقاق سے ماضی و مضارع وغیرہ کے صیغے جن کا مذکور میزان الصرف میں ہی مگر میزان الصرف میں صرف ثلاثی مجرد کی گردانیں ہی میں نے جو قواعد اشتقاق لکھے ہیں عام ہیں ۔ زوائد توزین چونکہ سماعی ہیں چند مثالیں دیکر اُن کی تصریح سے سکوت کیا ۔ اس کے بعد میں نے معتلات کو اِس تمہید سے شروع کیا کہ زوائد اشتقاق و نقل باب وہ تغیرات ہیں جو معانی خاص کی غرض سے کیئے جاتے ہیں اور اُن کے علاوہ بعض تغیرات وہ ہیں جن کو وہ حروف جن سے کلمہ مرکب ہی اقتضا کرتے ہیں ۔ مہموز و معتلات و مضاعف کے قواعد علیٰحدہ علیٰحدہ لکھے ہیں اور ہر ایک کی وافر مثالیں اُس کے قاعدوں کی ذیل میں مع تعلیلات و حوالہ قواعد بیان کردی گئی ہیں آخر میں رسم الخط کا رسالہ لگا دیا ہی اور اُس میں بھی ضروری قاعدے مذکور ہیں غرض اس رسالے کے چار حصے ہیں ۔ اوّل منشعب مع خواص الابواب دوم میزان صحاح سوم معتلات ۔ چہارم رسم الخط ۔ با ایں ہمہ یہ رسالہ جس قدر ہی مختصر ہی اس کے حجم سے ظاہر ہی ایک بات کی کسر رہ گئی ہی وہ یہ کہ آخر میں دو چار ورق تمرین کے بھی ہوتے تو بہتر ہوتا یعنی مثلاً پانسو متداول صیغے واسطے مشق کے لکھ دیئے جاتے ۔ البتہ میں پسند نہیں کرتا جو انا موئی کے چیستانی صیغوں کو کہ اُن میں غور کرنا طالب کی پریشانی خاطر کا موجب ہی مگر اتنا ذرا سا کام میں نے معلمین و اساتذہ کے ذمہ چھوڑ دیا ہی کہ وہ اپنی تجویز کے موافق تمرین کی مشق کرا لیں گے ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّ اٰخِراً +